THE MIRROR OF TRUTH

By S. TAJ

از

ایف۔ ایس۔ تاج

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

فہرست مضامین

اِلتماس

معزز ناظرین! بندہ نے یہ کتاب "مراۃ الحق" طالبانِ راہ حق کی راہنمائی وہدایت کے لئے تصنیف کی ہے۔ مراۃ آئینہ کو کہتے ہیں۔ جس طرح انسان آئینے میں اپنی شکل وصورت کی اصلیت کو دیکھتا ہے۔ اُسی طرح میری یہ کتاب مشتاقان جادۂ حق کو خدا کا جمال دکھائے گی۔ لیکن جیسے کُل چشم کے لئے آئینہ کا وجود عدم برابر ہے۔ اسی طرح وہ لوگ "جن کی عقلوں کو اِس جہان کے خدا (ابلیس) نے اندھا کردیا ہے" مراۃ الحق سے مستفیض نہ ہوسکیں گے۔ اِس کتاب کی تیاری میں چند کُتب اور بعض اخبارات سے بھی امداد لی گئی ہے۔ چونکہ جا بجا عقلی دلائل سے حقائق کو ثابت کیا گیا ہے اور اکثر احباب کلام مُقدس کے حقائق ومسائل کو عقلی دلائل وبراہین سے ثابت کئے جانے سے سخت بیزار ہوتے ہیں۔ اِس لئے عرض ہے کہ ایسے اصحاب مندرجہ ذیل امُور پر ضرور غور کریں۔ تاکہ اُن کی غلط فہمی دُور ہو جائے۔

اوّل۔ یہ کائنات خُدا کا فعل ہے۔ اور کلام اللہ خدا کا قول۔ لہذا اُس کے ہی فعل سے اُس کے کلام کو ثابت کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ جائز ہے۔

دوم۔ دُنیاکی چیزیں آسمانی چیزوں کا عکس اور نقل ہیں (عبرانی ۸: ۵ و ۹: ۲۳ و ۱۰: ۱) اس لئے نقل سے اصل کو ثابت کرنا ناجائز نہیں۔ بلکہ بطور استدلال اِنّی لابدی وضروری ہے۔

سوم۔ ساری شرع الہٰی کے خُلاصہ کا اوّل جُز یہ ہے کہ "تو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے مُحبت رکھ" بس یہ خُدا کو عقل سے پیار کرنا ہے۔ منکرانِ دُنیا اِسی عقل کو

کے لئے اور اُن کی خُوشنُودی کی خاطر گائے۔ بچھڑے۔ گھوڑے بلکہ انسان تک کو بیدریغ قُربان کر دیتے تھے، اور سوم رس دیوتوں کے اکل و شرب کے لئے رکھ دیتے تھے۔ اِس قسم کی فطرت پرستی اور خُدا کی قُدرت کے مظاہرات و آثار کی پُوجا نہ صرف ہندوستان ہی میں ہوتی تھی، بلکہ ایک زمانہ تھا کہ ایسی جہالت اور خوش اعتقادی ہمہ گیر تھی اور کوئی مُلک یا قوم اس سے آزاد نہ تھی۔ زہرہ، اُمیرس و اسِس۔ تھاموز۔ کیمم۔ پتھا اور میفس اور مُتبرک سانڈ کے پوجاری تھے۔ اِسی طرح یُونان، ایران، کنعان، بابل، نینوہ۔ سیریہ۔ رُوم۔ امریکہ اور جرمنی وغیرہ تمام ممالک میں انو۔ بیل۔ وینس۔ جیوپیٹر۔ بعل۔ عستارات۔ ہرکیولیس۔ آطیس بطالستی۔ ایڈونس بیکس اور اپالو وغیرہ کی پرستش بڑے زوروں پر تھی۔ اور تا حال ایسی باطل پرستی کا بقیہ دُنیا کے تمام حصص میں کم وبیش موجُود ہے۔ بائبل مُقدّس میں بھی اُس زمانہ کی وحشیانہ رسُوم کا کئی جگہ صاف ذکر موجُود ہے۔ مثلاً طِفل کُشی۔ اور "وادیوں میں چٹانوں کے شگافوں کے نیچے بچّوں کو ذبح کرتے ہو" (یسعیاہ ۵۷: ۵) پھر بچّوں کو آگ میں جلانا۔ "اور اُنہوں نے توفت کے اُونچے مقام بن ہنوم کی اُونچی وادی میں بنائے تا کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں جلائیں۔" (یرمیاہ ۷: ۳۱) "تم خُداوند اپنے خُدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ جن جن کاموں سے خُداوند کو نفرت اور عداوت ہے وہ سب اُنھوں نے اپنے دیوتاؤں کے لئے کئے ہیں۔ بلکہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی اپنے دیوتاؤں کے نام پر آگ میں ڈال کر جلا دیتے ہیں۔" استثنا ۱۲: ۳۱۔

زمانے نے ایک کروٹ بدلی۔ کچھ اِنقلاب پیدا ہُوا تعلیم و تہذیب

نے اُنکے مجسّموں کی پرستش کو باعثِ ثواب سمجھا۔

سُوءِ عقیدت

اب زمانے نے ایک اَور کروٹ بدلی۔ عقل وعلم کے ترقّی کرنے سے مارِ وجل (سراب) اَور رسّی کے سانپ سے خیال اُٹھ گیا۔ پہلے رسّی کو سانپ اَور مارِ وجل اَور سراب کہنے لگے۔ پہلے اِنسان کی سریع الاعتقادی۔ کورباطنی اَور حُسنِ عقیدت کا یہ حال تھا کہ ارکینِ فطرت کو تعظیم الٰہی کی جگہ دیتا اَور خُدا کی دستکاریوں وصناعیوں کو پُوجا کرتا تھا۔ (رومی ۱: ۲۱-۲۳ و یرمیاہ ۲: ۱۳) اب یہ حال ہو گیا کہ خُود خُدائی کا دعوٰی کر بیٹھا۔ اَور خُود کو خُدا سمجھنے لگا۔ جیسے ویدانتیوں۔ ہمہ اوستیوں اَور صُوفیوں وغیرہ کے خیالات ہیں۔ لازم تو یہ تھا کہ انسان کی عقلی وعلمی ترقّی خُدا کی صحیح پہچان پر منتج ہوتی۔ اَور جس طرح تالاب کے پانی پر کائی کے چھا جانے سے آفتاب کا عکس اُس میں نظر نہیں آتا، پر بادِ تند کے تُند وزور جھونکے کائی کو پانی کی سطح سے ہٹا کر ایک کنارے پہ جمع کر دیتے، اَور پانی کے صاف وتر ہونے سے سُورج کا عکس اُس میں بالکل صاف اَور بے داغ نظر آتا ہے۔ اِسی طرح عقل وعلم اُس جہالت اَور تاریکی کے پردہ کو جو قلوبِ انسانی پر محیط تھا اُٹھا کر آئینۂ دِل کو اِس قدر مصفّا کر دیتے کہ خُدا کی معرفت وحقیقت کی معصوم تجلّی اُس میں اِنعکاس فرماتی، اَور عرفانِ الٰہی کی لاانتہا نُورانیّت اَور سحر آفرین تجلّی ظُلمت کدۂ دِل پر مسلّط ہو کر انسانی خود غرضی کی تاریکی کو نِگل جاتی، اَور وہ اپنی خُودی وخُود نمائی کو عقیدتِ الٰہی کی قربان گاہ پہ بھینٹ کر دیتا۔ لیکن افسوس کہ اگرچہ اُنھوں نے خُدا کو جان تو لیا، مگر اُس کی خُدائی کے لائق اُس کی

بڑائی اور شکرگزاری نہ کی۔ بلکہ باطل خیالات میں پڑ گئے۔ اور اُن کے
بے سمجھ دِلوں پر اندھیرا چھا گیا۔ وُہ اپنے آپ کو دانا جتا کر بے وقوف
بن گئے"۔ رُومی ۱: ۲۱-۲۲؎

اور اِسی طرح سُوءِ عقیدت کا خیال پیدا ہو گیا۔ غیر اقوام کے علاوہ
مسیحیوں نے بھی لوگوں کو مردم پرستی پہ مجبور کیا۔ مثلاً پوپ کا مغفرت نامہ
خود کو مستجمع جمیع کمالات و منبعِ حسنات اور خُداوند مسیح کا قائم مقام بنانا۔
جذباتِ سِفلیہ اور خواہشاتِ ذمیمہ کی مہمان نوازی کی خاطر زرِ کثیر کے
حرص سے مغلوب ہو کر جنت جیسی اعلیٰ جگہ کا حق دِلانے کے فضول
دعاوی۔ اپنی تعظیم و توقیر کی بے جا خواہش۔ اب سُوءِ عقیدت اور تفریط
پرستش نے صحائفِ مُطہرہ کو اُن کے درجے سے گرا دیا۔ پہلے تو خوش
اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ قرطاس پرستی اور توہمات و عجائبات کو گھڑ گھڑ
کر مذہب کا جزو بنا دیا تھا۔ اب ایسی تنزل کی حالت ہو رہی ہے کہ کلامِ
مُقدس کی بالکل توقیر نہیں کرتے اور علم و حکمتِ دُنیوی کے ترقی کرنے
سے خُدا اور مذہبی حقائق کو محض عقلی و علمی رنگ میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔
حالانکہ رُوحانی حکمت اور دُنیاوی حکمت میں بُعد المشرقین ہے۔" مگر نفسانی
آدمی خُدا کے رُوح کی باتیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وُہ اُس کے نزدیک
بیوقوفی کی باتیں ہیں۔ اور نہ وُہ اُنہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ وُہ رُوحانی طور پر
پرکھی جاتی ہیں"۔ ۱-کرنتھی ۲: ۱۴ و ایوب ۲۱: ۱۴-۱۵ در اصل ہاتھ میں پانچ
اُنگلیاں ہونا خوبی میں داخل ہے۔ اگر چار رہیں تو عیب ہے اور اگر چھ
ہوں تو بھی عیب ہے۔ اگر تیر اصل نشانہ سے اِدھر رہا تو نشانہ خطا ہوا۔
اور اگر نشانہ سے دُور جا کے گِرا تو بھی نشانہ خطا ہوا۔ بین بین ہی رہنا درست

ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وُہ امورِ جسمانی سے متعلق ہو یا رُوحانی سے اعتدال اور میانہ روی نہایت ضروری ہے۔ افراط و تفریط کی صورت خواہ کیسی صُورت میں پُوجی جائے ہر حال میں نتائج بجائے خوشگوار ہونے کے بجز مُفید و مُضرت رساں ثابت ہوں گے۔ اعتدالِ فطرت کا ناسخ منسوخ ہے، اور اِس کے خلاف عمل کرنے سے ہر پہلو سے تشویشناک آثار و نتائج کا ظہور بطور لازم و ملزوم کے لابُدی ہے۔ حُسنِ عقیدت اور سُوءِ عقیدت میں افراط و تفریط ہے۔ اِس لئے اِن ہر دو خیالات کا باطل اور ناقابلِ تسلیم ہونا بدیہی۔ عقیدۂ ویدانت بھی چُونکہ سُوءِ عقیدت کا نتیجہ ہے، اِس لئے اِس جگہ اُس کو معرضِ بحث میں لانا ضروری ہوگا۔ لہٰذا اب ہم مختصر طور پر مسئلۂ ویدانت کی کھوج کریں گے÷

ویدانت جملہ مذاہب کے معتقدات اِس امر میں اتفاقِ کُلی رکھتے ہیں کہ تمام نوعِ انسان کی طبائع کو کبھی نہ کسی طرح سے عرضِ گناہ عارض ہے۔ اور استقرائی طور پر بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلّم الثبُوت ہے۔ مسئلۂ گناہ پر پُوری بحث ہم آگے چل کر مناسب مقام پر کریں گے۔ سر دست عقیدۂ ویدانت کے مطابق گناہ اور نجات پر مختصر طور پر لکھیں گے۔ ویدانتی لوگ گناہ کو اگیان اِوِدیا اور بھرم وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور اُن کے مسلّمات کے مطابق گناہ یا پاپ ایک اعتباری محض اور عدمی شئے ہے۔ اور خارج میں اُس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اُس کو محض اگیان یا بھُول ہی مانتے ہیں اور گیان ہراپتی کو برہم پراپتی کا سبب مانتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ برہم ہی سے پرکرتی یا مایا پیدا ہوئی۔ اور پرکرتی نے ہی برہم کو اپنے جال میں پھنسا لیا۔ جیسے مکڑی میں سے

جالا نکلا اور اُسی نے مکڑی کو پھنسا رکھا ہے، یہ جگت متھیا (خواب و وہم) ہے اور برہم ست (حقیقت) ہے ÷

دراصل برہم اور مایا (مادہ یا پرکرتی) کا جو خیال ہے وہ بائبل کی تخلیق آدم و حوا کا ایک بگڑا ہوا اور کسی قدر صاف عکس ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ آدم برہم تھا اور حوا مایا پرکرتی۔ اور حوا نے آدم میں سے نکل کر آدم کو ہی اپنے فریب میں پھنسا لیا۔ اور اِس طرح سے گناہ دُنیا میں آیا اور سب آدمیوں میں پھیل گیا، اور تمام آلام و مصائب گناہ کا نتیجہ ہیں۔ اور پھر وُہ مانتے ہیں کہ اگیان (جہالت) کی تاریکی سے نکل کر گیان کو حاصل کرنا ہی مکتی یا براہم پراپتی ہے۔ اور اِس طرح جیو اور مادہ برہم میں لین یا ایک ہو جاتا ہے جس طرح صوفی لوگ بھی آخری منزل کو فنا فی اللہ ہونا مانتے ہیں یعنی جیو (رُوح) اور برہم میں کسی قسم کا تغیر و تفاوت نہیں رہتا۔ بلکہ اِلتصاق تام ہوتا ہے۔ اور دُوئی کے پردہ کے ہٹ جانے سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک حُباب یا قطرہ سمندر میں غائب ہو کر اپنے خصوصی امتیاز کو کھو دیتا، اور اُسی کا رُوپ ہو جاتا ہے۔ دراصل وُہ برہم سے اُوپر کسی اعلےٰ ہستی یا خالق کے قائل ہی نہیں ہیں ÷

ہم مانتے ہیں کہ جس طرح گناہ کے باعث انسان کی خُدا سے جُدائی ہوئی اُسی طرح گناہ سے مخلصی حاصل کر کے انسان آدم والی ابتدائی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر پھر تقربِ الٰہی کو حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم سنجات دہندہ اور سنجات یافتہ کی ہستیوں میں امتیاز کے قائل ہیں۔ اور خالق و مخلوق کو جُدا جُدا ممتاز ہستیاں مانتے ہیں۔ یعنی سنجات کی حالت میں ہم خُدا کی عین ذات نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اوصاف ملکوتیہ کے باعث خُدا کی مشابہت

قریبی رکھتے ہیں۔ جیسے ابتدا میں خدا نے آدم کو اپنی صورت پر ذی ارادہ پاک اور فعل مختار بنایا، اُسی طرح دوبارہ شبیہ اللہ کے ساتھ ظلی طور پر ہماری مشابہت ہو جاتی ہے، نہ یہ کہ برہم یا عین ہو جاتے ہیں۔ "کیونکہ تم مر گئے اور تمہاری زندگی مسیح کے ساتھ خدا میں چھپی ہوئی ہے۔ جب مسیح جو ہماری زندگی ہے ظاہر کیا جائے گا، تو تم بھی جلال میں اُس کے ساتھ ظاہر کئے جاؤ گے۔" (کلسی ۳: ۳-۴) ویدانتیوں کا خیال ہے کہ برہم ہی خالق اور برہم ہی مخلوق ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال نادرست ہے، کیونکہ خالق و مخلوق۔ فاعل و مفعول اور صانع و مصنوع میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ یا تو خالق و مخلوق اور کاران و کارج مترادف الفاظ ہوں گے، جس طرح پیار و محبت، اور رنج و غم مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں، اور یہ سراسر محال ہے۔ جس طرح ضارب کے بغیر مضروب، والد کے بغیر پسر اور کاتب کے بغیر مکتوب کا وجود محال ہے۔ اُسی طرح صانع کے بغیر مصنوع اور کاران کے بغیر کارج کا ہونا ناممکن و محال ہے۔ ورنہ کاران و کارج وغیرہ توہمات کا ذخیرہ ہوں گے۔

دوم۔ یہ لازمی امر ہے کہ فاعل کا وجود مفعول سے مقدم ہو، اور مفعول کے فاعل کے ارادہ میں تو قدیم ہو سکتا ہے، لیکن وجود خارجی کے اعتبار سے مفعول اور فاعل آنِ واحد میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ اگر یوں ہونا ممکن ہو تو پھر کوئی کسی فعل کا فاعل نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ فاعل مقدم اور مفعول مؤخر ہو۔

سوم۔ برہم ست اور جگت متھیا کا خیال بھی ابتدائی بھدی عقیدت اور کوتاہ فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ متھیا شئے ست شئے کا جزو نہیں ہو

سکتی، کیونکہ کسی شئے کا اپنے نقیض میں سے برآمد ہونا محال ہے۔ سُورج
میں سے تاریکی۔ شہد میں سے تلخی اور سفیدی میں سے سیاہی کبھی نکل نہیں
سکتی۔ اِسی طرح ست برہم میں سے متھیا جگت کا برآمد ہونا ناممکن و
محال ٹھہرا۔ ویدانتیوں کا یہ خیال ہے کہ جیسے ایک ہی سُوت سے مختلف الوان
و اشکال کے کپڑے بنتے ہیں، اور اُن کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں مگر
اُدھیڑنے پر وُہی سُوت کا سُوت رہ جاتا ہے۔ اِسی طرح ایک ہی برہم ہے
جو جگت کی بوقلموں اشیاء میں جُدا جُدا معلوم ہوتا ہے۔ اور وُہ اشیا
مختلف ناموں سے پُکاری جاتی ہیں گو یہ سب "سروم کھلوِدم برہم" لیکن
ہم پُوچھتے ہیں کہ سونے کی ایک اینٹ ہے، اُس کو ڈھال کر مختلف اطوار
اور اشکال کے زیورات بنا کر اُن کے متفرق نام رکھے جاتے ہیں۔ تاہم
وُہ سونا زیورات کی صُورت میں تبدیل کر دینے سے بھی سونا ہی رہے گا،
پیتل نہیں بن جائیگا اور نہ ہی متھیا ہوگا۔ کیونکہ ست میں سے اَسّت
کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہُوا کہ برہم ست ہے تو جگت بھی
ست ہے۔ گرنتھ صاحب کی گواہی بھی یہی ہے کہ "آپ ست کیا سب ست"
علاوہ ازیں اگر سچ مچ ویدانت کے خیال کے مطابق یہ دُنیا محض ذہنی و
خیالی ہو، تو چاہیئے کہ اگر آگ کو پانی کہا جائے تو وُہ پانی ہو جائے۔ اور
اِسی طرح اگر دن کو رات کہہ دیا جائے تو فوراً رات ہو جائے۔ لیکن ایسا
ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس عالم کی حقیقت ثابت ہے۔ اور جگت متھیا
اور برہم ست کے مسئلہ کا ابطال ظاہر ہے ÷

چہارم۔ عقیدۂ ویدانت کے مطابق خُدا کا مرکب ماننا پڑتا ہے کیونکہ
تمام جمادات۔ نباتات۔ حیوانات اور ارواح کا اُسی میں سے برآمد ہونا

ثابت کرتا ہے کہ تمام مادّی و غیر مادّی اشیا برہم کے اجزا ہیں۔ اوّل تو مادّی و غیر مادّی آپس میں ایک دُوسرے کے اجزاء نہیں ہو سکتے۔ اور پھر برہم کے اجزا ماننے سے برہم کو ترکیب لازم آتی ہے۔ اور شئے مُرکّب اوّل تو حادث ہوتی ہے، اور برہم کا حادث ایک اور خالق کو گنجائش دیتا ہے جو اُس سے قدیم ہو کر اُس کی بھی علّت ٹھہرے۔ اور دُوسری بات یہ ہے کہ مُرکّب ہونا کوئی اعلیٰ صفت نہیں چاہتا۔ ترکیب ادنیٰ اجسام کا خاصّہ ہے۔ رُوح اعلےٰ وجود ہے اور وُہ غیر مُرکّب ہے۔ جسم ادنیٰ شئے ہے اور یہ مُرکّب ہے۔ پس برہم کا مُرکّب ہونا اُس کے متنزّل اور ادنےٰ ہونے کی دلیل ہے۔

پانچویں۔ ویدانت کے مطابق برہم کو سگُن اور نرگُن مانا جاتا ہے۔ یعنی جب اُس کا تعلق تین گُنوں ست۔ رج۔ تم سے ہو تو وُہ سگُن ہوتا ہے اور جب اِن تین گُنوں سے جُدا ہو تو وُہ نرگُن ہوتا ہے۔ لیکن اُن کا یہ نظریہ بھی دیگر خیالات کی طرح خلافِ عقل ہے۔ ذات اور صفات آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ ذات مجموعۂ صفات ہے۔ جس طرح صفات کا وجود بغیر موصُوف کے محال ہے، اُسی طرح موصُوف کا وجُود بلا صفات مُمکن نہیں۔ برہم کو سگُن اور نرگُن ماننے کے یہ معنی ہُوئے کہ وُہ ذی صفات بھی ہے اور لا صفات بھی۔ اِس طرح واحد ذات میں دو نقیضوں کا اجتماع جائز ٹھہرا کر خُدا کی ہستی سے مُنکر ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں ایک شخص عالم بھی ہو اور لا عالم بھی۔ زندہ بھی ہو اور مُردہ بھی۔ موصُوف کے بغیر صفت اور صفت کے بغیر موصُوف کا وجُود قطعی محال و ممتنع ہے۔ مثلاً آگ ذات ہے، اور حرارت اُس کی صفت۔ اگر حرارت نہ رہے تو آگ کی ذات کا اِنکار لازم آئے گا، اور اگر آگ نہ ہو تو حرارت کا وجُود کہاں رہیگا۔ پس لا محالہ

ایک ہی خدا سگن اور نرگن دونوں نہیں ہو سکتا اور محض نرگن بھی نہیں
ہو سکتا کیونکہ بے صفات شئے اعتباری محض اور عدمی ہوگی نہ کہ نفس
الامری اور تحقیقی۔ پس یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ذی صفات (سگن)
ہے۔ اس لئے کہ وہ حقیقی وجود ہے۔ اس لئے بھی کہ مخلوقات جو اُس سے
صادر ہوئی وہ ذی صفات ہے۔ (ندوی ۱: ۱۹-۲۰) اگر خالق کو بے صفات
(نرگن) مانا جائے اور اُس کی مخلوقات کو ذی صفات (سگن) تو ایک
نقیض کو دوسرے نقیض کی علت ماننا پڑے گا۔ اور یہ محال ہے لہٰذا
خدا اسمیٰ۔ ذی صفات اور حقیقی وجود ہے اور ویدانت کا عقیدہ سراسر
باطل ہے"

ششم۔ رہا یہ خیال کہ جو کچھ نظر آتا ہے سب برہم ہے۔ اس کے متعلق
یہ امور قابلِ غور ہیں کہ جبکہ کوئی انسان اپنے جسم۔ رنگ۔ شکل و صورت۔
خد و خال۔ صحت و سُقم۔ عادات و خصائل اور حُسن و قبح میں کسی دوسرے
انسان سے مناسبت و مطابقت تام نہیں رکھتا، بلکہ ہر انسان میں ایک
دوسرے سے نمایاں امتیاز پایا جاتا ہے۔ اور جس کے باعث ہم ماں
باپ۔ بہن بھائی۔ حاکم محکوم اور دوست و دشمن کو جدا جدا پہچانتے
ہیں۔ اور ان امتیازات کے باعث ہر ایک کی شخصیت دوسروں سے جداگانہ
نظر آتی ہے اور اس کے علاوہ ہم اپنی شخصیت کے متعلق "میں" کا احساس
ہونے پر دیگر افراد سے خود کو ممتاز سمجھتے اور اپنی شئے کو "میری" کہتے
اور اپنی اشیا و مقبوضات کو دیگر افراد کی اشیا سے عزیز رکھتے اور ان
کے کھو جانے پر افسوس کرتے ہیں تو کس صورت میں تمام خلقت ایک
برہم ہو سکتی ہے؟ زید کے مریض ہونے سے بکر کی صحت پر کوئی اثر

نہیں پڑتا - ایک کو گیان ہونے سے سب کو گیان نہیں ہوتا۔ ایک سانپ کو مار دینے سے تمام سانپوں کا زہر دور نہیں ہوتا - تو بھلا اِس خیال کی صحت کی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ "سروم کھلو دم برہم" بلکہ اِس خیال میں ایک بھاری قباحت یہ ہے کہ بہن - بیٹی - ماں - زوجہ - خالہ اور دادی وغیرہ رشتوں میں کوئی فرق نہ رہنے کے باعث اِن سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنا پڑے گا - اور تمدنی و خاندانی زندگی میں سخت مشکلات پیش آئیں گی - اور اِن تمام رشتوں، ناطوں کا باہمد گر ممتاز صورت میں قائم رہنا بھی اِس عقیدہ کے ابطال کی ایک مسکت دلیل ہے ۔

ہفتم - اور اگر فی نفسہٖ یہ تمام جگت ایک ہی برہم ہے، تو ذات پات اور اونچ نیچ کے مکروہ و ناشائستہ خیالات اور اعلےٰ و ادنےٰ کے امتیازات کے کیا معنی ہیں؟ ویدانتی بھگتوں کو تو کُتّے - بلّیوں اور گدھوں کووں کے ساتھ کھانے پینے سے بھی پرہیز جائز نہیں - چہ جائیکہ اچھوتوں کے ساتھ جانا بھی زندہ درگور ہونے کا مصداق بنا ہوا ہے - اگر سب جگت کو برہم ثابت کرنے بیٹھے ہیں تو پہلے اِن معمولی ابتدائی باتوں کی تو اصلاح کر لیجئے اور کم از کم چھوت چھات کے قلعہ کو تو پہلے سَر کر لیجئے - اگرچہ ویدانت کی یکتائی کی تعلیم کی مثال سوائے ویدانت کی دنیا کے اور کسی بھی مذہب میں موجود نہیں - لیکن اگر برہم گیانیوں کے عملی پہلو کو دیکھا جائے تو اُن کی سی امتیاز پسندی اور باہمد گر نفرت و جدائی کے خیالات کی کثرت کی مثال بھی کافہ انام پر اور کسی مذہب میں ہرگز ہرگز نہ ملے گی - گویا یکتائی تو صرف زبان کے لئے ہے ؛ اور جدائی عمل کرنے کے لئے - یہ تو اُس شخص کا سا حال ہوا کہ جس کے گھر میں تو افلاس کی وجہ سے چوہے بھوکے مرتے ہوں، اور زبان سے رٹتا

جیسے سونا سونا۔ اگر ان بھلے آدمیوں سے کوئی پُوچھے کہ صاحب! ایسی
زبردست یکتائی کی تعلیم اور پھر ان امتیازات کے معنی؟ تو جواب یہ ہوتا
ہے کہ ابھی ہم اگیانی ہیں۔ جب گیان ہو جائے گا تو امتیازات نہ رہیں گے۔
اوّل تو ہمیں آج تک کوئی ویدانتی پُورن گیانی نہیں ملا۔ اگر کوئی ہزار میں سے
ایک ہوگا تو گیان کی مشین کی سُست رفتاری پر شک کی گنجائش نہیں۔
دُوسری بات یہ ہے کہ جو شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ ابھی مجھے پُورا گیان نہیں
جب ہو جائے گا تو امتیازات کو چھوڑ دُونگا، تو اُس کے اِس اقرار ہی
سے ثابت ہے کہ وُہ اِن امتیازات کی قباحت سے آگاہ ہے، اور اُنہیں
مٹانا بھی چاہتا ہے تو بھلا اِس سے زیادہ گیان اَور کیا ہوتا ہے۔ سب
زبانی جمع خرچ ہے اَور حقیقت ندارد۔ اپنی اخلاقی کمزوریوں کی پردہ دری
لئے اگیانی بن جاتے ہیں۔ ایسی تعلیموں نے مُلک کی ذہنیّت کو غایت
پست کر رکھا ہے۔ اَور جب تک اِن خیالات کی جان کا فاتحہ نہ پڑھا
جائیگا ہم حقیقی اخلاقی شائستگی، تمدّنی آزادی اَور رُوحانی ترقّی سے
بے نصیب رہیں گے۔ شُکر کا مقام اَور ہماری خُوش قسمتی ہے کہ مسیحیّت نے

اِس قلعۂ بُطلان پر

گولہ باری کرنے کے لئے میدانِ کارزار میں ڈیرے ڈال لئے ہیں اَور صرف
مسیحیّت نے ہند میں تمدّنی اصلاحات اَور مساوات کی تحریکوں کو جنم
دیا ہے جس کی تقلید پر آج آریہ۔ سِکھ اَور مُسلمان جُھکے ہُوئے ہیں۔
ہشتم۔ پھر کوئی اِن ویدانتیوں سے یہ تو پُوچھے کہ کسی شیر، چیتے، اَور
سانپ وغیرہ سے خائف و سہمگیں ہو کر کیوں بھاگے جبکہ وُہ اُسی کا رُوپ

ہے، کوئی دوئیت نہیں۔ اِس واجبی اجابت کا جواب اکثر ہمیں یہ دیا جا
ہے، کہ مجرم کے آگے مجرم بھاگتا ہے۔ یا یُوں کہیں کہ مجرم سے ڈر کر
بھاگ جاتا ہے نہ کہ ویدانتی۔ اِس مضحکہ خیز جواب سے ہمیں ہنسی آتی
اوّل اس لئے کہ شیر اور ویدانتی دونوں حقیقی اور خارجی وجود ہیں، نہ کہ وہم
اور پھر دونوں برہم۔ دُوسرے یہ کہ وہم سے وہم کیسے ڈر کر بھاگ س
ہے؟ دُوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ایک وہم دُوسرے وہم
کو دُور کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح باطل ہے۔ وہ اشیا جو اپنی تمام
میں ایک ہی ہیں وہ ایک دُوسرے کی مدافعت نہیں کر سکتیں۔ مثلاً سر
سردی کو اور گرمی گرمی کو اور تاریکی تاریکی کو کبھی دُور نہیں کر سکتی۔ کوئی
خاصیّت اپنی متضاد خاصیّت کے وسیلے دُور کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا و
وہم سے ڈر کر بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ ویدانتی شیر سے ڈر کر بھاگتا ہے۔
سے اُن دونوں میں مغائرت و تفاوت ظاہر ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ تمام ح
برہم نہیں ہے، بلکہ خُدا لئے واجب الوجُود و فوق الفطرت تمام مصنوعا
مرئیہ اور غیر مرئیہ اور سِفلیہ و عُلویہ کا واحد خالق اور صانع ہے۔ اور وہی
کائنات پر حُکمران ہے۔ وہ مُرکّب نہیں۔ نِرگُن نہیں۔ گیان و اگیان، ہر
بانی نہیں۔ اُس نے مخلُوقات کو اپنے میں سے نہیں نکالا، اور نہ ہی تم
ممکنات فنا ہو کر اُس میں مِل جائیں گی۔ وہ ازلی و ابدی غیر مرئی۔ لطیف
الحیّ۔ ذی صفات۔ خالق۔ مالک۔ رازق۔ فوق الفطرت اور ادراکِ ع
اِنسانی سے باہر ہے۔

آتما پنہ کرم ناکت — ویدانتیوں کا خیال ہے کہ آتما پُن کرم اور پُرکلیش (منزہ عن الخطا) ہے۔ اور اُس پر گُناہ مطلق اثر اندا

نہیں ہو سکتا کیونکہ وُہ غیر مادی اور غیر متاثر ہے۔ وُہ ہمیشہ پاک وصاف ہستی ہے۔ پاپ (اگیان) صرف ستھول دیہہ (کثیف جسم) ہی سے متعلق ہے۔ دُکھ سُکھ کے سب اثرات دیہہ ہی پر ہوتے ہیں۔ رُوح ان کیفیات سے قطعی متکیف نہیں ہوتی ٭

اوّل۔ اگر تنزہ تام رُوح کا خاصہ ذاتی ہے، اور گُناہ جسم کا خاصہ ذاتی ہے، تو اس صُورت میں رُوح اور جسم کی طبائع باہمدگر متضاد ہوئیں، اور ضدّین کا اجتماع محال ہے۔ اور یُوں اِنسانی زندگی کا قائم رہنا محال ٹھہرا۔ (شاید اسی واسطے جگت کو مِتھیا کہتے ہیں) لیکن اِنسانی زندگیاں قائم ہیں۔ پس گُناہ کا تعلق رُوح وجسم دونوں سے ثابت ہوگیا ٭

دوم۔ اگر پاکیزگی اور معصومیت تام رُوح کا خاصہ ذاتی ہے، تو حصُولِ مکتی (نجات) یا برہم پراپتی کی خاطر اس قدر کٹھن ریاضتیں کرنا فضُول اور تحصیلِ لاحاصل ہے۔ جسم کے فنا ہونے پر آتما ویساعظ ہیں جا ملے گی۔ کسی تپ جپ، سادھن وغیرہ کی مُطلق ضرورت نہیں۔ یہ سراسر گمراہ کُن عقیدہ ہے۔ دراصل اشرف شئے کے فساد سے ادنیٰ شئے کا فساد لازم آتا ہے۔ اگر اصل الشجر سُوکھ جائے تو ڈالیاں کبھی قائم نہیں رہ سکتیں۔ برعکس اس کے ڈالیوں کے سُوکھ جانے سے جڑ کا نقصان نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح رُوح جسم کی بہ نسبت اشرف ہے۔ اگر اُس میں بگاڑ پیدا ہو جائے، تو لازمی امر ہے کہ جسم بھی اُس بگاڑ سے متاثر ہو۔ پس اگر جسم میں گُناہ موجود ہے تو رُوح میں اُس سے پہلے ہے۔ جب تک رُوح کی اصلاح نہ کی جائے جسم کی اصلاح ناممکن ہے، اور جسم مادہ ہے۔ اور مادہ بذاتہٖ غیر مُدرک اور غیر متحرک ہے۔ بغیر رُوح کے سہارے کے وُہ اچھا یا بُرا کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ پس ہر طرح

سے رُوح پر بھی الزام آتا ہے۔ اِس لئے آتما نِیتّہ اَور نِرلیپ ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

سوم۔ پس جبکہ رُوح اَور جسم دونوں گُناہ آلُود ثابت ہو گئے تو اب سوال لازم آتا ہے کہ پھر گُناہ کا وجُود حقیقی ہے یا اعتباری محض۔ اگر کہو اعتباری تو امرِ اعتباری کی مدافعت کے لئے خارجی تدابیر جیسے سادھن ریاضت وغیرہ اَور کرم دھرم وغیرہ بے سُود و بے کار ٹھہرتے ہیں۔ اَور جب گُناہ مفروضِ ذِہنی ٹھہرا تو دُکھ جو پاپ کا نتیجہ ہے وُہ بھی ناپید ہونا چاہیئے اَور کوئی بھی دُنیا میں دُکھیا اَور مُصیبت زدہ نہ ہونا چاہیئے۔ اَور اگر دُکھ اَور پاپ کوئی موجُود فی الخارج شئے نہیں تو تناسخ کس پرندے کا نام ہے اَور ویدانتیوں کی جُملہ تدابیر دربارہ مدافعت اگیان اَور حصُولِ موکھش کیا معنے رکھتی ہے؟ یہ تو اُس بیڑی آدمی کا سا حال ہُوا جو پری یا سیمرغ (ایک فرضی عظیم الجثّہ پرندہ جس کی نسبت وہمی لوگوں کا خیال ہے کہ ہاتھی کو پنجوں میں لے کر اُڑ جاتا ہے) کے خوف سے غاروں میں چھپتا پھرے۔ اَور یا حصُولِ اقبال و دَولت کے لئے ہُما کی تلاش میں صحرا نوردی و بادیہ پیمائی کرتا پھرے حالانکہ یہ دونوں پرندے قوّتِ واہمہ کی اختراع کا وہمی نتیجہ ہیں۔ اگر کہو کہ گیان ہونے پر اِن وہمی تصوّرات کا سدِّ باب ہو جاتا ہے تو کیا اب کسی برہم گیانی کو دُکھ درد محسُوس نہیں ہوتا؟ اگر اب محسُوس ہوتا ہے تو پہلے بھی اُس کا وجُود حقیقی تھا نہ کہ اعتباری۔ اَور اگر کہو کہ اب بھی دُکھ درد محسُوس نہیں ہوتا تو یہ صریح باطل ہے۔ اگر کوئی روزِ روشن میں سُورج کے وجُود سے اِنکاری ہو تو اُس کے مخبوط الحواس اَور بیڑی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ چُونکہ دُکھ درد وغیرہ کا وجُود دُنیا میں بدیہی الظہُور ہے اَور

کسی ثبوت کا محتاج نہیں، اور دُکھ نتیجہ ہے پاپ کا۔ پس جب دُکھ کا وجود حقیقی ثابت ہے تو اُس کا سبب یا علت یعنی گناہ کیونکر اعتباری ہو گا۔ لہٰذا گناہ بھرم اور وہم نہ رہا بلکہ حقیقی ٹھہرا اور یہ بالکل صحیح ہے۔

گیان گناہ اور اُس کے نتائج دُکھ درد اور رنج ومحن کا وجود عالم میں بدیہی ہے۔ ویدانتیوں کا خیال ہے کہ گیان ہوتے ہی گناہ (بھول) معدوم ہو جاتا ہے۔ واضح ہو کہ گیان کے معنی علم ہیں۔ کسی بیماری کا محض علم اُس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر بیماری کا علم ہی اُس کا علاج ہو سکتا تو صفحہ ہستی پر ڈاکٹروں اور حکیموں کا وجود نابود ہوتا۔ کسی مریض کو اُن کا منت کش احسان ہونے کی کبھی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ بلکہ اپنے مرض کے محض علم ہی سے شفا ہو جایا کرتی۔ گیان وغیرہ کے بھروسے پر وہ کر گناہ کی طرف سے آنکھیں بند رکھنا سخت نادانی اور کج فہمی ہے۔ گیان یا علم (شرع) سے تو محض گناہ کی پہچان ہوتی ہے۔ (رومی ۳: ۲۰) فرض کرو ایک شخص اندھیری رات میں ایک ایسے مکان میں سویا ہُوا ہے جو اندر سے نہایت گندہ اور نجاست سے بھرا ہے۔ مکڑی کے جالے، کوڑا کرکٹ وغیرہ بکھرے پڑے ہیں لیکن وہ شخص نہایت اطمینان سے اُس میں شب باش ہے۔ اب ایک دوسرا شخص چراغ لے کر اُس کمرے میں وارد ہوتا ہے۔ لیکن چراغ کی آمد سے مکین کی طبیعت میں ایک دم ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح مطمئن اور پُرسکون نہیں رہتا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ چراغ کی روشنی نے مکان کی غلاظت وگندگی کو اُس پر ظاہر کر دیا۔ اب وہ ایک لمحہ تک اُس میں رہنا نہیں چاہتا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اُس مکان کو فوراً غلاظت سے پاک کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ چراغ اُس مکان کو ہرگز صاف نہیں

کر سکتا۔ وُہ تو صِرف اُس کی گندگی کو ظاہر کر کے محض اُس کی مدافعت کی طرف مائل ہی کر سکتا ہے۔ اِسی طرح گیان (علم شرع) کو ایک چراغ سمجھیئے۔ (زبور ۱۱۹: ۱۰۵) وُہ اِنسان کے گُناہوں کی کراہت کو اُس پر ظاہر کر دیتا ہے، لیکن دُور نہیں کر سکتا۔ البتّہ وُہ نجات کی ضرورت کو محسُوس کروا کے کِسی طبیبِ رُوحانی کی طرف ترغیب دِلا سکتا ہے، اَور متلاشی محق بنا دیتا ہے۔

اَور اُن کا یہ خیال بھی عجیب ہے کہ گیان حاصل ہونے پر سادھن (عملی تدابیر) ختم ہو جاتے ہیں۔ جیسے پھل لگنے پر پھُول خود بخود جھڑ جاتے ہیں۔ اَور مسیحی تعلیمات کے مُطابق گیان (علم شرع) کے حصُول کے بعد اصل سادھن شرُوع ہوتے ہیں۔ جیسے مرض کا علم ہو جانے پر بہُت سی غذاؤں سے پرہیز رکھنا اَور بہُت سی دواؤں کا اِستعمال کرنا پڑتا ہے۔ پُرانی اِنسانیّت کو اُس کے کاموں سمیت اُتارنا پڑتا اَور نئی اِنسانیّت کو پہننا پڑتا ہے (کُلسی ۳: ۹-۱۰) برہم گیانی کو تو نیک اَور بد دونوں قسم کے کاموں کو تیاگنا پڑتا ہے۔ لیکن انجیل اِس کے برخلاف یہ حکم لگاتی ہے کہ "پس جو کوئی نیکی کرنی جانتا ہے اَور نہیں کرتا؛ اُس کے لئے یہ گُناہ ہے۔" (یعقُوب ۴: ۱۷) جب تک خوابیدہ شخص کو گھر میں لگی ہُوئی آگ کا عِلم ہی نہیں وُہ اُسے کیسے بُجھائے گا؟ جُونہی اُس کی آنکھ کھُلے گی اَور مکان کی آتشزدگی کا گیان ہو گا وُہ ایک دم عملی تدابیر (سادھن) اُس کے بُجھانے کی کرے گا۔ اگر آگ کا گیان ہونے پر بھی اُس کے بُجھانے کی ضرُورت کا قائل نہ ہو تو اُس کے بُزدِلی ہونے میں کیا شک ہے؟

مُکتی از رُوئے ویدانت

اُوپر ہم واضح طور پر دِکھا چُکے کہ گیان یا علم محض سے نجات کا حصُول ناممکن ہے۔ البتّہ گیان گنہگار اِنسان پر اُس کی گُناہ آلُودہ اَور مکرُوہ حالت کو پُورے طور

پیا ئشکارا کر دیتا، اور اس سے چھٹکارا ہرگز نہیں کرا سکتا۔ بلکہ نجات کی ضرورت محسوس کروا دیتا ہے۔ اور ویدانتی مکتی کو چار قسم کی مانتے ہیں، یا یُوں کہیں کہ از رُوئے ویدانت نجات کے چار مدارج ہیں۔ یعنی:۔ سلوک۔ سمیپ۔ سرُوپ۔ سجُج ؛

اوّل۔ سلوک۔ یعنی برہم کے دیس میں رہنا۔ دوم۔ سمیپ۔ یعنی برہم کی قُربت میں رہنا۔ سوم۔ سرُوپ۔ برہم۔ کے ساتھ مشابہت و مماثلت حاصل کرنا۔ چہارم۔ سجُج۔ یعنی برہم کی عین ذات ہو جانا جس کو وہ ابھید ہونا یا برہم میں لین ہونا۔ (سما جانا) کہتے ہیں۔ وحدۃ الوجُود یعنی سجُج سی مُکتی کا کمال ہے ؛

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کوئی کمال کی حالت نہیں، بلکہ برعکس اس کے انتہائی زوال اور عدم کی حالت ہے۔ اوّل تو ابھید ہونے میں کوئی آنند نہیں کیونکہ آنند تو دُوئی (دوئیت) میں ہوتا ہے نہ کہ ادوئیت میں۔ ایک طرف معبُود ہو اور دُوسری طرف عابد اپنے معبُود کے وصل سے اپنی مدتوں کی تشنہ رُوح کی تشنگی بجھائے، اور اس کے دیدارِ فیض آثار سے اطمینانِ قلبی اور سکُونِ باطنی حاصل کرے۔ یک جان و قالب ہو جائیں تب حقیقی آنند ہے۔ لیکن برہم میں فنا ہو جانا کوئی اطمینان کی بات نہیں ہے۔ ایسی مکتی مکتی نہیں بلکہ انتہائی بے بسی اور لاچاری کی حالت ہے۔ اور نہ ہی از رُوئے عقل یہ ممکن ہے کہ جیو جو الپگیہ (محدُود) ہے۔ برہم میں جو سرو گیہ (لا محدُود) ہے کسی صُورت ابھید ہو سکے۔ کیونکہ مُتناہی وجُود لا انتہا زمانہ تک ترقی کرتے جانے سے بھی کبھی بے حد نہیں ہو سکتا۔ ازیں جہت محدُود و لا محدُود جو نقیضین ہیں کبھی مُتحد نہیں ہو سکتے۔ از رُوئے ویدانت اِنسان کے

بھلے اور بُرے افعال کی جزا و سزا دینے والا کوئی عادل و منصف خدا نہیں ہے۔ اور برہم ہی ہر طرح کی نیکی و بدی کا مخرج و منبع ہے اور ضدو نقیضوں کا علت واحد پر اجتماع جائز سمجھتے ہیں۔ اور پاپ اُن کے نزدیک غیر فطری امر نہیں ہے۔ پاپ کا نتیجہ چوراسی لاکھ جنموں کا چکر اور پاپ کے تیاگ اور گیان پراپتی کا انجام برہم کی ذات میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے معدوم اور ناپدید ہو جانا، ویدانت کے مطابق طریق حیات اور نجات وغیرہ کا تصوّر نہایت گمراہ کن اور ہلاکت آفرین ہے۔ اس کے مطابق انسان کو نراچھت (بے خواہش) ہونا نجات کے لیے ضروری ہے یہ بھی قانونِ قدرت کے خلاف جہاد ہے، کیونکہ انسان فطرتی طور پر بے خواہش نہیں بلکہ باخواہش پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ خواہشات کا نیک ہونا انسانی کمال کا نشان ہے۔ اور عدم خواہش تو ادنےٰ اجسام کی خاصیت ہے۔ جیسے پتھر۔ دھات اور نباتات وغیرہ میں اچھی یا بُری کوئی بھی خواہش نہیں پائی جاتی۔ اور برہم میں فنا ہو جانے سے تو نیستی ہی ہوگی، اور سچ ہے کہ نیستی میں خواہش کا وجود محال ہے۔ جبکہ چوراسی لاکھ جنموں میں سے صرف انسانی جنم ہی اعلےٰ اور بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ اور خواہشات کا وجود اور نیک و بد خواہش کا امتیاز بھی اسی جنم میں حاصل ہوتا ہے تو لازم تھا کہ اس جنم کا انتہائی کمال یہ سمجھا جاتا کہ اس میں خواہش کا ظہور اور بھی اعلےٰ ہوتا۔ اور وہ اس صورت میں ہوتا کہ انسان کی خواہشات سفلیہ ذمیمہ معدوم ہو جائیں۔ اور برعکس اس کے خواہشات علویہ و سعیدہ اور جذبات لطیفہ روحانیہ میں حدِ کمال کو پہنچتا۔ لیکن افسوس! کہ ویدانتی لوگوں نے شکست جیو کو قطعی بے خواہش مان کر نجات کو ایک انتہائی متنزل اور ادنےٰ

حالت ثابت کیا ہے۔ تاہم بے خواہش ہونا بھی خلاف واقعہ ہونے کے باعث جہل مرکب ہے۔ کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اِس ملبوس ہستی میں کوئی انسان بے خواہش ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کسی ویدانتی کو مکتی کی اُمید نہ رکھنا چاہیئے۔ پھر برہم گیانی کو کسی کے ساتھ بولنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ دُوسرے کو تُو تم اور تمہارے وغیرہ کہنے سے دُوئی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چُونکہ قدرت نے زبان و ذہن انسان کو استعمال کے لئے دے رکھے ہیں، اور قدرت اپنے قوانین کو جبری طور پر منواتی ہے۔ اور اس لئے ضرور بولنا ہی پڑتا ہے، مگر برہم گیانی اپنی اِس کمزوری و نقیض کی پردہ داری ایک اور صورت میں کرنا چاہتے ہیں۔ کہ جو گیانی سُو (طالب علم) کو سمجھانے اور تعلیم دینے کے لئے بولتے ہیں ورنہ بولنے کی کوئی (اِچھیا) خواہش نہیں ہے۔ اجی صاحب! جو گیا سُو کو اگیان کی تاریکی سے نکالنے اور راہِ راست پر لانے کی فکر بھی تو ایک خواہش ہے۔ خواہش کے معنے ہیں چاہنا۔ جب تم چاہتے ہو کہ دُوسروں کو اُپدیش کر کے راہِ راست پر لاؤ، تو خواہش اور کس پرندے کا نام ہے۔

ویدانتی فنا ہونے کو مکتی کی اعلیٰ حالت سمجھتے ہیں، اور زندگی کو لعنت اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ۔ ہم زندگی سے خارج ہونے کو ہلاکت، اور ابدی زندگی کو خدا کی بخشش اور انعام سمجھتے ہیں۔ اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ کونسا طریق انسان کی فلاح و بہبودِ جسمانی و رُوحانی کا آئینہ دار ہے۔ مسئلۂ عقیدۂ ویدانت کا جمود ہے۔ اور اُس کی تقلید سے نہ تو انسان دُنیوی تہذیب و شائستگی کو حاصل کر سکتا ہے، اور نہ ہی اِس طبعی موت کے بعد اُس کے لئے حقیقی خوشی اور اطمینان و سکون قلبی کی کوئی اُمید باقی رہتی ہے۔ اور انسان آئندہ زندگی کی سُنہری اُمیدوں سے ہاتھ دھو کر یہی کہتا ہے کہ اگر

مُردے نہ جلائے جائیں گے۔ تو آؤ کھائیں پئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائیں گے"۔
(۱۔کرنتھی ۱۵: ۳۲) [illegible]

انجیلی نجات

انجیل کی رُو سے نجات یا ہندہ کی مختصر سی تعریف یہ ہے۔ وہ ہماری انانیت مصلوب ہو کر گناہ کا بدن بیکار ہو جائے۔ آگے کو گناہ کی غلامی میں نہ رہے۔ (رومی ۶: ۶) بدن گناہ کے سبب سے مُردہ اور رُوح راستبازی کے سبب زندہ ہو۔ (رومی ۸: ۱۰)۔ حصولِ کمال کی استعداد پیدا ہو جائے۔ (۲ کرنتھی ۳: ۱۸) خداوند مسیح کے ساتھ مشابہت ہو جائے۔ (فلپی ۳: ۲۱ و ۱۔ یوحنا ۳: ۲) خدا کے ساتھ ملاپ (افسی ۲: ۱۳-۲۲) سزائے عدالت سے رہائی (رومی ۸: ۱) اور یہ نجات خدا کی بخشش ہے نہ کہ ہماری کمائی ہوئی (افسی ۲: ۸-۹) اور یہ نجات ابدی اور لازوال ہے (مکاشفہ ۲۱: ۳-۷ و ۲۲: ۲۷ و عبرانی ۹: ۱۲)۔

ویدانت ایک عقلی اور نیچری مذہب ہے۔ ہم آگے چل کر "عقل اور مذہب" کے زیرِ عنوان عقلی اور نیچری مذاہب کے بازو آزمائیں گے، اور عقل کی حقیقت کو بے نقاب کر کے دکھائیں گے۔

رُوح کے متعلق عقائد

یوں تو رُوح کے وجود کے متعلق دُنیا میں بے شمار عقائد ہیں۔ اور ان سب کو بحث میں لانا محال بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ اگر ان تمام عقائد کو اجمالی طور پر دیکھا جائے تو تین قسم کے خیال معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ایک خیال کے مطابق رُوح مرکب و امتزاجی ہے۔ دوسرے خیال کے مطابق ازلی و ابدی اور بالذات ناقابلِ فنا ہے۔ اور تیسرے عقیدے کے مطابق رُوح حادث ہے، اور اپنی فنا یا بقا کے معاملہ میں ذاتِ واجب کی محتاج ہے۔ اب ہم ان ہر سہ عقائد

مختصر طور پر بحث کریں گے۔

رُوح مرکّب اِمتزاجی

ہندوستان میں چارواک اِس خیال کے قائل ہیں کہ رُوح مُرکّب اِمتزاجی ہے۔ اِس عقیدہ کا بانی برہسپتی تھا۔ یہ لوگ خُدا کی ہستی سے قطعی منکر ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ جسم و رُوح میں کوئی مغایرت نہیں۔ اجزائے مادی کی ترکیب سے اجسام بنتے ہیں اور قوی اجزاء اور رُوح کا مادہ ہے جسم کے فنا ہونے سے رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جیسے ریکارڈ کے ٹوٹنے پر اُس کی آواز بھی معطل ہو جاتی ہے۔ اگر یہ درست مان لیا جائے تو رُوح مادّی ٹھہری اور رُوح کی صفت ادراک ہے۔ پس ہر ایک مادہ کی صفت میں شامل ہو جائے گا۔ اور کوئی مادی شے غیر مدرک نہ رہے گی بلکہ مدرک و غیر مدرک کی تفریق اُٹھ جائے گی۔ مندرجہ ذیل دلائل سے بھی اِس خیال کا ابطال ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) علم حکمت اِس حقیقت پر شاہد ہے کہ سات برس کے بعد جسم کے تمام پُرانے ذرات زائل ہو کر اُن کی جگہ نئے ذرات لے لیتے ہیں اور وُہ جسم بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسّی برس کی عمر تک گیارہ دفعہ جسم انسانی قطعی تبدیل ہو کر ہر دفعہ نئے ذرات سے ایک نیا جسم مرتب ہوتا رہتا ہے۔ اگر ادراک و علم وغیرہ ذرات مادیہ کی صفت ہوتی تو لازم تھا کہ ہر ہفت سالہ معلومات پُرانے زائل شدہ ذرات کے ساتھ ہی زائل ہو جایا کرتیں کیونکہ اُن معلومات کے سرمایہ دار جو ذرات تھے جب وُہ نہ رہے تو معلومات کا قائم رہنا محال ہوتا۔ اور اِس طرح چودہ برس کی عمر کے واقعات اکیس برس کی عمر میں۔ اکیس برس کے اٹھائیس برس میں اور اٹھائیس

برس کے پینتیس ۳۵ برس میں بھول جانے چاہئیں۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف
ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ پرانے ذرّات جدید ذرّات کو اپنے اثرات منتقل
کر جاتے ہیں اور یوں پرانی معلومات و واقعات یاد [illegible] تو
کسی بیمار کو کبھی تندرست نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ [illegible] عالم
[illegible] ہوتا۔ پس [illegible] سے ذرّات کے بار بار (تحلیل
[illegible] اور کسی عضو کے کٹ جانے کے باوجود جسم میں حقیقت کے علم
محافظہ [illegible] میں [illegible] فرق نہیں آتا وہی روح ہے۔ اور وہ غیر مادی ہے
جبکہ ذرّات کے تحلیل ہونے سے وہ زائل نہیں ہوتی۔ کسی عضو کے کٹ
جانے سے کٹ نہیں جاتی۔ تو اس میں شک نہیں کہ اگر جسم یکدم فنا ہو جائے
تو بھی وہ قائم رہے گی پس جو ہی روح ہے، [illegible] مجرد وجود ہے

(۲) واحد حقیقی وہ ہے جس کا کسی طرح سے قسمت و تجزیہ نہ ہو سکے اگر
نفس ناطقہ جسم ہو تو جسم قابل قسمت و صاحب تجزیہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محل
کی قسمت سے حال کا تقسیم ہونا لازم آتا ہے۔ پس جسمیت نفس ناطقہ کی
چاہتی ہے قسمت کو اور قسمت نفس ناطقہ کی چاہتی ہے قسمت معنی واحد
حقیقی کو۔ اور واحد حقیقی کا انقسام محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روح جسم
نہیں بلکہ غیر مادی شے ہے"

(۳) جسم وہ ہے جو ابعاد ثلاثہ رکھے۔ (یعنی طول، عرض و عمق) مگر عقل و علم
جو انسان میں موجود ہیں، ان کی نہ کوئی مقدار ہے، اور نہ امتداد۔ تمام جسمانی
مقولات قسمت و تجزیہ کو چاہتے ہیں۔ مگر علم کا تجزیہ و قسمت محال ہے۔ لہذا
علم خاصہ جسم نہیں۔ اگر کوئی غیر مادی ظرف ہمارے جسم میں اس کے قیام کے لئے
نہیں ہے تو غیر مادی مظروف (علم) کا وجود بھی محال ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ جو

جو غیر مادّی علم کا ظرف ہے، وہ رُوح ہے۔ لہٰذا رُوح غیر مادّی ہے۔

(۴) ترکیب امتزاجی کے اجزا عناصر ہیں۔ اور عناصر میں ادراک۔ علم
و شعور مفقود ہے۔ پس جو صفت اجزا میں موجود نہ ہو وہ مرکب میں کیسے
پائی جا سکتی ہے۔ مرکب شے اپنے اجزا کی کیفیت سے الگ کوئی صفت
نہیں ہو سکتی۔ اگر بارہ گرم دوائیں ملا کر کسی کو کھلائی جائیں تو اس کے
جسم میں سردی پیدا نہ ہوگی، اور نہ ہی سرد دواؤں کی ترکیب میں گرمی۔
اگر شکر کے ایک ذرّے میں شیرینی نہیں تو ایک من شکر کا نچوڑ بھی شیرینی نہ
دے گا۔ اگر ایک ریزۂ سنگ میں علم نہیں تو ایک پہاڑ میں بھی علم نہیں ہے۔
علم اور عدم علم آپس میں نقیض ہیں۔ اور اس صورت میں ایک نقیض
کو دوسرے نقیض کی صفت ماننا پڑے گا۔ اور یہ محال ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ خلاف
عقل اور بے بنیاد ہے۔

رُوح قدیم و قائم بالذّات

دوسرے خیال کے مطابق رُوح ازلی و ابدی۔ قائم بنفسہ اور متصف بصفاتہ
ہے۔ ویدانتیوں کے کئی فرقے ہیں۔ اُن میں سے ایک فرقہ تو رُوح کے جداگانہ وجود
کا قائل ہی نہیں۔ یعنی وہ اربعہ نہیں بلکہ خمسہ عناصر سے الگ کسی لطیف وجود
کو نہیں مانتے۔ اور جو ویدانتی رُوح کی ہستی کے قائل ہیں، تو وہ کثرتِ ارواح
کے قائل ہی نہیں۔ بلکہ تمام مرئیات و غیر مرئیات میں ایک ہی رُوح مانتے
ہیں، اور اُسے برہم (خدا) کا جزو جانتے ہیں۔ وہ تمام اشیاء مادّی و غیر مادّی
کو خدا میں سے نکالتے ہیں۔ اس خیال کے حامی خدا کو مرکّب ثابت کرتے ہیں۔
چارواکئے وغیرہ تو رُوح کو مرکّب امتزاجی مانتے ہیں۔ اور ویدانتی خدا کو مرکّب
مانتے ہیں۔ آریہ لوگ بھی رُوح کو قدیم مانتے ہیں، اور اُس کی قدامت کے

اثبات میں بہت سے دلائل پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ہم قدامت روح کے
عقیدہ کی بطالت کو مبرہن کر کے آخری اور صحیح عقیدہ پیش کریں گے۔

(۱) یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر قسم کا علم و فہم اور عقل و ادراک روح ہی کا خاصہ
ہے اور یہ خاصہ روح کا ذاتی ہے۔ اور خاصہ ذاتی کا زوال کا اپنی ذات سے
محال ہے۔ پس اگر روح قدیم ہے تو اسے اپنی قدامت کا علم ضرور ہونا چاہیئے
لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کسی کی بھی روح کو اپنی قدامت اور
ازلیت کا نہ تو تفصیلی اور نہ اجمالی علم ہے۔ اگر کہا جائے کہ روح کو اپنے حدوث
کا بھی تو علم نہیں تو وہ حادث کس طرح ہو سکتی ہے؟ تو واضح ہو کہ حدوث
قدامت کا عدم علم ہی روح کے حدوث کی سبب ہے۔ اور یہ سکت ویسل
ہے۔ قدامت کے لئے علم لازم ہے۔ لیکن حدوث کے لئے لازمی نہیں
سوامی دیانند کا قول ملاحظہ ہو۔ جو اشیا قدامی ہیں اُن کی صفات و فعل و فطرت
قدامی ہیں۔ اور غیر قدامی جوہروں کے غیر قدامی ہوتے ہیں۔" ستیارتھ پرکاش بات
صفحہ (۸) پس اگر روح آنادی (قدیم) ہے تو اس کا علم و گیان بھی قدامی ہونا چاہیئے
اور از یں جہت اُس کو اپنی قدامت کا بھی علم ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بات
نہیں ہے۔ لہٰذا روح قدیم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حادث اور مخلوق وجود ہے

(۲) روح کے تمام علوم و افعال تحصیلی (اکتسابی) محدود و متناہی ہیں
تو روح محلِ حوادث ہو کر خود حادث ٹھہری۔

(۳) اگر کہا جائے کہ مرض نسیان یا جنون کی حالت میں روح کی صفات حافظ
اور علم وغیرہ قائم نہیں رہتیں۔ اور انسان کو جوان ہونے پر طفلی کے حالات
یاد نہیں رہتے۔ یا یہ کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس نے گذشتہ سال ماہ مارچ
دس تاریخ کے ساڑھے دس بجے کیا کیا تھا وغیرہ۔ تو اول تو ان دلائل سے خو

دیانند صاحب کا مندرجۂ بالا قائم کردہ معیارِ قدامت ٹوٹ جاتا ہے۔ اور دوم یہ کہ ہم تفصیلی علم نہیں بلکہ اجمالی علم کا تقاضا کرتے ہیں۔ رُوح کو اپنی قدامت یا کم از کم کسی گذشتہ جنم کا اجمالی علم تو ضرور ہونا چاہیئے، اگر ماں کے رحم میں بچے کو گیان نہیں ہوتا تو اُس وقت رُوح کا تعطّل اور بے صفات ہونا ثابت ہے۔ حالانکہ "دوامی اشیاء کے صفات و فعل و فطرت بھی دوامی" مسلّم ہیں۔

اب ذرا انصاف سے کہیئے کہ حدوثِ رُوح میں کیا کسر رہی؟

(۴) رُوح کی تمام معلومات اکتسابی اور تحصیلی ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی بلا اکتساب علم عالم ہو جائے۔ ہم اس مکتبِ فطرت میں رُوح کو بتدریج علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ پس اُس کا علم لدنی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اگر وہ قدیم ہوتی تو اُس کا علم ضرور لدنی ہوتا۔ اور علم لدنی کی رُو سے جو معلومات ایک رُوح کی ہوتیں وہی فطرتی و لدنی طور پر تمام ارواحِ انسانی کی ہوتیں۔ لیکن سب کے خیالات و آراء میں مختلف حقائق کے متعلق اختلاف بدیہی ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ رُوح کا علم لدنی نہیں۔ اور ازیں جہت وہ قدیم بھی نہیں بلکہ حادث و مخلوق ہے۔

رُوح مخلوق و حادث

رُوح کے وجود کے متعلق آخری و صحیح عقیدہ کی آئینہ دار بائبل مقدس ہے۔ اور یہ عقیدہ مندرجہ بالا ہر دو عقائد کے بین بین رہتا ہے۔ اگر رُوح کو مرکب امتزاجی ماننے میں تفریط ہے، تو اُس کو قدیم اور قائم بالذات ماننے میں افراط ہے۔ اور افراط تفریط معیوب ہے۔ مسیحیت رُوح کو اُس کے اصلی درجہ سے نہ تو گراتی ہے، اور نہ اُس کے جائز درجہ سے اُس کو بلند کرتی ہے۔ بلکہ ہمارے مسلّمات کے مطابق رُوح مخلوق و حادث وجود ہے۔ اس لئے کہ میرے،

حضور رُوح اور جانیں جو میں نے پیدا کی ہیں بیتاب ہو جاتی ہیں۔" (یسعیاہ ۵۷ : ۱۶) اور پھر خدا کو اَرواح کا خالق (پیدا کرنے والا) ہونے کی حیثیت سے "رُوحوں کا باپ" کہا گیا ہے۔ (عبرانی ۱۲ : ۹) اور جیسے وُہ خالق ہونے کی جہت سے تمام مصنُوعات بیفلیہ و عُلویہ اور مرئیہ و غیر مرئیہ کا مالک ہے، ویسے ہی وُہ ارواح کا بھی مالک ہے۔ "خُداوند سارے بشر کی رُوحوں کا خُدا" (گنتی ۱۶ : ۲۲ و ۲۷ : ۱۶) اور رُوح صرف اِنسان میں ہے۔ "لیکن اِنسان میں رُوح ہے" (ایُّوب ۳۲ : ۸) حیوانات میں رُوح موجود نہیں ہے "مِصری تو انسان ہیں خُدا نہیں۔ اور اُن کے گھوڑے گوشت ہیں رُوح نہیں۔" (یسعیاہ ۳۱ : ۳) حیوانات صرف جان اور جسم کا مجموعہ ہیں۔ اور اِنسان کا اِمتیاز حیوان سے اِس طرح ظاہر ہے کہ اُس میں جان و بدن کے عِلاوہ رُوح بھی موجُود ہے، (۱۔ تھسلنیکی ۵ : ۲۳)

جس طرح جسم سے جسم پیدا ہوتا ہے، اُسی طرح رُوح سے رُوح پیدا ہوتا ہے یعنی قانونِ ارث کے مطابق بچّے اپنے والدین سے پیدائش کے لحاظ سے جسم و رُوح دونوں حاصل کرتے ہیں۔ اور رُوح حادث ہے قدیم نہیں۔ یعنی اَزلی تو نہیں بلکہ ابدی ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وُہ بِالذّات ابدی اور بنفسہٖ غیر فانی ہے، ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کی اَبدیّت اِس صُورت میں مانی جا سکتی ہے کہ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے، اُسی طرح رُوح خدا کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ جسم و رُوح کی جُدائی کا نام جسمانی مَوت ہے۔ اور رُوح سے جُدا ہو کر جسم تو فنا ہو جاتا ہے، مگر رُوح قائم رہتی ہے۔ اِسی طرح رُوح اور خُدا کی جُدائی کا نام رُوحانی مَوت ہے۔ اِسی کو مکاشفہ ۲۱ : ۸ میں "دُوسری مَوت" کہا گیا ہے۔ اور خُدا سے جُدا ہو کر رُوح فنا ہو جاتی ہے۔

مسیحی مسلمات کے مطابق ابدی ہلاکت سے یہی مُراد ہے کہ مخالفین خُدا کی ارواح بباعثِ تناقض و تخالفِ طبائع اُس سے جُدا ہونے کے باعث معدوم و فنا ہو جائیں گی۔ اسی طرح راستبازوں کی ارواح خُدا کے ساتھ مطابقت و مناسبت طبعی رکھنے کے باعث تا ابد زندہ رہیں گی۔ ملاحظہ ہو متی ۲۵: ۳۱-۴۶۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ادنیٰ وجود ہمیشہ اشرف وجود کے سہارے قائم و باقی رہتا ہے۔ ادنیٰ و اشرف کی مفارقت کا نتیجہ ادنیٰ کی ہلاکت ہوتی ہے۔ لیکن ادنیٰ کے فساد و فنا سے اشرف کی فنا لازمی نہیں۔ مثلاً پتے اور شاخیں اگر جڑ کے ساتھ قائم رہیں تو فنا نہیں ہونے۔ اگر الگ ہو جائیں تو جڑ تو قائم رہے گی مگر پتے اور شاخیں فنا ہو جائیں گے۔ اسی طرح جڑ اگر زمین میں قائم رہے تو فنا سے محفوظ رہے گی۔ اور اگر الگ ہو جائے، تو جڑ تو فنا ہو جائے گی مگر زمین قائم رہے گی۔ ایک اور مثال لیجئے جسم کے تمام اعضاء میں دماغ سب سے اشرف مسلّم ہے۔ اگر کسی کی ٹانگ۔ بازو۔ ناک وغیرہ کٹ جائیں یا آنکھیں جاتی رہیں یا دانت نکل جائیں تو بھی وُہ زندہ رہے گا۔ اور ہزاروں لاکھوں لنگڑے۔ لُولے نکٹے۔ اندھے لوگوں کا زندہ اور موجود ہونا بدیہی ہے۔ لیکن کبھی کسی نے کوئی ایسا انسان نہ دیکھا ہوگا کہ جس کا سر کٹ گیا ہو اور وُہ بقیدِ حیات ہو۔ اِس سے یہ ثابت ہُوا کہ اشرف کے فساد و فنا سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ اسی طرح جسم کا وجود منحصر ہے رُوح پر اور رُوح کا قیام خُدا پر۔ اِس عام بحث سے نتیجہ یہ حاصل ہُوا کہ تبدیل پذیر حقیقتیں لاتبدیل وجود کے ساتھ متعلق ہونے سے لاتبدیل اور غیر فانی ہو جاتی ہیں۔ توریت شہادت دیتی ہے کہ وادیٔ سینا میں جب ایزد تعالےٰ

حضرت موسےٰ سے ہم کلام ہُوا، تو اُس کا ظہور جھاڑی میں لگی ہُوئی آگ کی صُورت میں ہُوا۔ اور لاتبدیل وجُود (خُدا تعالےٰ) کی موجُودگی کی تاثیر سے جھاڑی آگ سے جل نہیں گئی بلکہ قائم رہی۔ آریہ لوگ اکثر یہ معارضہ پیش کیا کرتے ہیں کہ "جو پیدا ہُوا ہے وُہ ضرُور مریگا۔ اور جس کی ابتدا ہے اُس کی نیستی ضرُوری ہے"۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ از رُوئے منطق جسکی فنا و نیستی ضرُوری ہے وُہ ممتنع الوجُود ہے نہ کہ ممکن الوجُود۔ واجب الوجُود وُہ ہے جس کا ہونا ضرُوری ہے۔ ممتنع الوجُود وُہ ہے جس کی نیستی (نہ ہونا) ضرُوری ہے لیکن ممکن الوجُود وُہ ہے جس کا نہ عدم ضرُوری ہے اور نہ وجُود ضرُوری ہے۔ پس ممکنات و مُحدثات اپنے وجُود و عدم کے بارہ میں ذات واجب کے محتاج ہیں۔ پس ارواحِ انسانی ممکن و حادثات ہیں۔ اگر وُہ (خُدا) اُنہیں قائم رکھنا چاہے تو وُہ قائم رہتی ہیں اور اگر مٹانا چاہے تو مٹ جاتی ہیں۔ خُدا کی رُوح کی تاثیر ممکنات کو ابدیت میں قائم رکھ سکتی اور رکھتی ہے۔ اِس کے متعلق کلام مُقدس کی تائید ملاحظہ ہو "تیری نگہبانی نے میری رُوح سلامت رکھی"۔ (ایوب ۱۰: ۱۲) "اُسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کی جان اور کُل بنی آدم کا دم ہے"۔ (ایوب ۱۲: ۱۰) "اگر وُہ اپنی رُوح اور اپنے دم کو واپس لے لے تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائینگے"۔ (ایوب ۳۴: ۱۴-۱۵ زبور ۱۰۴: ۲۹) اور کوئی رُوح اپنی بقا میں مختار نہیں ہے بلکہ خُدا تعالےٰ کی مرضی کے زیر ہے "کسی آدمی کو رُوح پر اختیار نہیں کہ اُسے روک سکے اور مرنے کا دن بھی اُس کے اختیار سے باہر ہے"۔ (واعظ ۸: ۸) پھر رُوح کی غیر فانیت و ابدیت کے متعلق یوں ملاحظہ ہو "اور خاک کی خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی اور رُوح خُدا کے پاس جس نے اُسے دیا تھا واپس جائے"۔ (واعظ ۱۲: ۷) اور جناب خداوند مسیح کے قول سے بھی ثابت ہے کہ رُوح حادث بحدُوث بدن نہیں بلکہ غیر فانی و ابدی ہے "جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرسکتے اُن سے نہ ڈرو"۔ (متی ۱۰: ۲۸)

اور سلیمان نبی کا قول بھی دیکھو۔ "لیکن صادق مرنے پر بھی اُمیدوار رہتا ہے"
(امثال ۱۴: ۳۲ و ایوب ۱۹: ۲۶) اگر رُوح کی طبیعت خُدا کی طبیعت سے متضاد
ہو تو خُدا اُسے فنا کر سکتا ہے۔ "بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں
کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے" متی ۱۰: ۲۸۔ ریکارڈنگ کمپنی ماہرین موسیقی
کی آوازوں کو ریکارڈوں میں بند کر لیتی ہے۔ آواز غیر مادی شئے ہے۔ اگر
گویا مر بھی جائے تو بھی ریکارڈ میں اُس کی آواز باقی رہتی ہے لیکن آواز کو
ریکارڈ میں بند رکھنا ریکارڈ ساز کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر چاہے تو اُس کو
تادیر قائم رکھے اور چاہے تو ریکارڈ کو توڑ کر ایکدم معدوم کر دے۔ اور ریکارڈ
وُہی قائم رکھے جاتے ہیں جن میں بھیرا ہوا راگ اصُولِ موسیقی کے فنی
نکتہ نگاہ سے درست ہو۔ ورنہ توڑ دئے جاتے ہیں۔ پس واجب تعالےٰ
ازلی و اَبدی ہے۔ رُوح ازلی نہیں پر صرف اَبدی ہے۔ اور جسم نہ ازلی ہے نہ
اَبدی۔ اور اجسام جو راستباز رُوحوں کو روزِ قیامت حاصل ہونگے، وُہ زندگی
کی اعلیٰ سرشت میں تبدیل ہو کر غیر فانی ہو جائیں گے۔ (۱ کرنتھی ۱۵: ۵۲-۵۳)
اور خُدا کے سامنے نیستی یا عدم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ "کیونکہ اُس کے نزدیک
سب زندہ ہیں" (لوقا ۲۰: ۳۸) اور ارواح و مادہ کی قدامت خُدا کے خالق
ہونے میں کوئی مددگار نہیں ہے۔ بلکہ وُہ قادرِ مطلق اور ازلی و اَبدی خُدا ہے۔
جب اُس نے ایک زمانے میں کائنات کو پیدا کیا، اور انسان کو خلاصۂ کائنات
بنایا، تو کیا وجہ ہے کہ وُہ مُردوں کو زندہ نہ کر سکے۔ جس مادہ کو اُس نے پیدا
کیا اُس کو مٹانا اور قائم رکھنا اُسی کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ اُمید ہے
کہ ناظرین رُوح کے متعلق اس بیان سے کافی فائدہ اُٹھائیں گے ÷

تزکیۂ نفس و ریاضتِ بدنی | یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ ہمیشہ

اشرف کے فساد سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے۔ جیسا ہم اُوپر کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں۔ اور فطرت کی صدہا اشیاء پر غور و فکر کرنے سے اِس امر کی صداقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔ اسی طرح رُوح اِنسانی میں جو جسم کی بہ نسبت اشرف و اعلےٰ ہے بگاڑ پیدا ہونے سے جسم بھی لازمی طور پر اُس سے متاثر ہو گیا جب گُناہ کے باعث اِنسان خُدا سے جُدا ہو گیا یعنی رُوحانی تنزل اور موت کے ماتحت آ گیا، تو جسم بھی موت و تنزل سے مغلوب ہو گیا۔ اور اس طرح بنی نوع اِنسان پر موت نے تسلط جما لیا۔ اب اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس سے رُوح بحال ہو سکے تو ضرور جسم بھی فنا کے قبضہ سے چھوٹ کر بقا کو حاصل کرے۔ اِسی نکتہ پر پہنچکر انسان میں جنگلی۔ ریاضت اور تپسیا کے خیالات پیدا ہو گئے ہندوستان کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی رہبانیت نے ریاضت جسمانی کے خیالات کو حد سے زیادہ بڑھا دیا اگرچہ نفسانی خواہشات کو روکنے اور دبانے سے رُوحانی زندگی میں ارتقاء کی کچھ شعاعیں پڑنے لگتی ہیں۔ اور نفس امارہ پر قابو پانے کی کوشش کرنا نیک زندگی گذارنے کے لئے کسی حد تک مفید بھی ہے۔ تاہم یہ سراسر غلط فہمی اور نادانی ہے کہ جسم کو بالکل حقیر اور ردی سمجھ کر اُس کی نشو و نما اور پرورش کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لیجائیں جس طرح قیمتی اشیاء کی حفاظت مکان کی پختگی پر منحصر ہے، اسی طرح رُوح کی حفاظت کے لئے جسم کی پرورش جو اُس کا ظرف ہے نہایت ضروری ہے ورنہ خُدا داد انعام (جسم) کی بے قدری و حقارت ہوگی۔ اور خودکشی و رہبانیت ایک ہی مفہوم کے مصداق ہوں گے۔ واضح ہو کہ کھانا پینا اور پہننا کوئی گُناہ نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نیکی ہے۔ "کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائیگا۔ اگر

نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان (رُوحانی نقصان) نہیں۔ اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں" (۱ کرنتھی ۸ : ۸) "کھانے پیٹ کے لئے ہیں اور پیٹ کھانوں کے لئے۔ لیکن خُدا اس کو اور اُن کو نیست کرے گا" (۱ کرنتھی ۶ : ۱۳) کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں، بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو رُوح القدس کی طرف سے ہوتی ہے" (رومی ۱۴ : ۱۷) اگر کھانا پینا اور پہننا وغیرہ گناہ ہو تو اس گناہ کا بانی خُدا کو ماننا پڑے گا جس نے ہمیں جسم دیا۔ اور جسم بھی ایسا جو خوراک و پوشاک اور دیگر ضروریات کا محتاج ہے۔ جب خُدا رازق ہے اور اُس نے ہماری جسمانی خواہشات کا جواب بھی اسی فطرت کے اندر دیا ہے تو لازمی بات ہے کہ ہم رُوح کے ساتھ جسم کی بھی فکر رکھیں۔ لیکن امورِ معاشرت میں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا خلافِ فطرت ہونے کے باعث جسمانی سزا لازمی ٹھہراتا ہے۔ اگر بالکل نہ کھائیں تو موت یقینی ہے۔ اور اگر حد سے زیادہ کھائیں تو بھی اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودنے کا مقولہ درست ہے۔ امورِ معاشرت میں اعتدال مفید ہے اور تجاوز مضر۔ پیٹ خُدا نے خالی رکھنے کے لئے نہیں بنایا، بلکہ اس لئے کہ اس میں کچھ ڈالا جائے۔ جسمانی زندگی اسی پر منحصر ہے۔ اگر جب ہیں کبھی کچھ ڈالنا ہی نہ ہوتا تو اُس کا رکھنا بلا مقصد ہوتا۔ اسی طرح جو اعضاء خُدا نے ہماری جسمانی ساخت میں بنا دئے ہیں وہ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ مٹانے کے لئے نہیں بلکہ قائم رکھنے کے لئے ہیں۔ (دیکھو توڑوں کی تمثیل متی ۲۵ : ۱۴ - ۳۰)

اگر نفسیاتی نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کا دماغ بمنزلہ ایک کپتان کے ہے۔ اور جسم کے تمام اعضاء سپاہی ہیں۔ پیٹ راشن کا گودام اور

دِل بھنڈاری ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کپتان کی طاقت کا تمام تر دار و مدار
سپاہیوں کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اکیلا کپتان کبھی دشمن کی فوجوں کو
مغلوب نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سپاہیوں کے ضعف و قوت کا انحصار خوراک
کی کمی وبیشی پر ہے۔ جس قدر اچھی اور مقوی خوراک کا ذخیرہ پیٹ کے گودام میں
ہوگا۔ اور دل کے ذریعے سے دماغ اور دیگر اعضاء کو وہ خوراک بقدرِ ضرورت
ملیگی، اُسی قدر دماغ اِن اعضاء سے بہترین خدمات لے سکیگا جب اعضا
کی نشوونما میں لاپرواہی و بے احتیاطی ہوگی اور اُن سے محنت زیادہ لیجائیگی
تو آہستہ آہستہ کمزور ہوتے جائیں گے۔ اور اُن کی کمزوری و ناتوانی سے دماغ
بھی ضعیف و نحیف ہو کر بےکار ہو جائیگا اور اس طرح سے جو بہترین
خدمات اپنے اعضاء سے ہم مخلوقاتِ خدا کی بجا لا سکتے ہیں وہ انجام نہ پائیں
گی۔ اور یوں انسانی زندگی ایک انتہائی خودغرضی کی زندگی بن جائے گی۔ اور
خدا سے محبت کرنے کا پہلا زینہ ہے مخلوقات سے محبت کرنا جو کوئی
دیدنی مخلوقات سے محبت نہیں رکھتا وہ نادیدنی خدا سے کیسے محبت رکھ سکتا
ہے (۱ یوحنا ۴: ۲۰) "اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اُس کی اولاد
سے بھی محبت رکھتا ہے" (۱ یوحنا ۵: ۱) اور تارک الدنیا ہو کے مخلوقات
سے محبت و ہمدردی کے مواقع ہی نہیں ملتے۔ اس لئے ان ذرائع سے خدا
کا وصال حاصل ہونا قطعی ناممکن و محال ہے۔ جو لوگ بنی نوع انسان کے
ساتھ ہمدردی و محبت کے خیال کو ترک کرکے براہِ راست خدا ہی سے ملاپ
کرنا چاہتے ہیں؛ وہ اولاد سے نفرت اور والد سے محبت رکھنے کو ممکن سمجھتے
اور ایک کنارے کے سمندر کے قائل ہیں۔ جیسے ایک کنارے کے دریا کا
وجود محال ہے، ویسے ہی مخلوقات کو چھوڑ کر خدا سے محبت رکھنا ناممکن ہے۔

کلامِ الٰہی کا یہ پیغام ہے کہ مُحرّکاتِ نفسانیہ اور اغذیہ جسمانیہ میں اپنے دلوں کو یہاں تک نہ اُلجھاؤ کہ خُدا کی یاد ہی تُمہارے دلوں سے بِسر جائے۔ اور یہ کہ تم بڑے نفسانی اور دُنیا پرست ہی ہو جاؤ۔ کلام کا فرمان ملاحظہ ہو۔ "کیونکہ نہ ہم دُنیا میں کُچھ لائے۔ اور نہ کُچھ اُس میں سے لیجا سکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے پہننے کو ہے تو اُسی پر قناعت کریں" (۱۔ تیمتھیس ۶: ۷-۸ و لوقا ۱۲: ۲۲ و متی ۶: ۳۲) دو مکھیاں ہیں۔ ایک کھانڈ کے شیرہ پر بیٹھتی ہے، اور اُس میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر زندہ باہر نہیں نِکل سکتی۔ دُوسری مکھی مصری کی ڈلی پر بیٹھتی ہے اور کھا کر خوشی سے اُڑ جاتی ہے۔ مزا تو دونوں نے شیرینی کا لیا مگر ایک کا انجام ہلاکت اور دُوسری کا زندگی اور خُوشی ہُوا۔ اِسی طرح لذائذ و حظائظِ نفسانیہ کے پُجاری بن جانے سے خُدا سے جُدائی اور ہلاکت لازمی ہے۔ اور اشیائے جسمانیہ کو اپنے غلام بنا کر اُن سے خاطر خواہ کام لینا خُوشی کا مُوجب ہے۔ امُورِ معاشرت میں بھی افراط و تفریط مُوجبِ ہلاکت ہے۔ اور ان نعمت ہائے گوناگوں کو ٹھکرا دینا کفرانِ نعمت (۱۔ تیمتھیس ۴: ۱-۵)۔

اکثر سادھو اور تیاگی بیراگی لوگ حظائظِ جسمانیہ اور لذائذِ نفسانیہ سے مُنہ موڑ کر تارک الدُّنیا ہو جاتے ہیں۔ اور ویرانوں میں جا کر اپنے جسموں کو نہایت بیدردانہ و جاہلانہ طریقوں سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں۔ فاقوں مرتے ہیں۔ اُلٹے سر کے بل درخت پر لٹکتے۔ جل دھارے کرتے۔ باہیں سُکھا لیتے ہیں تاکہ اُن کی انانیّت (خودی) مِٹ جائے۔ لیکن یہ کوئی خودی کُشی نہیں بلکہ خودکُشی ہے۔ ایسی کٹھن ریاضتوں کے باوجود وہ حقیقی خُوشی اور سکُونِ قلبی سے محرُوم رہتے ہیں۔ اِسی واسطے مغربی رہبانیت اور ہندوستانی ریاضت جن میں حماقت ایک اُبھرا ہُوا عنصر ہے مقبُول

عام نہ ہو سکے۔ اور مذہبی دُنیا میں اُن کی قدر و منزلت اِن خیالات کے حامیوں کی توقعات کے خلاف ہُوئی۔ اور اُن کی تقلید دیرپا نہ رہی۔ ہندوستان کے تو پتے پتے پر کرم مارگ۔ بھگتی مارگ۔ گیان مارگ تپسیا آہنسا پرمو دھرما اور نروان وغیرہ لکھے ہُوتے ہیں۔ اور مہاتما بُدھ نے اِن خیالات کو بہُت وُسعت دی۔ اور بدنی ریاضت کو حد سے بڑھا دِیا۔ کسی وقت یہ خیالات ہمہ گیر تھے۔ اور اب تک اُن کا بقیہ کم و بیش ہر حصّہ دُنیا میں موجُود ہے۔ پولُس رسُول بدنی ریاضت کو غیر فطری ہونے کے باعث معیُوب ٹھہراتا ہے۔ ملاحظہ ہو "کیونکہ جسمانی ریاضت کا فائدہ کم ہے لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے" (۱۔تیمتھیس ۴: ۸۔ کلسی ۲: ۲۰-۲۳) اگر ترک دُنیا اور اِس قسم کا تزکیۂ نفس رُوحانی کمالیّت کے حصُول کے لئے ضرُوری شرط ہو، تو ضرُور ہے کہ تمام ہی نوع انسان آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں ڈیرے لگائیں۔ کیونکہ جو چیز بذریعہ ترکِ دُنیا و ریاضت حاصل ہونے کی اُمید ہے اُس کی ضرُورت سے کوئی خالی نہیں۔ پھر جنگلوں میں آباد ہونے سے آبادیاں جنگل ہو جائیں گی۔ اور جس دُنیا کو ترک کیا وہی ساتھ جائے گی۔ اور اِس طرح دُنیا کے تمام کارخانے بگڑ جائیں گے۔ اور تمدّنِ معاشرت کے عالم میں اِنقلاب کے طُوفان برپا ہونے سے انسانی زِندگی نہایت خطرناک ضلالت و گمراہی کے سمندر میں غرقاب ہو جائے گی۔ اور "نہ مرض رہے نہ مریض" کا مقُولہ پُورا ہو جائے گا۔

اگر جسمانی اعضاء اور نفسانی قوٰی کو مضمحل و ازکار رفتہ بنا کر اور بدی کے صدُور کے امکان کو مٹا کر کوئی بدی سے بچنے اور نیک کردار ہونے کا دعویدار ہو تو یہ کوئی خُوبی اور اخلاقی جرأت کا کام نہیں ہے۔ بلکہ انتہائی بزدلی

وخُنک طبعی ہے۔ رابرٹسن کا قول کیرکٹر یا سیرت کی تعریف میں کیا خوب ہے کہ "زبردست جذبات اور اُن پر زبردست قابو کا نام سیرت ہے۔"
لیکن اگر کوئی شخص جو کہ چشم بعلّتِ موروثی ہو یہ دعویٰ کرے کہ میں اپنی تمام زندگی بھر کبھی بدنظری کا مرتکب نہیں ہُوا تو کونسی خوبی ہے۔ اگر گونگا کہے کہ میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی یا کسی کی بدگوئی نہیں کی تو یہ کوئی قابلِ تحسین بات نہیں ہے۔ کوئی بلند دکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ اور نیچے زمین پر شیر موجود ہے۔ اگر وہ شخص اُوپر ہی سے پُکارے کہ "دیکھو میری بہادری کہ میں شیر سے مُطلق خوف نہیں کھاتا" تو کون ہے جو اُس کے اس بُزدلانہ ومضحکہ خیز دعویٰ پر نہ ہنسے گا؟ ہندوستان میں نناگی بیراگی لوگوں کا بھی یہی حال تھا اور ہے۔ لق ودق صحرا میں اکیلے تنہا رہتے ہُوئے اوّل تو اُن کا ماحول ہی اِس قسم کا ہوتا ہے کہ عملی بدی کا امکان ہی محال ہوتا ہے بدنظری کریں تو کس پر۔ زنا کریں تو کس سے وہاں اُن کے سِوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ اِسی طرح چوری۔ جھُوٹ اور عداوت وغیرہ کا بھی کوئی امکان وہاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں ایسے مواقع ہی ناپید ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اعضائے جسمانیہ کو معطّل وبیکار کرتے ہُوئے بھی نیت میں خواہشاتِ بد کا دریا لہرایا کرتا ہے۔ کیونکہ سانپ کے بِل کو مارنے سے سانپ نہیں مرتا۔ اگرچہ عملی گناہوں کا موقع نہیں ملتا اور اُن کا امکان عارضی طور پر مِٹ بھی جاتا ہے لیکن خیالی گُناہ سے رہائی محال ہے۔ جس طرح ایک کوڑھی والدین کا بچہ طبعی موروثی طور پر مبروص ہونے کے باعث دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھے جانے پر بھی مرض کے جراثیم سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں اس مرضِ موذی کے جراثیم ضرور قائم رہیں گے۔ اسی طرح اِرثی گُناہ آلودہ طبیعت ترکِ دُنیا

اور تزکیۂ نفس سے بحال نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کے موروثی مرض ہونیکی شہادت
کلامِ الٰہی یُوں پیش کرتا ہے۔ "دیکھ! مَیں نے بدی میں صُورت پکڑی اور میں
گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا" (زبور ۵۱: ۵ و رومی ۵: ۱۲) کیونکہ
"مَیں جانتا تھا کہ تُو بالکل بے وفا ہے اور رحم ہی سے خطاکار کہلاتا ہے"
(یسعیاہ ۴۸: ۸) اور نہ ہی سمادھی لگانے اور محض ارادہ پر زور دینے سے
گناہ سے رہائی ممکن ہے۔ کیونکہ "ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ
سے بن نہیں پڑتے چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر
جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا وہ کر لیتا ہوں" (رومی ۷: ۱۸-۱۹) پس گناہ کا
ازالہ انسانی تدابیر سے محال ہے۔ گناہ کی علت چونکہ بُری خواہش ہے اور
وہ کسبِ بد سے پیشتر ہی موجود ہوتی ہے۔ (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵) اور خواہشِ بد
کوئی اکتسابی شئے نہیں بلکہ طبعی موروثی ہے۔ اِس لئے ریاضت وغیرہ سے اُس
کا انسداد [illegible] ہی ممکن ہوتا اگر وہ کوئی تحصیلی اور اکتسابی شئے ہوتی
اِس لئے مُقدس پولُوس رسول فرماتا ہے۔ "اِن باتوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی
عبادت اور خاکساری۔ اور جسمانی ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صُورت
تو ہے، مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا"
(کلسی ۲: ۲۳)۔

قدرت نے جو طاقتیں ہمارے اندر پیدا کر دی ہیں وہ بذاتہ بُری نہیں
ہیں۔ بلکہ اُن کو اچھا یا بُرا بنا دینا ہماری نیت سے حُسن یا قبح پر منحصر ہے۔
اور ان قابلیتوں کو مسلوب و بیکار کر دینا فطرت کے خلاف جہاد اور خدا کی
مرضی سے بغاوت ہے۔ اسی لئے پولوس رسول نے یہ جانتے ہوئے کہ غصّہ
ایک فطرتی جذبہ ہے اُس کے متعلق فرمایا کہ "غصّہ تو کرو مگر گناہ نہ کرو۔ سورج

کے ڈوبنے تک تمہاری خفگی نہ رہے" (افسی ۴: ۲۶) ایک بزرگ جہاندیدہ کا قول ہے کہ "وہ بیوقوف ہے جسے کبھی غصہ ہی نہیں آتا۔ اور وہ عقلمند ہے جو غصے کو آنے نہیں دیتا"!

مشہور یونانی حکیم سقراط کی بیوی نہایت بدمزاج اور تُندو تلخ تھی۔ ایک دن اُس نے سقراط کو ایک معاملہ پر بہت سخت سُست کہا۔ مگر وہ اُس کی بے لگام زبان کی ہنگامہ خیز روانی کو دیکھ کر دروازے میں چُپ چاپ جا بیٹھا۔ اُس کی اِس خاموشی سے وہ اور بھی جھنجھلائی۔ اور غُصّے سے برتنوں کا دھوون اُس کے سر پر انڈیل دیا۔ سقراط نے غصّہ کو روکتے ہوئے نہایت نرمی اور خندہ پیشانی سے فرمایا کہ "اِس قدر گرجنے کے بعد برسنا بھی ضروری تھا"! اور خُداوند مسیح نے سب سے بڑھ کر انتقامی جذبات پر قابو پانے اور صبر و برداشت کرنے کی عملی مثال صلیب پر دشمنوں کے حق میں معافی و برکت مانگنے سے پیش کی۔ (لوقا ۲۳: ۳۴) پھر خداوند مسیح کی شمعِ محبت کے پروانے مقدس ستفنس نے بھی اپنے پیرِ طریقت کی طرح بوقت سنگسار ہونے کے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دُعا مانگی کہ "اے خُداوند یہ گناہ ان کے ذمہ نہ لگا"! (اعمال ۷: ۶۰) ان تمام امثلہ و توضیحات سے مستنبط یہ مقصود اور خلاصۃ المرام یہ ہے کہ فطرتی قوےٰ اور نیچرل جذبات و جبلّت کو معطل کرنے کی بجائے اُن کو ایک منتظم صورت میں بطریق احسن جائز استعمال میں لانا عین دانائی انسانیت اور خدا کی فرمانبرداری ہے۔

ہمارے نفسانی و بہیمی قویٰ جب بدکرداری و نفسانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اُن کی حالت کا خاکہ کچھ اس طرح پر ہوتا ہے جیسے ایک گندی بدرو شہر سے تمام گندگی و غلاظت کو لیجا کر با ہر ایک بسیط قطعۂ اراضی کو

ذلیل اور تعفن کا مرکز بنا دیتی ہے۔ اور ہر کوئی اُس جگہ سے نفرت کرتا ہے اور کوئی بھی اُس کے پاس سے گزرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ خاکہ اُس وقت کا ہے جب ہمارے جذبات پر سفلی عنصر غالب ہوتا ہے۔ اب اِس تصویر کا دوسرا رُخ جو نہایت حسین اور دلکش ہے ملاحظہ ہو۔ ایک زیرک و دانا آدمی اُسی قابلِ صد نفرت و کراہیت قطعۂ اراضی کو اِس طرح پست عام و خوشگوار بنا دیتا ہے کہ اُس خطے میں ایک خوشنما باغ لگا دیتا ہے۔ اور اُسی کھاد والے پانی سے اُسے سینچتا ہے۔ اب وُہ زمین دیگر قطعات کی بہ نسبت زیادہ زرخیز ہونے کے باعث پودوں کو زیادہ خوراک دیتی ہے۔ اور وہی متعفن و غلیظ جگہ اہلِ جہاں کی دلبستگیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ بھانت بھانت کے میووں کی کثرت۔ فواروں کی سیم ریزی۔ شمیم گُل کی عنبر بیزی طیوروں کی نغمہ سنجیاں۔ بادِ نسیم کی لطف باریاں گُلہائے دلکشا کے رنگین مرقعے خوش بہار پھولوں کے جھمگھٹے۔ نظارانِ و دلدادگانِ فطرت کی گُلگشت سے روضۂ جنت کا دھوکہ پڑتا ہے۔ اور وُہی گھنونی دکھائی دینے والی جگہ اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں میں کیف نما اثرات لئے ہوئے شائقینِ فطرت کے لطیف جذبات پر کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی حال ہماری جسمانی قوتوں کا ہے۔ قُدرت نے جس خاص مقصد کے ماتحت اِن کو پیدا کیا ہے اُس سے تجاوز کرنا الٰہی سرتابی اور قانونِ قدرت کی خلاف ورزی ہے۔ اِن طاقتوں کو مُعطّل کر لینا یا اُن کو مخصوص افعال سے باز رکھنا اور دبانا ایسا ہی مضرت رساں ہے جیسا موریوں کو بند لگا دینے سے شہر میں غلاظت و گندگی کے جمع ہو جانے کے باعث مختلف امراض کے پھیلنے سے نقصان ہوتا ہے ÷

ریاضت وغیرہ کے خیالات گناہ کے وجود اور اُس کے باعث انسان کی رُوحانی بے چینی اور اِضطراب کے مظہر ہیں۔ اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ

ان انسانیت سوز طریقوں پر صدیوں عمل درآمد کرتے رہنے کے بعد بھی انسان حقیقی اطمینانِ قلبی اور سکونِ باطنی سے بے نصیب ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مصائبِ جسمانی و آلامِ رُوحانی کے موجبات کا صحیح سراغ لگانے میں لوگ قاصر رہے۔ جب تک کسی مرض کی علّت کا علم نہ ہو اُس کے نتائج سے بچنا ناممکن ہے۔ ہمیشہ سبب کی مدافعت سے نتیجہ کی مدافعت ہُوا کرتی ہے۔ جس طرح ہم بارہا ذکر کر چکے ہیں کہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشرف کی اصلاح سے ادنیٰ کی اصلاح ممکن ہے نہ کہ اُس کے برعکس۔ پس گناہ رُوح کو عارض ہے۔ اور بطور نتیجہ اُس کے آثار جسم میں بھی ظاہر ہیں۔ رُوح اور جسم کا تعلق بطور راکب و مرکب کے سمجھیے۔ یا یوں کہیں کہ رُوح ہماری زندگی میں مثل دولہا کے ہے۔ اور اعضائے جسم اُس کے ہتھیار۔ بقول شخصے ؎

جب تک ہے رُوح جسم میں چلتے ہیں دست و پا

دُولہا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے

جب رُوح پاکیزہ اور دلِ عارف کی طرح صاف اور گناہ کے زنگ سے منزّہ و مبرّا ہوتی ہے، تو ان ہتھیاروں کو نیک کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ اور جب رُوح نفسِ امّارہ کے دامِ تزویر میں مُبتلا ہوتی ہے تو اِن ہی ہتھیاروں کو بدی کی راہ میں استعمال کرتی ہے۔ مثلاً زید اور بکر کے پاس دو تلواریں ہیں۔ زید نے اپنی تلوار سے کسی بیگناہ کا سر قلم کر دیا۔ اور بکر نے اپنی تلوار سے ایک شیر کو مار کر چند راہگیروں کی جانیں بچا دیں۔ ہر دو صورتوں میں تلوار اچھی یا بُری نہیں بلکہ تلوار کے استعمال کنندوں کی طبائع نیک یا بد ہیں۔ اسی طرح جو نیک یا بد افعال ہمارے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں وہ رُوح کی بدیا

نیک خصلت کے آئینہ دار ہیں۔ جب ہماری رُوح کا مطلع صاف نہیں ہوتا اور
اُس پر گناہ کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، تو ان ہی اعضاء سے
ہم بُرے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ ہاتھوں سے چوری۔ حق تلفی ظلم اور
خون ریزی۔ زبان سے دروغ گوئی۔ دروغ حلفی اور گالی و دشنام۔ آنکھوں سے
بدنظری فحش بازاری کُتب کا مطالعہ اور عیب بینی۔ کانوں سے ہزلیات۔
بدگوئی۔ نمامی اور نفسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے قصے سُننا پسند کرتے
ہیں۔ دماغ ہمیشہ بدی کے منصوبے باندھتا۔ اور پاؤں ٹیڑھی روشیں اختیار
کرتے ہیں۔ اور جب ہماری رُوحانیات پر آفتاب صداقت کی ضیا باریاں
ہوتی اور رُوح آغوشِ محبوب کی طرح پاک و بے عیب ہوتی ہے، تو اسی دماغ
سے جذباتِ سعیدہ اور خیالاتِ پسندیدہ اُبلے پڑتے ہیں۔ اور لطیف و سحر
آگیں پاکیزہ تخئیل خندۂ سار کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلتا ہے۔ زبان
سے خدائے عزّ و جل کی تعریف و توصیف کی خراماں موسیقی و کیف زا ترنم نکل کر
لبوں پر پھیلتا ہے۔ اور غمزدوں کے لئے تسلّی سے بھرے ہُوئے فقرے زبان
سے نکلا کرتے ہیں۔ ہاتھ خیرات پر مستعد ہوتے۔ اور مریضوں کی مرہم پٹی و
تیمارداری کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ کان کلامِ الٰہی کی آواز پر جُھکتے اور
بدگوئی سُننے سے نفرت کرتے ہیں۔ اور دل میں شکرگذاری۔ محبت۔ نیکی۔ رحم
ہمدردی۔ معافی اور خدا پرستی کے جذبات و خیالات جوش مارتے ہیں۔ غرضیکہ
رُوحانی کمالیت سے ہماری جسمانی زندگی بھی متاثر ہو کر رُوحانیت میں تبدیل
ہو جاتی ہے۔ اور انسان بالکل نیا مخلوق بن جاتا ہے۔ پر جس طرح لوہے کی دکان
پر سونا نہیں مل سکتا، اسی طرح بغیر خداوند مسیح کے جو تمام جہان کے طبیب
رُوحانی ہیں رُوحانی کمالیت اور دلی صحت کا حاصل ہونا قطعی محال ہے شفا خا[illegible]

حیوانات میں صرف مویشیوں کا علاج ہوتا ہے، اِنسانوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہمارے تمام جسمانی امراض و عوارض کا علاج معالجہ ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ لیکن رُوحانی مرض (گناہ) کے علاج کے لئے کوئی شفاخانہ دُنیا میں موجود نہیں ہے۔ مریض رُوحوں کا حکیم حاذق اور طبیب صادق خداوند مسیح ہے۔ اُس پر ایمان لانے والے اور دِلی توبہ سے اُس کے حضور جانے سے رُوحانی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ پس تمام ریاضت کرنے والے اور تھکے ماندے اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اطمینانِ رُوحانی اور سکون قلبی دینے کے لئے خداوند مسیح دعوت دیتا ہے۔ (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

عقل اور مذہب

مذہب کی ضرورت

اِنسان فطری طور پر کمزور اور بیکس ہے، اور کسی ایسے دستگیر و حاجت روا، قادر اور عظیم طاقت کے ماتحت ہو کر رہنا چاہتا ہے، جو اُس کی مشکلات و مصائب کو حل اور حوائج و ضروریات کو پورا کر سکے۔ ہر اِنسان اپنی طبعی کمزوری کے سبب ایک حاجت روا کی ضرورت کا قائل ہے۔ کوئی زبان سے لاکھ اِنکار کرے لیکن زبانی اِنکار اُس زبردست حقیقت کے وجدانی احساس کی تسکین کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اِس عالم اسباب میں اُس فوق الفہم اور غیر مرئی ہستی کے ثبوت کے لئے سب سے بڑی عقلی دلیل استدلال اِنی ہے (یعنی مصنوع سے صانع کا تصور)۔ اِس سے آگے عقل طبعی کی رسائی محال ہے اور اِنسان محدود العلم اور قاصر العقل عقلی دلائل کے زینے لگا کر وہاں تک نہیں

پہنچ سکتا۔ جس طرح اِس خارجی مادی عالم کے قوانینِ طبیعہ کے ساتھ اجسام مادیہ کثیفہ کی موافقت و مناسبت رہنے سے اجسام قائم اور زندہ رہتے ہیں؛ اسی طرح رُوحِ اِنسانی کے اُس عالمِ رُوحانی کے قوانینِ رُوحانیہ کے ساتھ تطابق و توافق کے باعث رُوحِ اِنسانی صحت کی حالت میں برقرار رہتی ہے۔ اگر اجسامِ مادیہ کی عالمِ خارجی کے ساتھ مطابقت قائم نہ رہے تو وُہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح اگر اَرواحِ اِنسانی کی اُس عالمِ رُوحانیہ لطیفہ کے ساتھ موافقت قائم نہ رہے تو وُہ فنا ہو جاتی ہیں۔ خُدائے قدیر و حکیم نے اپنی قُدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے جس طرح ہماری جسمانی پرورش کے لئے اِس مادی دُنیا میں تمام ضروری اور مکتفی سامان مہیا کر دئے ہیں، اُسی طرح ہماری رُوحانی پرورش کے لئے بھی اُس نے تمام ضروری سامان پیدا کر دئے ہیں۔ اور وُہ سامان جو ہماری حوائجِ رُوحانیہ اور ضروریاتِ خلاقیہ کو پُورا کرتا ہے اُسی کا نام مذہب ہے۔ بعض لوگ جن کا رُوحانی معیار اور مذہبی نکتۂ نظر بہت پست ہے، خواہ مخواہ اُمورِ معاشرت اور چند ظاہری نشان وغیرہ رکھنے کو بھی مذہب کا جُز بنائے بیٹھے ہیں۔ معاشرت و سیاست تو جسمانی مذہب ہی کا جز ہیں، رُوحانی مذہب میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مذہب کا تعلق صرف ہماری رُوحانی زندگی کے ساتھ ہے اور بس۔ پس ثابت ہُوا کہ جس طرح جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے جسمانی اسباب کی ضرورت کا اِنکار ناممکن ہے۔ اسی طرح رُوحانی زندگی کے قیام و بقا کے لئے مذہب کی ضرورت کا اِنکار ناممکن ہے، پس یہی مذہب کی ضرورت ہے۔

عدم مذہب سے انسانی زندگی میں بد اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جسم میں صحت مفقود اور علالت موجود ہو جاتی ہے۔ دیگر صورت میں جب ہم رُوحانی قوانین سے تجاوز کرتے ہیں تو ہماری رُوح صحت کی بجائے رُوحانی امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور رُوحانی مرض کا نام گناہ ہے۔ خُداوند کریم نے اپنی عنایت بے غایت سے ایسے سامان بھی فطرت میں پیدا کر دیئے ہیں جن سے اِن جسمانی امراض کی مدافعت ہو سکے۔ ہر مرض کے علاج کے لیے ہر نوع کی جڑی بوٹیاں اور ادویہ کارخانہ فطرت میں موجود ہیں۔ ہر مرض کی تشخیص اور علاج و معالجہ کی مفصل تشریحات کتب طب میں موجود ہیں۔ اب جبکہ خُدائے حکیم و قدیر نے انسان کو جسمانی عوارض سے نجات دلانے کے لیے اِس قدر اعلےٰ سامان عطا کئے ہیں تو لازمی امر ہے کہ روحانی امراض (گناہ) کی مدافعت کے لئے نسبتاً اُن سے بھی اعلےٰ سامان عنایت کرے۔ چنانچہ رُوحانی طب کی کتاب بائبل مُقدس ہے، جس میں رُوحانی امراض کی تشخیص اور اُن (گناہوں) سے نجات حاصل کرنے کے نہایت زُود ہدف اور لاثانی نُسخے مرقوم ہیں۔ جو کوئی مرضِ گناہ کے شافی و قطعی علاج کا خواہشمند ہو وہ بائبل مُقدس کی طرف متوجہ ہو۔ مذہب کا پہلا کام یہی ہے کہ وہ انسان کی رُوحانی فطرت کے فساد کو دُور کر کے اُسے اُس کی اصلی فطرت یعنی پاکیزگی پر بحال کرے۔ اور جب تک خاطی و عاصی انسان خُدا کی طبیعت پر مطبوع نہ ہو جائے، یعنی گناہ سے قطعی علیحدہ نہ ہو جائے اُس کا خدائے پاک و قدوس کے ساتھ ملاپ ناممکن ہے۔ کیونکہ متضاد طبائع کا اجتماع محال ہے۔ مذہب کا دُوسرا کام یہی ہے کہ

لہ امراضِ گناہ سے نجات اور شفا کے لیے طبِ رُوحانی۔

وُہ اِنسان کا خُدا تعالیٰ سے میل کروائے۔ گُناہ اور اُس کے تمام بد نتائج سے رہائی۔ نیک اور پاک طبیعت کا حصُول اور خدا اور انسان کے مابین ملاپ پیدا کرے اسی کا نام نجات یا مُکتی ہے۔ لہٰذا مذہب کا کام یہی ہے کہ وُہ انسان کو گُناہ سے کامل نجات دلائے۔

عقل کا کام

بعض مذاہب محض عقل کی محدود اور کمزور بُنیاد پر قائم ہیں اور مجرد عقل کی دوڑ دھوپ کے حاصلات کو مذہب حقہ قرار دے کر خُدا کی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اور بعض جو خُدا کی ہستی اور وجود کے قائل بھی ہیں تو وُہ نیچر ہی کو خُدا سمجھے ہوئے ہیں، اور خُدا کو غیر منفطرت یا فوق الفطرت ہستی تسلیم نہیں کرتے۔ اِن دونوں سوالات کا خُلاصہ یہ ہو سکتا ہے کہ یا تو خُدا کوئی شئے نہیں اور اگر وُہ کچھ ہے تو یہ ثابت ہے کہ یا تو خُدا اسم بلا مُسمّٰی اور قوتِ واہمہ کی اختراع ہے اور یا خود خدا ہے مذہب جیسی اعلیٰ و ارفع برکت تو خدا نے اِس لئے بخش دی تھی کہ انسان اس کی پیروی میں اپنی روش کو درست کرے۔ اور اُس کے سانچے میں ڈھل کے حقیقی رُوحانی و اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن نئی زمانہ زندہ دِل لوگ اِس کو اُلٹے معنوں میں لے رہے ہیں۔ مذہب کو اپنی تقلید پر چلا رہے ہیں، یعنی اپنی عقل و دُنیوی شائستگی کے سانچے میں اُس کو ڈھال کر اُس میں جدت طرازیاں کرتے ہیں۔ اور مذہب کو سائنس کی قیود میں ڈال کر تسخیر ہمزاد کی طرح اُس پر غالب آنا چاہتے ہیں۔ ....

.... آریہ بھائی مذہب کو سائنس کے ماتحت کر کے ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھی ویدوں میں سے برآمد کر رہے ہیں حالانکہ سائنس کا تعلق تو ... مادیات و محسوسات سے ہے اور مذہب کا تعلق

غیرمادی رُوحانی حقائق سے سائنس کا نکتہ خیال اور ہے اور مذہب کا مطمح نظر اور سائنس اور اُس کے مادی مشاہدات و تجربات اور اُس کی دیگر معلومات .... اس مادی و حادث خلقت کا بیان کرتی ہے اور مذہب اِس خلقت کی مادی و غیرفانی حقیقت کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔ مذہب کا تعلق طبیعات کی زندگی سے نہیں۔ اس کے برعکس سائنس کا تعلق غیرمرئی۔ فوق الفہم اور لطیف رُوحانی حقائق سے نہیں ہے۔ دونوں کے مقاصد جُدا۔ خیالات جُدا۔ طریق کار مُختلف اور نتائج مختلف ہیں۔ جس طرح علم النفس اور علم اقلیدس دونوں کے اغراض و مقاصد اور نکتہ ہائے نگاہ میں بُعدِ المشرقین ہے۔ اسی طرح مذہب اور سائنس کے مقاصد و نکتہ ہائے نگاہ میں تفاوت ہے۔ واضح ہو کہ انسان نے گنہگار ہو کر فطرت کی طبعی مادی حقیقتوں کا علم نہیں کھویا تھا۔ اِس واسطے مذہب کا یہ کام نہیں کہ اُس کو قدرتی اشیاء کی ماہیت سے تعارف کروائے۔ بلکہ گناہ کی تاریکی نے اُس کی اصلی رُوحانی اور پاکیزہ فطرت اور خدائے تعالیٰ کی پہچان پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اِس واسطے مذہب صرف خداشناسی تک پہنچانے اور انسان کو اُس کی اصلی پاکیزہ فطرت کا تصور دِلانے کا ضامن ہے۔ اور یہی اُس کا نفس مضمون ہے۔ کشش ثقل کے قانون کی واقفیت انسان کے طبعی بگاڑ کو دُور کر کے اُسے پاک و راست نہیں بنا سکتی۔ پس سائنس کا دائرۂ عمل اِس خارجی مادی عالم کی طبعی حقیقتوں تک محدود ہے۔ اور سائنس کی حدود سے آگے مذہب کی عملداری ہے۔ وہ لامحدود۔ غیرمادی۔ غیرمرئی رُوحانی حقیقتوں کے علم و عرفان کا سرمایہ دار ہے۔ اگر مذہب کا کام صرف سائنس بیان کرنا ہوتا تو پھر مذہب کی عدم ضرورت ثابت ہے۔ کیونکہ سائنس کی تحقیقات کے نتائج مذہب

سے حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ عقل انسانی کے محدود غور و خوض کا ماحصل ہیں۔ یہ
بھاری غلطی متکلموں سے اس واسطے پڑی ہوئی ہے، کہ مجرد عقل پر بھروسہ کر کے
اصولاتِ عقلیہ اور اصولاتِ دین و مذہب قرار دے کر انسان نے مذہب کو
مجرد عقل کا مشغلہ اور دماغی ورزش کا تختۂ مشق سمجھا ہوا ہے۔ عقل کا کام
.... یہ ہے کہ کبھی شئے کا امکان یا ضرورت ثابت کرے۔ اس سے آگے انسان
کو ۔۔ دودآمیز روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل صرف یہ حکم کرتی ہے کہ یہ کارخانہ
حیات ایک نہایت اعلیٰ اور بے نظیر صنعت ہے۔ اور کوئی بڑے سے بڑا حکیم
فلاسفر یا سائنس دان نیچر کی ادنے سے ادنے شئے کا مثل بنا نہیں سکتا
اس سے آگے عقل یہ کہتی ہے کہ نیچر کی اس بے نظیر کل کے پرزوں کو حرکت دینے
والا کوئی انجینئر بھی ایسا ہی بے مثل ہونا چاہیئے۔ اور وہی انجینئر مصنوعات
فطرت کا صانع بھی ہوگا لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی صانع یا کاریگر
ہے۔ کیونکہ اگر ہے تو عقل کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ عقل ایسے نادیدہ
اور الطف وادق وجود کا کوئی ثبوت جو قابل مشاہدہ حسی ہو دے نہیں
سکتی۔ عقل کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "ہونا چاہیئے" نہ کہ "ہے"۔ مثلاً ایک خوابیدہ
شخص کے پاس سے ایک گدھا گزرتا اور غائب ہو جاتا ہے۔ اور بیدار ہونے
پر وہ اس کے آثارِ قدم دیکھتا ہے۔ تو اس کے دل میں فوراً دو خیال پیدا
ہوتے ہیں۔ کہ یا تو کوئی گدھا یہاں سے گذرا ہے، اور یا گھوڑی کا بچھیرا۔
کیونکہ ان دونوں کے پاؤں کی بناوٹ اور کمیت و کیفیت میں کچھ فرق و امتیاز
نہیں ہے۔ اگر گدھے کے نقشِ قدم کہے تو اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کیونکہ
گدھا وہاں موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی بچھیرے کے نقشِ پا کہہ سکتا ہے کیونکہ
یہ امر یقینی نہیں ہے۔ اور ہر دو کے سمّوں میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں جس سے ثابت

ہُوا کہ وُہ عقل اِس معاملہ میں محض امکان ہی ثابت کر سکتی ہے نہ کہ حقیقت جبکہ مجرّد عقل فطرت کے روزانہ صدہا واقعات کے یقینی ثبوت کے لئے کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتی، تو اُس قوّی الفطرت اور بعید از فہم و ادراک صانع حقیقی و مالک تحقیقی کو کیسے ثابت کر سکتی ہے۔ اور غیر مرئی رُوحانی حقائق کی تعیم و تفصیل میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔ اِس منزل پر پہنچ کر عقل طبعی کے پَر جلتے ہیں، اور وُہ معطّل و حیران ہو جاتی ہے۔ "کیا تو تلاش سے خُدا کو پا سکتا ہے؟ کیا تو قادرِ مطلق کا بھید کمال کے ساتھ دریافت کر سکتا ہے" (ایوب ۱۱: ۷)

"خُداوند خُدائے ابدی و تمام زمین کا خالق تھکتا نہیں اور ماندہ نہیں ہوتا۔ اُس کی حکمت ادراک سے باہر ہے" (یسعیاہ ۴۰: ۲۸)۔

عقل کا دائرہ عمل

کولہو کے بَیل کی نقل و حرکت ایک خاص دائرہ تک محدود ہوتی ہے، اور وہ اُس مخصوص محیط سے باہر نہیں جا سکتا۔ وہی اُس کا دائرۂ عمل ہوتا ہے۔ اِسی طرح عقل کا دائرہ علم و ادراک محض محسوسات و مرئیات تک ہی محدود ہے۔ اور محسوسات و مادیات کے متعلق ہی عقل کے تجربات قابلِ تعیم ہو سکتے ہیں۔ اور بدیہی حقائق کی تحقیق و تدقیق کے لئے عقل خالق نے اچھی رہنما بخش دی ہے۔ اور وُہ محض ظاہری و باطنی حواسِ عشرہ کی مدد سے خارجی عالم کی طبعی حقیقتوں کی دریافت کر سکتی ہے۔ حواسِ خمسہ ظاہری یہ ہیں: حِسّ مُشترک۔ خیال۔ وہم۔ حافظہ۔ قوتِ متصرفہ۔ جس طرح ظاہری کی تمام قوی کی قرۃ الساج قوتِ باصرہ ہے، اِسی طرح حواسِ باطنی میں قوتِ متصرفہ سب سے زیادہ کار آمد اور راسخ ہے۔ بس عقل اِن ہی حواسِ عشرہ کے کندھوں پر ہاتھ دھر کے چلنے والی ہے اور اُن کی محتاج ہے۔ جس طرح ایک جنگی سپہ سالار کی کامرانی و نصرت کا تمامتر

انحصار اچھی۔ قابل اور تربیت یافتہ پلٹن اور بہترین وسلاح محارب پر ہوتا ہے، اور بغیر ان کے وہ معطل و بیکار ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل اعضائے جسمانیہ کی سپاہ اور حواس عشرہ کے ہتھیاروں کے بغیر محض نکمی اور ناکارہ ہے مثلاً اگر آنکھ نہ ہوتی تو حروف ایجاد نہ ہوتے۔ کتابیں لکھی نہ جاتیں پریس اور مطابع کی اختراع نہ ہوتی۔ فوٹوگرافی۔ قلم سازی سنگتراشی رنگسازی۔ نقاشی و مصوری خیاطی۔ نجاری۔ ہوائی جہاز۔ ریل گاڑی۔ اور دیگر ہر قسم کی مشینری کا وجود ہوتا۔ علم النجوم۔ علم الاجسام۔ علم طب۔ علم جغرافیہ۔ علم اقلیدس اور خوردبین و دوربین وغیرہ ہرگز معرض ظہور میں نہ آتے۔ غرضیکہ انسان علم وفضل اور تہذیب وشائستگی سے قطعی بے بہرہ ہوتا۔ اور انسان وحیوان میں کوئی مابہ الامتیاز نہ رہتا۔ دیگر حواس پر آنکھ کو ہم نے اسی لئے فضیلت دی ہے کہ وہ عقل کے لئے سب سے زیادہ کارآمد آلہ ہے۔ اسی واسطے جناب خداوند مسیح نے کیا خوب فرمایا کہ "بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا۔ اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی" (متی ۶: ۲۲-۲۴ و لوقا ۱۱: ۳۴-۳۶) پس ثابت ہوا کہ تمام عقلی کارنامے محض حواس کی موجودگی کی کرشمہ ہیں۔ اور جہاں حواس کام نہ دیں وہاں عقل مجرد بیکار ثابت ہوتی ہے۔ لہذا روحانی و اخلاقی حقائق و دقائق جو کسی حس سے محسوس نہیں ہو سکتے ان کی تفہیم و تعقیل عقل مجرد سے قطعی ناممکن ہے۔ اور عقلی و علمی کمالیت سے روحانی و اخلاقی ترقی لازم نہیں آتی، جبتک اس میں کوشش نہ کی جائے۔ جو شخص کیمسٹری میں ماہر اور یگانہ عصر ہے، ضروری نہیں کہ وہ اسی علم کی روشنی میں الہیات کا بھی عالم ہو عقلی باتیں تو عقل دریافت کر سکتی ہے، لیکن فوق العقل حقائق کو

کیسے جان سکتی ہے ؟ آگ جلادیتی ہے۔ برف ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ سورج سے روشنی اور حرارت صادر ہوتی ہے۔ ہوا اور پانی کے بغیر زندگی نہیں۔ سنکھیا مہلک ہے۔ عسل شیریں ہے حنظل تلخ ہے حب الملوک دست آور شے ہے۔ دو متوازی خطوط کا اتصال محال ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو جزو ہے وہ کل میں ہے وغیرہ یہ سب بدیہی حقیقتیں ہیں۔ ان پر اور ایسے ہی اور ہزاروں امور پر تمام افرادِ عالم من حیث الاجتمع اتفاق کلی رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام حقائق تجارب مشہودہ پر مبنی اور حواس سے محسوس ہو سکتے اور بدیہی الظہور ہیں۔ لیکن طبیعیات و بدیہیات میں بھی بعض امور ایسے ہیں جن پر سب لوگ اتفاق نہیں رکھتے۔ مثلاً آریہ وغیرہ مادہ و ارواح انسانی کو قدیم مانتے ہیں۔ اور مسیحی و مسلمان اور دیگر بہت لوگ حادث مانتے ہیں۔ حالانکہ مادہ دیدنی کثیف اور تعلیات حسیا سے ہے۔ اور ہر انسان اپنی روح کا کم و بیش وجدانی احساس رکھتا ہے جب بدیہیات میں ایک عقل دوسری عقل کے مخالف ہے، اور عقلی نتائج میں بعد المشرقین ہے۔ تو عقل روحانی اور غیر مرئی و غیر محسوس حقائق لطیفہ اور امور دقیقہ کی دریافت میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے ؟ اور روحانیات و مذہبیات کے متعلق تضاد و تناقض فی العقول بدیہی ہے۔ عالم کا عدم سے بحکم الٰہی موجود ہو جانا۔ الہام معجزات گناہ اور نجات۔ حیات بعد از ممات۔ وجود ملائکہ، قیامت عدالت۔ ابدی سزا اور ابدی زندگی۔ وجود ایزد تعالیٰ وغیرہ امور سب مذہبیات و ایمانیات سے متعلق ہیں۔ اور سب فوق الفہم و العقل حقائق ہیں۔ اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ اور جبتک کوئی صداقت یا حقیقت اپنے علم کا موقع نہ دے عقل خود بخود اس کا علم حاصل نہیں کر سکتی۔ پس عقل محدود ہے اور محدودات

سے باہر اُس کی قوت پر بھروسہ رکھنا لاحاصل ہے۔

ارتقائے عقل ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس امر کو واضح کر دیا کہ عقل انسانی محدود ہے اور وہ کسی حد کے اندر اندر ہی اپنا کام کر سکتی ہے، اور اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ درختوں کے اوپر خلاء موجود ہے۔ اُن کے آسمان تک بڑھ جانے میں کوئی شے مانع نہیں۔ تمام فضاء اُن کو آسمان تک بلند ہونے کے لئے دعوت دے رہی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ وہ اپنی مقررہ حدود تک ترقی کر لینے کے بعد رُک جاتے ہیں۔ اسی طرح طبقۂ نباتات۔ حیوانات اور انسان کے قد و قامت کے اُس حد تک بڑھ جانے میں کوئی شے محدد و مُسدّ نہیں۔ جہاں تک وہ بڑھنا چاہیں بڑھیں۔ لیکن مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی شے ارتقائی لحاظ سے اپنی مقررہ حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ تو بھلا عقل انسانی اپنی حدود سے کیسے متجاوز ہو سکتی ہے اور کس طرح امور روحانیہ و حقائق لطیفہ و غیر محسوسہ کو جان سکتی ہے۔ خدا نے ہر شے کے ساتھ عقل کی بھی حد ٹھہرائی ہے۔ "اُس نے اُس کی حدوں کو مقرر کر دیا ہے جنہیں وہ پار نہیں کر سکتا" (ایوب ۱۴: ۵)۔ "تُو نے حد باندھ دی تاکہ وہ آگے نہ بڑھ سکے" (زبور ۱۰۴: ۹ و ۱۱۹: ۹۶)۔

جب واضح ہو گیا کہ خدا نے عقل کو محدود بنایا ہے، لیکن جس طرح تمام اشیا میں اُس قادر مطلق نے ارتقائی قوت فطری طور پر رکھ دی ہے جو ہر شے کو ابتدائی وسطی اور انتہائی منازل ترقی کو بتدریج طے کرتی جاتی ہے۔ اسی طرح عقل انسانی کے لئے بھی مبادان ترقی و سیع ہے۔ ایک بیج جو زمین میں بویا جاتا ہے وہ تہ خاک ہی میں پورا درخت نہیں بن جاتا۔ وہ خاک کے نیچے زیادہ سے زیادہ دو یا تین انچ لمبا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ارتقاء انتہائی کے تمام سامان

زمین کے نیچے موجود نہیں ہوتے۔ پوری ترقی پودا زمین سے باہر نکل کر ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح انڈے کے اندر جو چوزہ ہے وہ اُس خول کے اندر بقدر گنجائش ہی بڑھ سکتا ہے۔ لیکن کمالیت اُس خول سے باہر نکل کر ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اِس بیان سے پودے اور چوزے میں کمالیت کی عدم استعداد مُراد نہیں، بلکہ ازلقائی صلاحیت و استعداد تو ہوتی ہے پر زمین اور خول بعض اُن کی کمالیت کے محدود ہوتے ہیں۔ اور حصُولِ کمال کے تمام وکمال سامان وہاں نہیں ملتے۔ اسی طرح رُوحِ انسانی اِس جسمی خول کے اندر رہتے ہوئے حصُولِ کمال کی استعداد تو ذاتی طور پر رکھتی ہے پر مخصُوص حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور رُوح کی قوتِ تعقل کو ترقی کے مواقع نہیں ملتے مُقدّس پولُس رسُول نے اِس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ اب ہم کو آئینے میں دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اُس وقت رُوبرو دیکھیں گے۔ اِس وقت میرا علم ناقص ہے۔ مگر اُس وقت ایسے پورے طور پر پہچانوں گا، جیسے میں پہچانا گیا ہُوں ہُ (۱۔کرنتھی ۱۳ : ۱۲) کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوّت ناتمام۔ لیکن جب کامل آئے گا تو ناقص جاتا رہیگا۔ (۱۔کرنتھی ۱۳ : ۹ -- ۱۰) ہماری عقل اِس جسمی خول کے اندر رہ کر رُوحانی اور نادیدنی حقائق کو ایمان کی آنکھ سے دُھندلا سا دیکھتی ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب عقلِ انسانی سے حجاب اُٹھ جائے گا، اور اُس وقت وہ رُوحانی حقیقتوں کو رُوبرو دیکھے گی۔ رُوحانی ترقی اِس جسم میں شروع ہو جاتی ہے اور بتدریج اِس فانی جسم سے آزاد ہو کر وہ ترقی کمال کو پہنچے گی۔ "اور ہم اُس جلالی صُورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں" (۲۔کرنتھی ۳ : ۱۸) اور ہمارے عقلی رُوحانی قوٰی بقدرِ مُتناہ ترقی کر کے لامحدود نہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ محدود شے

ابد تک ترقی کرنے سے بھی لامحدود نہیں ہو سکتی ؂

عقل اور موالیدِ ثلٰثہ

ماہرینِ طبیعات تمام موجودات کو طبقاتِ ثلٰثہ میں منقسم کرتے ہیں یعنی جمادات نباتات اور حیوانات اور انسان کو طبقۂ حیوانات میں شامل کر کے اُسے حیوانِ ناطق کہتے ہیں۔ اِن ہر سہ طبقات میں خاصیات و صفات کے لحاظ سے خاص امتیازات نظر آتے ہیں، جو ایک طبقہ کو دوسرے سے اشرف یا ادنیٰ ٹھہراتے ہیں مثلاً جمادات میں قوتِ نامیہ مفقود ہے اور نباتات جسمِ نامی ہے یعنی اُس میں نمو کی قوت موجود ہے۔ ازیں وجہ وہ جمادات سے اعلیٰ ہے۔ پھر نباتات میں حس۔ ارادہ اور حرکت معدوم ہے۔ لیکن حیوانات میں قوتِ نامیہ کے علاوہ حس۔ حرکت۔ ارادہ اور جان موجود ہے۔ حیوانات حساس متحرک بالارادہ اور ذی جان ہیں۔ اور انسان و حیوان میں وجہِ امتیاز نفسِ ناطقہ ہے یعنی انسان ذی جان ہونے کے علاوہ ذی نفس بھی ہے۔ اور اُس میں ادنیٰ طبقاتِ ثلٰثہ کی حیثیتیں اُس کے اعلیٰ و افضل مدارج میں پائی جاتی ہیں۔

وہ پتھر لکڑی اور ہتھیار کے نقصان سے بھی واقف ہیں۔ پھر طبقۂ حیوانات کو انسان کی نسبت بہت ہی تھوڑا علم ہے۔ گائے۔ بھینس۔ بیل۔ گھوڑا۔ اونٹ۔ بھیڑ۔ بکری۔ گدھا۔ کتا۔ طوطا۔ مرغی وغیرہ اپنے مالک کو خوب پہچانتے ہیں، اور غیر آدمی کو غیر سمجھتے ہیں۔ انسان کے غصہ اور رنجی و ہمدردی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بدیہی بات ہے کہ وہ انسان کی حقیقت کو ایسا نہیں جان سکتے جیسا انسان اُن کو جان سکتا ہے۔ انسان جمادات کو جانتا ہے۔ پتھر۔ کوئلے۔ سونا۔ چاندی اور دیگر دھاتوں کے خواص و فوائد سے بخوبی واقف

ہے۔ علم طب میں ہر نوع کی جڑی بوٹیوں اور پھولوں پھلوں کی تشریحات موجود ہیں۔ ان کے فوائد اور نقصانات سے کامل واقفیت رکھتا ہے حیوانات کا پورا علم رکھتا ہے۔ علم الاجسام۔ علم خواص الاشیاء۔ علم الانوار۔ علم النفس طب اور صدہا علوم و فنون جو انسانی تحقیقات کا ماحصل ہیں، اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ کہ انسان ہر سہ ادنیٰ طبقات کا علم کامل اور یقینی رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے اعلیٰ طبقات کو انسان کا کچھ علم نہیں ہے۔ پھر طبقۂ انسانی میں بھی عقلاء و جہلاء کی تفریق ہے۔ جو کچھ حکماء و عقلاء طبقۂ جہلاء کے متعلق علم رکھتے ہیں وہ جہلاء اُن کے متعلق نہیں رکھتے۔ بچے والدین کی نسبت اُس قدر علم نہیں رکھتے جس قدر والدین بچوں کی نسبت۔ اسی طرح انسان ضعیفُ البیان اور ناقصُ العقل و محدودُ العلم کی ہستی جس قدر مذکورہ بالا تین طبقوں سے اعلیٰ ہے، اُسی قدر بلکہ اُس سے بھی لاکھ درجہ خُدائے تعالیٰ بے حد و بے عد کے بالمقابل ادنےٰ ہے۔ تو بھلا انسانی عقل کی کیا مجال ہے کہ وہ طبقۂ الٰہی اور حقائق روحانی و دقائق ذوقی الفہم کو حیطۂ ادراک میں لا سکے۔ عقل انسانی محض من حیثُ الاتناہی طبقۂ الٰہی اور وجود لامتناہی کا کچھ تصور کر سکتی ہے

جس طرح حیوانات کا علم انسان کے متعلق بہت ہی معمولی اور ناقص ہے، اُسی قدر بلکہ اُس سے بھی بدرجہا کم انسان اپنی عقلِ متناہیہ و فہم محدودہ سے حقائق قدسیۂ الٰہیہ کی تفہیم کر سکتا ہے۔ اور بطور استدلال اِنّی معلول سے علت اور مصنوع سے صانع کا تصور کر سکتا ہے۔ "کیونکہ جو کچھ خدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔ (اور وہ بھی) اس لئے کہ خدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ کیونکہ اُس کی اَن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دُنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے

ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عُذر نہ باقی نہیں"۔ (رومی ۱: ۱۹-۲۰) مشاہدۂ فطرت سے خُدا کا صرف مثالی علم ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی حقیقت کا یقینی علم محال ہے۔ اگر کائنات کے صرف مُشاہدہ ہی سے خالق کا یقینی اور صحیح علم حاصل ہونا ممکن ہوتا، تو دُنیا میں اُس کی ہستی اور ماہیت کے متعلق خیالات و آراء میں مُنافقت و مخالفت نہ ہوتی۔ پس اِنسان محجُوبُ الفہم من حیثُ العقل حقائق الٰہی اور وجود لامتناہی کے صحیح تصوّر میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔" واہ! خُدا کی دولت اور حکمت اور علم کیا ہی عمیق ہے۔ اُس کے فیصلے کِس قدر ادراک سے پرے اور اُس کی راہیں کیا ہی بے نِشان ہیں۔ خُداوند کی عقل کو کِس نے جانا۔ یا کون اُس کا صلاح کار ہُوا؟" (رومی ۱۱: ۳۳-۳۴)

عقل کی عدمِ صحت

واضح ہو کہ عقلِ طبعی کی کارگزاری کے نتائج عالم میں مختلف ہیں جس سے عقل ناقابلِ اعتبار ٹھہرتی ہے۔ اسی عقل نے ہزاروں لوگوں کی رہنمائی کی اور وہ خُدا کی ہستی سے مُنکر ہو گئے اور عقل گُمراہ الحاد کی شوریدہ بانی ٹھہری۔ اسی عقل کی رہنمائی میں

لاکھوں اِنسان بُتوں کو خُدا سمجھنے لگے۔ اِسی عقل کی روشنی میں بیشمار لوگ بُت پرستی پر آمادہ ہو گئے۔ اِسی عقل نے لاکھوں اِنسانوں کو گمراہ کر دیا۔ اور وُہ گور پرستی۔ پیر پرستی۔ لِنگ پرستی۔ مردُم پرستی۔ عناصر پرستی۔ فطرت پرستی اور تناسخ جیسے غیر معقول و مجہول عقائد پر ضمیر فروشی کرنے لگے۔ اِسی عقل نے ہدایت کی اور آریہ لوگ مادہ و ارواح کو قدیم ماننے لگے۔ اِسی عقل کے اِشاروں پر مسیحی و محمدی مادہ و ارواح کی ازلیت و قدامت کی تردید و تکذیب پر جُھکے۔ غرضیکہ آج تک تفاوت فی العقول بدیہی طور پر ظاہر و باہر ہے۔ آخر یہ تمام عقائد یا عقل کے تمام نتائج تو صحیح نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ پانچ اور پانچ نو ہوتے ہیں۔ دُوسرا کہتا ہے گیارہ۔ تیسرا کہتا ہے سات اور چوتھا کہتا ہے دَس۔ آخر ان چاروں کے جواب تو صحیح نہ ہوں گے۔ ایک ہی جواب درست ہو سکتا ہے۔ جب خُدا واحد و برحق ہے، اور تمام عقلیں بھی صحیح ہیں، تو مختلف عقائد اور متضاد خیالات کے وجُود کے کیا معنی؟ ایک ہی خُدا اِتنے متضاد و متناقض عقائد کا بانی نہیں ہو سکتا۔ پس انسانی عقلوں میں اِختلاف و تناقض کی وجہ اُن کی عدم صحت ہے اور عدم صحت کا مُوجب گُناہ۔ اِس لئے موضُوعاتِ عقلیہ کو کوئی حقیقی و الٰہی مذہب قرار دینا سراسر جہالت اور کج فہمی ہے۔ عقل کے تمام پُرزوں پر گُناہ کا زنگ لگ گیا ہے۔ اِس لئے اُس کی رفتار میں فرق ہے۔ "اور اُن آدمیوں میں ردّ و بدل پیدا ہوتا ہے جن کی عقل بگڑ گئی ہے۔ اور وُہ حق سے محرُوم ہیں۔" (۱ تمتھیُس ۶: ۵) "کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہو گئی ہے۔" (افسی ۴: ۱۸) "یہ ایسے آدمی ہیں جن کی عقل بگڑی ہوئی ہے، اور وُہ ایمان کے اعتبار سے نامقبُول ہیں۔" (۲۔ تمتھیُس ۳: ۸) "جن کی عقلوں کو اِس جہان کے خُدا (یعنی ابلیس) نے اندھا کر دیا ہے۔"

(۲ کرنتھی ۴: ۴)

میرا مطلب عقل کی عدم صحت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گناہ کے باعث عقل کی قوتیں زائل ہوگئی ہیں یا معدوم و ناپید نہیں ہوگئیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصلی حالت پر نہ رہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے میز پر دس گھڑیاں رکھی جائیں جو بخوبی چل رہی ہیں۔ بظاہر صاف اور صحیح معلوم ہوتی ہیں لیکن جب اُن میں وقت دیکھا جاتا ہے تو سب میں دس دس۔ پندرہ پندرہ اور بیس بیس منٹ کا فرق ہے، تو آخر کس بنا پر اُن کی رفتار پر صحت کا حکم لگایا جائے ؟ گھڑیاں ثابت ہیں، پرزے قائم ہیں۔ گھنٹے۔ منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں حرکت کر رہی ہیں۔ مگر سب کے اوقات میں مطابقت و یکسانیت نہیں۔ اِسی سے اُن کی عدم صحت ثابت ہوگی۔ یہی حالت جمیع عقولِ انسانی کی ہے۔ اِس واسطے مجرد عقل کے نتائج و حاصلات کو کسی مذہب کا صحیح قرار دینا ضلالت و گمراہی کو خوش آمدید کہنا ہے۔ عقل کی مذکورہ بالا حالت پر غور کرتے ہوئے ہمیں عقلی و نقلی طور پر عقل کی دو حالتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی :۔

اوّل ۔ پہلی حالت عقل کی وہ تھی جبکہ وہ کمالیت۔ صحت اور پاکیزگی کی حالت میں خالق کے ہاتھ سے نکلی۔ اِس کے متعلق کلامُ اللہ کی شہادت یہ ہے "اور خُدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا" (پیدائش ۱ : ۲۷) یہاں "خُدا کی صورت" سے وجہ اللہ مُراد نہیں ہے، بلکہ اِس صورت سے مُراد رُوحانی صورت ہے۔ اکثر خبیث الطبع لوگ نادانی سے یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ چونکہ انسان خُدا کی صورت پر بنایا گیا ہے، اور وہ جسم و اعضاء رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کی طرح خُدا بھی جسم و اعضاء رکھتا ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اُن کے اِس نامعقول معارضہ کا مدلّل جواب لکھا جائے۔ اور گمراہوں کو راہ دکھائی جائے۔ جو لوگ علم تشبیہ و اِستعارہ سے واقف ہیں وہ ایسا بیہودہ اعتراض نہیں کر

سکتے۔ واضح ہو کہ ہر جگہ لفظی معنی لینا جائز نہیں۔ اور بالخصوص صحفِ مطہرہ
کی عبارات کے سمجھنے میں زیادہ احتیاط برتنا چاہیئے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ "یہ
نسخہ ہتیلی پر سرسوں جمانے والا ہے" تو اس سے لفظی معنی مراد نہ ہوں گے بلکہ
محض دوا کی زود اثری مراد ہوگی۔ اور داؤد نبی خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ "مجھے
اپنے پروں کے سایہ میں چھپا لے" (زبور ۱۷: ۸) تو کیا اس سے خدا کو
پرندہ سمجھا جائے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ "اے خدا! مجھے اپنی پناہ و
حفاظت میں رکھ"۔ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اس آیت میں
انسان مشبہ حسی ہے۔ خدا مشبہ بہ عقلی اور وجہ شبہ مرکب عقلی ہے۔ جب مشبہ
حسی اور مشبہ بہ عقلی ہو تو خدا کی صورت سے وجہ اللہ مراد لینا نادانی ہے۔ اگر
مشبہ و مشبہ بہ دونوں حسی ہوں تو یہ سوال جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن آیت زیر بحث
میں تشبیہ تمثیل ہے۔ اور تشبیہ تمثیل میں وجہ شبہ مرکب حسی نہیں ہوا کرتی بلکہ
مرکب عقلی ہوتی ہے اور خدا کے ساتھ انسان کا یہ اشتراک حقیقی نہیں ہے۔
بین مطابقی نہیں۔ اور خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خدا پاک و فاعل مختار
ذی عقل اور صاحبِ ارادہ ہے۔ اُسی طرح اُس نے انسان کو بھی ان صفات
سے متصف فرمایا۔ خدا کی صورت کے معنی ملاحظہ ہوں۔ (افسی ۴: ۲۴ و کلسی ۳: ۱۰)
عقلی طور پر یہ حقیقت اس لحاظ سے درست ہے کہ اگر خدا نے انسان کو پاک اور
کامل نہیں بنایا تھا تو اُس کا گناہ میں گرنا خدا سے انحراف و بغاوت نہیں ہے نہ
ہی الٰہی سزا بجا ہے۔ اور خدا اُس سے نیکی پاکیزگی اور اپنی متابعت کا مطالبہ
نہیں کر سکتا۔ دوم۔ خدائے پاک و قدوس سے ناپاک طبیعت کے صدور کا
امکان محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خدا نے انسان کو پاک و راست بنایا تھا۔
یہ انسانی روح اور عقل کی حالت اوّلہ تھی۔ (واعظ ۷: ۲۹)۔

دوم۔ اور عقل کی حالتِ ثانیہ وجود متنزل اور بگڑی ہوئی حالت ہے۔ "انسان کی عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہیں" (طیطس ۱: ۱۵ و ۲ تمتھیس ۳: ۸) عقل کے اسی انحطاط و تنزل کے باعث پولوس رسول فرماتا ہے "مگر نفسانی آدمی خدا کے رُوح کی باتیں قبول نہیں کرتا کیونکہ وہ اُسکے نزدیک بیوقوفی کی باتیں ہیں اور نہ وہ اُنہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ رُوحانی طور پر پرکھی جاتی ہیں" (۱۔ کرنتھی ۲: ۱۴) خداوند یسوع مسیح نے جو مُسرف بیٹے کی تمثیل (لوقا ۱۵: ۱۱-۳۲) میں فرمائی ہے۔ وہ انسان کی اسی دو قسم کی حالت کا مکمل نمونہ ہے۔ مُسرف بیٹے کی پہلی حالت جبکہ وہ باپ سے رخصت ہوا بہت دولتمندی اور خوشحالی و خوشی کی تھی۔ اور دوسری حالت انتہائی تنگدستی۔ ناداری اور کس مپرسی کی تھی۔ چنانچہ رُوح و عقل انسانی کی موجودہ حالت مُسرف بیٹے کی حالتِ ثانیہ کے مطابق ہے۔ اب خدا جو رحیم و کریم اور سرچشمہ محبت ہے۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ انسان کو ابد تک اِس عقلی و رُوحانی گمراہی میں رہنے دے۔ اور ہم یہ بھی خوب جان گئے کہ محض عقل سے اور وہ بھی مریض و متنزل عقل سے خدائے قادر مطلق کو جان نہیں سکتے۔ کیونکہ عقل کے بازو ہم نے صدیوں آزما دیکھے۔ اب عقلی مذاہب کے دعوے دار اور عقل کے شیدائی جو اُس کو اُس کے اصلی مرتبہ سے بہت زیادہ بلند کر کے دکھاتے ہیں خوب غور کریں کہ عقل طبعی کس قدر قابلیت کی سرمایہ دار ہے۔ اور اُس کو اُس کے جائز درجہ سے بڑھ کر سمجھنا کس قدر کور اعتقادی، خوش فہمی اور حقیقت سے ناقدردانی ہے۔ اب آخری ممکن اور صحیح صورت یہی ہو سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ خود اپنا علم و عرفان انسان کو عطا فرمائے اور کسی طرح سے اپنی ذات و صفات اور مرضی کو اُس پر ظاہر کرے تاکہ انسان عقل کے پیچھے لگ کر گمراہی سے تباہی کی طرف نہ بڑھتا چلا جائے۔ اگلے باب میں ہم خدا کے اُسی ذریعہ و وسیلہ کا بیان کریں گے جس کی وساطت سے ہم

خداشناسی تک پہنچ سکتے ہیں"

اِلہام کی ضرورت

جب رُوحِ انسانی پر انحطاط و تنزّل نے قبضہ جمالیا، اور اُس کا وُہ نُورِ بصیرت جو خُدا نے اُسے بخش دیا تھا گُناہ کی تاریکیوں میں بالکل مدھم پڑ گیا، اور چشمِ بصیرت پہ معصیت کا پردہ سا چھا گیا۔ تو اُس نے گُناہ کی تیرگی میں اندھا دُھند اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ اور اِس ظلمت میں جو بھی پگڈنڈی اُسے سوجھی بس اُسی کو تھام لیا جیسے ڈُوبتے کو تنکے کا سہارا مگر راہِ حق کے حصُول میں ناکام رہی۔ عقل کی اِس لاچاری اور بے بسی کی حالت میں خالق نے الہام کی مشعل سے صراطِ مستقیم کی طرف اُس کی رہنمائی و ہدایت فرمائی۔ جس مُدعا و مقصد کے حصُول میں عقلِ انسانی ناکام رہی، وُہ خُدا نے الہام کی وساطت سے عطا فرمایا۔ گویا اُس فوق الفہم و ادراک ہستی نے انسان سُوء الفہم و فاسدُ العقل اور محدُودُ العلم پر خود اپنی ذات و صفات اور مرضی کا انکشاف فرمایا۔ کیونکہ اور کوئی صُورت ممکن ہی نہ تھی ۔

جوڑا اور ترقّی یہ بڑی حقیقت ہے کہ فطرت کی کوئی شے بغیر جوڑے کے کبھی ترقّی نہیں کر سکتی۔ ہر شے جوڑے کے ساتھ مل کر بڑھ سکتی ہے۔ ورنہ مجرُوح ہی رہتی ہے۔ نباتات حیوانات اور انسان میں جوڑے کا وجُود ترقّی کی شرط ہے۔ چنانچہ موجُودات کی ہر ہر جنس میں مذکّر و مؤنث اور نر و مادّہ کا وجُود اِس صداقت پر دال ہے۔ آنکھوں کا جوڑا آفتاب ہے اگر آفتاب نہ ہو تو ہم کچھ بھی دیکھ نہ سکیں۔ کان کا جوڑا ہوا ہے۔ اگر ہوا نہ ہو تو ہم کوئی آواز بھی سُن نہ سکیں۔ بیج کا جوڑا زمین ہے۔ اگر ایک بیج کو دس سال تک

کسی ڈبیّ میں بند کر رکھیں تو وُہ کبھی ترقّی نہیں کر سکتا۔ لیکن زمین میں بونے سے تیسرے دن اُگ آتا اور بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔ اور ایک دانے کے درجنوں دانے ہو جاتے ہیں۔ برقی تار کے دو سِرے ہوتے ہیں۔ ایک مُثبت اور دُوسرا منفی۔ اگر اِن دونوں کو باہم ملایا نہ جائے تو بجلی پیدا نہیں ہو سکتی لیکن ملانے سے فوراً بجلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح عقل مجرّد کو لُہو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اور اپنی مخصوص حدُود سے باہر نہیں جا سکتی۔ پس عقل کا جوڑا اِلہام ہے۔ جب دونوں کا ملاپ ہو جائے تو تیسری شے پیدا ہوتی ہے۔ اور وُہ خُدا کی معرفت اور حقیقت کا علم ہے۔ موٹر صرف سمُندر کے کنارے تک ہی پہنچا سکتی ہے۔ پار نہیں لے جا سکتی۔ اور ممکن ہے کہ موٹر ڈرائیور یہ سمجھے کہ سمُندر سے پرے اور کوئی عالم نہیں۔ بس پانی ہی پانی ہے۔ اور اسی طرح دہریوں کی عقل بھی نیچر کے حالات موجُودہ اور تجارب مشہُودہ کی بنا پر کہہ دے کہ اس عالم ناسُوت سے پرے اور کوئی رُوحانی عالم نہیں اور خُدا بھی کوئی غیر از نیچر شے نہیں۔ بلکہ جو کچھ نظر آتا ہے وُہی ہے۔ لیکن سمُندر کے پار جہاز لے جاتا ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ سمُندر کے پار اور بھی دُنیا بستی ہے۔ اور اُس کی یہ کیفیّت ہے۔ جس طرح موٹر اور جہاز دونوں کے ذریعے سمُندر پار کی دُنیا کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اُسی طرح عقل و الہام کے ذریعے عالم ناسُوت سے عالم لاہُوت تک پہنچنا اور اس سے کم و بیش واقفیت حاصل کرنا ممکن ہے اگر انسان میں عقل نہ ہوتی تو الہام بے معنی ہوتا۔ اور اگر الہام نہ ہوتا تو عقل رُوحانی اور الٰہی حقائق کے علم سے قاصر رہتی۔ بہرحال دونوں کا وجُود ترقّی کے لیے ضروری ہے۔ جب انسان اپنی کمزور عقل اور محدُود حواس سے خُدائے حیّ کی ہستی کے متعلّق صحیح علم حاصل کرنے میں قاصر اور مجبُور ثابت ہُوا تو ایزد تعالیٰ

لیے اپنی ہستی اور عالم لاہوت کی کیفیت کو اپنی رُوح کے وسیلے بوساطت انبیاؤ
مُرسلین کے خود اُس پر آشکارا فرمایا۔ "جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں۔ نہ کانوں
نے سُنیں۔ نہ آدمی کے دل میں آئیں وُہ سب خُدا نے اپنے محبت رکھنے والوں
کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن ہم پر خُدا نے اُن کو رُوح کے وسیلے ظاہر کیا کیونکہ
رُوح (رُوحِ الٰہی) ساری باتیں بلکہ خُدا کی تہ کی باتیں بھی دریافت کر لیتا ہے۔
...... اِسی طرح خُدا کے رُوح کے سوا خُدا کی باتیں کوئی نہیں جانتا"

(۱۔ کرنتھیوں ۲: ۹-۱۱)

"رُوح خود ہماری رُوح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے" (رومیوں ۸: ۱۶) انسانی
عقل گویا منفی اور الہام الٰہی (۲ تمتھیس ۳: ۱۶-۱۷) مُثبت ہے۔ جب اِن دونوں
کا مِلاپ ہُوا تو عقلِ انسانی میں نُور آیا۔ اور اِلہام الٰہی وُہ سلسلۂ حقائق و دقائق
لطیفہ رُوحانیہ اور نکات و معارف قدسیہ الٰہیہ ہے جس کے ذریعے خُدا تعالےٰ
تدریجی طور پر حِصّہ بحِصّہ اور طرح بطرح بنی نوع اِنسان پر اپنی مرضی و منشا کا
اظہار و انکشاف بذریعہ انبیاء مُلہمین کے فرماتا ہے۔ اور خُدا کی رُوح منزل علیہ
کے ذہن و عقل کو مکاشفہ دینے سے پہلے اِس قابل بنا لیتی ہے۔ کہ وُہ پیغام الٰہی
کو قبول کر کے اُس کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھے۔ "کیونکہ نبوّت کی کوئی
بات آدمی کی خواہش سے کبھی نہیں ہُوئی۔ بلکہ آدمی رُوح القُدس کی تحریک
کے سبب خُدا کی طرف سے بولتے تھے" (۲ پطرس ۱: ۲۱) اور عقلِ انسانی الہام
الٰہی کے وصال سے لا اِنتہا نُورانیت کے عالم میں پہنچ جاتی ہے اور معرفت
الٰہی کے اسرار سربستہ و رموزِ مخفیہ کو سمجھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

عقل اِلہام کی متقاضی ہے

جس طرح امراض جسمانی و عوارض جسمانی اِس دُنیا میں پائے جاتے

ہیں۔ اور ہر شخص اُن کے متعلق ذاتی تجربہ رکھتا ہے، اِسی طرح عوارضِ رُوحانیہ بھی ہر شخص میں حقیقتاً اور بدیہی طور پر ظاہر ہیں۔ رُوح و جسم کے اجتماع کا نام انسان ہے۔ رُوح لطیف اور اشرف وجود ہے۔ اور جسم کثیف و ادنیٰ شے ہے۔ ہم بارہا ذکر کر چکے ہیں کہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ چنانچہ رُوح کے بگاڑ سے جسم کا بگاڑ لازم آیا۔ جب رُوح پہ مرضِ گناہ نے ڈیرے ڈال لئے تو جسم پہ بھی اُس کے آثار ظاہر ہُوئے۔ اور جسم بھی طرح طرح کے امراض میں پھنس کر قبضۂ موت میں آگیا۔ اب یہ ہر دانشمند پر ظاہر ہے کہ امراضِ جسمانی کی مدافعت و ازالہ کے لئے خُدائے حکیم و قدیر نے بیشمار ادویہ۔ جڑی بُوٹیاں وغیرہ پیدا کر دی ہیں۔ اور ماہرینِ طب اور حُکماء و اطباؔ نے اُن کے خواص و فوائد کی مفصّل تشریحات کتبِ طب میں فرما دی ہیں۔ یہ خُدا تعالیٰ کا وُہ بے نظیر انتظام ہے جس سے جسم کے تمام امراض کی مدافعت اور جسمانی زندگی کے استحفاظ و اصلاح کے بارے میں اُس کی قدرت و حکمت ظاہر ہے۔ جس حال کہ اِنسان کی جسمانی زندگی کی صحت و قیام کے باب میں اُس نے اِس قدر سخاوت کے دریا بہا دئے ہیں، تو بڑے افسوس اور حیرت کا مقام ہو اگر وُہ اِنسان کی رُوحانی زندگی کی بہتری۔ اِصلاح اور حفاظت کے باب میں بُخل و اغماض سے کام لے۔ بلکہ جس طرح رُوح بہ نسبت جسم کے اعلیٰ اور انمول شے ہے اُسی طرح اُس کی صحت و بقا کے لئے فطرۃً ہیں جسمانی اسباب کی بہ نسبت اعلیٰ رُوحانی اسباب و وسائل کا پیدا کرنا اور اعلیٰ قوانین کا نفاذ زیادہ ضروری و لازمی ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ خُداوند کریم نے ایسا ہی کیا اور رُوحانی امراض کی تشخیص و مدافعت کے لئے رُوحانی حکمت کی کتاب بھی نازل فرمائی۔ اور وہ کتاب بائبل مقدّس ہے۔" ہر ایک صحیفہ جو خُدا کے الہام سے ہے تعلیم اور

الزام اور اصلاح اور راستبازی میں تربیت کرنے کے لئے فائدہ مند بھی ہے۔ تاکہ مردِ خدا کامل بنے۔ اور ہر ایک نیک کام کے لئے بالکل تیار ہو جائے۔" (۲ تمتھیس ۳: ۱۶-۱۷)۔ "کیونکہ جتنی باتیں پہلے لکھی گئیں وہ ہماری تعلیم کے لئے لکھی گئیں۔ تاکہ صبر سے اور کتاب مقدس کی تسلی سے اُمید رکھیں۔"

(رومی ۱۵: ۴)۔

پس عقل کے اس واجبی تقاضا کو الہام ہی پورا کر سکتا ہے۔ اگر وہ روحانی طب کی کتاب (الہام) اور روحانی اصلاح کے اسباب خداوند کریم اس دنیا میں ہمیں نہ بخشتا اور صرف جسمانی اسباب ہی رکھ دینے پر اکتفا کرتا تو اُس کی قدرت و حکمت پر دھبہ آتا تھا۔ لیکن اُس نے دونو قسم کے انتظام کر کے ہمارے لئے عذر کی کوئی وجہ نہیں چھوڑی۔

الہام اور باطنی شریعت

انسان فطرتاً عقلی اور اخلاقی وجود ہے اور خدا نے اُسے اپنی صورت پر پاک و راست۔ صاحب ارادہ۔ اور فاعل مختار بنایا۔ اور اپنی مرضی کا اظہار اُس پر فرمایا یعنی اخلاقی شریعت اُس کو بخشی۔ وہ شریعت کسی ظاہری (تحریری) صورت میں نہ تھی، بلکہ انسان کی عقل و ضمیر پر مرتسم کی گئی تھی۔ جب انسان نے وہ باطنی اخلاقی شریعت کھو دی، اور گناہ کی تاریکی میں وہ انمول و بیش بہا شے گم ہو گئی، اور انسان کے دل سے خدا کی وہ صورت جس کی مانند وہ بنایا گیا تھا محو ہو گئی تو اس کے لئے یہ مشکل پیش آئی کہ وہ کس طرح اُس گمشدہ الٰہی پاکیزہ صورت کی مانند خود کو پھر سے بنائے۔ کیونکہ جب اصل شے گم ہو جائے تو نقل کو اُس کے مطابق بنانا محال ہے۔ جب نمونہ نادیدہ ہو تو دیدنی صورت کو اُس کے مشابہ کرنا مشکل ہے۔ اب الہام الٰہی باطنی شریعت کی وہ ظاہری

صورت ہے جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان مکدر الصورت اور فاسد الطبع ہو کر
سے اصلی پاکیزہ حالت پر آسکتا ہے۔ شریعتِ الہامی (ظاہری) شریعت باطنی سے
غیر نہیں۔ بلکہ اُسی کا اعادہ ہے۔ الہام کی ضرورت یہی ہے کہ وُہ انسان کو اُس
کی اصلی سرشت کی طرف دوبارہ رجوع کرائے۔ اگر ابوالبشر آدم باطنی شریعت
کو کھو نہ دیتا تو کبھی انسان کو ظاہری الہامی شریعت دیئے جانے کی ضرورت نہ
ہوتی۔ انسان کی اُس شوکتِ گذشتہ اور جلالتِ رفتہ کے آثار کچھ نہ کچھ اب
تک موجود ہیں۔ اور ہونا بھی یُوں ہی چاہیئے۔ بقول شخصے ؎

"از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ   ہر آثار پدید است صنادیدِ عجم را"

عجائبِ خلیفۂ خُدا (انسان) کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور شرعِ باطنی کا ثبوت
تمام اقوامِ عالم میں نیکی و بدی کا وُہ احساس و امتیاز ہے جو وُہ خُدا کی ہستی
اور الہام کے منکر ہونے کے باوجود فطرتی طور پر رکھتے ہیں۔ "جو کچھ خُدا
کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وُہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے" (رومی ۱: ۱۹)۔
وُہ نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی کہتے ہیں۔ اگرچہ نیک و بد اعمال کے تعیّن کے
متعلق سب کے خیالات میں اتفاق کُلی نہیں تاہم نیکی کا خیال اور علم و عمل
اور بدی سے نفرت ہر جگہ ہر قوم میں ظاہر ہے۔ اور باطنی شریعت کا بقیہ
ہر منکر و مُلحد کے باطن میں موجود ہے۔ "اس لئے کہ جب وُہ قومیں جو شریعت
نہیں رکھتیں اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں۔ تو باوجود شریعت
(یعنی الہامی شریعت) نہ رکھنے کے وُہ اپنے لئے خُود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ
وُہ شریعت کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہُوئی دکھاتی ہیں اور اُن کا دل بھی
ان باتوں کی گواہی دیتا ہے۔ اور اُن کے باہمی خیالات یا تو اُن پر الزام لگاتے
ہیں اور یا اُن کو معذور رکھتے ہیں" (رومی ۲: ۱۴-۱۵) پس ثابت ہُوا کہ الہامی

شرعِ انسان کی ابتدائی شرع باطنی کا اعادہ ہے۔ اُس سے علیحدہ نہیں بلکہ اُسی کے مطابق ہے۔ اور الہام کی ضرورت ہی اِس لئے ہوئی کہ شرعِ باطنی کو انسان نے گناہ کی تاریکی میں کھو دیا تھا۔ گو اُس کا کچھ بقیہ ہر ایک کے دل میں موجود ہے پر وُہ انسان کی کامل رہنمائی میں قاصر ہے۔ کیونکہ امتدادِ زمانہ اور ظاہری و باطنی انقلابات نے اُس میں بہت سی تبدیلی کر دی ہے۔ اب الہام خُدا کی طبیعت۔ مرضی اور رحمت و محبت کا ظہور ہے۔ جس کے سامنے ہی وُصل کر انسان محجوب الطبع و مکدّر الفطرۃ پھر ابتدائی پاکیزہ و مُبارک حالت پر بحال ہو سکتا اور اپنی بگڑی ہُوئی رُوحانی صُورت کو آئینۂ الہام میں سنوار کر دوبارہ خُدا کی صُورت پر بن سکتا ہے۔ گُناہ کی تاریکی میں انسان خُدا سے بچھڑ گیا اور اپنے محبوبِ حقیقی کی فُرقت سے بے قرار ہو کر اُس کی جستجو و تلاش میں مارا مارا پھرا کیا لیکن اُس کے دیدارِ فیض آثار سے لُطف اندوز نہ ہو سکا۔ دل میں آرزوئے دید کروٹیں لے رہی تھی۔ مگر اِس حرماں نصیب کو اپنے پردہ نشین۔ نادیدہ اور لامکین محبُوب کی آستاں بوسی کا فخر کبھی حاصل نہ ہُوا۔ آخر خُدا نے خطُوط و مراسلات (صحائفِ مُطہرہ) کے ذریعے خُود کو اُس پر آشکارا فرمایا اور اُس کی خواہشات کا جواب دیا۔ پس الہامی صحائف گویا خُدا کے مکتوب ہیں۔

شخصی مذہب

ہم گذشتہ صفحات میں دلیل و براہین سے بہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچا چکے ہیں کہ انسانی عقل محدود۔ ضعیف اور بگڑی ہُوئی ہونے کے باعث معرفتِ حقانیہ اور حقائقِ رُوحانیہ کے افہام و تفہیم میں قاصر ہے۔ اور یہ بھی دکھا چکے کہ الہام ہی ایک ایسا ممکن اور معقول ذریعہ ہو سکتا ہے جو عقلِ انسانی پر غیر مرئی اور فوق الفطرت رُوحانی حقیقتوں کو منکشف کر سکتا ہے۔ چنانچہ الہامِ الہٰی پہلے شخصی طور پر خاص اشخاص پر

نازل ہوا۔ ازمنہ سابقہ میں جبکہ مذہب الٰہی انفرادی صورت میں تھا خداوند تعالےٰ نے خاص خاص اشخاص کے ساتھ کلام کیا۔ اور اپنی مرضی و منشاء کو اُن پر شخصی طور سے ظاہر فرمایا۔ چونکہ تمام دُنیا اُس وقت گناہ کی غلامی اور تاریکی میں مُبتلا تھی، اِس لئے خدا نے اُس میں سے خاص اشخاص کا انتخاب کرکے صراطِ مستقیم پر قائم کیا۔ مثلاً اُس نے ابراہام کو بُت پرستوں میں سے چُن لیا، اور اُس سے یُوں مخاطب ہُوا (الہام دیا) "تو اپنے وطن اور اپنے ناطے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نِکل کر اُس مُلک میں جا جو مَیں تجھے دِکھاؤں گا۔ اور مَیں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دُونگا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تُو باعث برکت ہو۔ جو تجھے مُبارک کہیں اُن کو مَیں برکت دُونگا۔ اور جو تجھ پر لعنت کرے اُس پر مَیں لعنت کروں گا۔ اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے"
(پیدائش ۱۲: ۱-۳) اور ابراہام نے اُسی جگہ پر جہاں خدا اُسے کسی دیدنی صورت میں نظر آیا تھا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں خدا کی عبادت کی۔
(۱۲: ۷-۸) پھر یعقوب کے ساتھ خدا ہمکلام (الہام) ہُوا۔ ملاحظہ ہو۔
(پیدائش ۲۸: ۱۳-۱۵) اور اُس نے بھی اُسی جگہ جہاں خُدا اُس سے ہمکلام ہُوا ایک پتھر کا مذبح بنا کر اُس کا نام بیت ایل (خدا کا گھر) رکھا اور خدا کی عبادت کی۔ (۲۸: ۱۸-۱۹) پھر کوہ حورب کے نزدیک خدا موسٰی پر ایک جھاڑی میں لگی ہُوئی آگ کی صورت میں ظاہر ہُوا، اور اُس سے کلام کیا۔ اور اُس کے آباؤ اجداد کے ساتھ کئے ہُوئے وعدوں کو دوہرایا۔ اور موسٰی نے الٰہی حضوری کو محسُوس کرکے ازراہِ تعظیم اپنے پاؤں سے جُوتی اُتاری اور مُنہ چھپایا۔ پیدائش ۳ باب۔

قومی مذہب

پہلے الہام الٰہی شخصی تھا اور مذہب الٰہی بھی شخصی۔ اِس لیئے خُدا خاص اور چیدہ اشخاص کے ساتھ تنہائی میں ہمکلام ہوتا اور اُن سے اپنے احکام کی تعمیل طلب کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وُہی مذہب الٰہی اِنفرادی خصوصیّت سے نکل کر قومیّت میں مُنتقل ہو گیا۔ اور مذہب الٰہی ایک قومی مذہب اور الہام الٰہی ایک قومی الہام ہو گیا۔ اور خُدائے تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مُطابق جو ابراہام سے کیا تھا اُس کی نسل کو جو اب ایک قومی صُورت اختیار کر چکی تھی چُن کر تمام بُت پرست اور مُشرک اقوام سے الگ کیا۔ اور اپنی خاص قوم بنایا اور فرمایا "کیونکہ تُم خُداوند اپنے خُدا کے لیئے ایک مُقدّس قوم ہو۔ خُداوند تُمہارے خُدا نے تُم کو رُوئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چُن لیا ہے تاکہ تُم اُس کی خاص اُمّت ٹھہرو"۔ (استثنا ۷: ۶) اور اِس خاص قوم اپنی اسرائیل پر مُوسےٰ کے وسیلے اپنی مرضی کا اظہار فرمایا۔ اور اپنے اوامر و نواہی کو اُن پر نازل فرما کے اُن پر اُن کی تعمیل طلب کی۔ "اِس لیئے جو فرمان اور آئین اور احکام میں آج کے دِن تُم کو بتاتا ہُوں تُم اُن کو ماننا اور اُن پر عمل کرنا"۔ (استثنا ۷: ۱۱) اور وُہ شرعِ الٰہی تین قسم کی تھی۔ یعنی شریعتِ مُلکی۔ شریعتِ رسمی اور شریعتِ اخلاقی۔ اور مُلکی و رسمی شرائع کی رُوحِ رواں اور مرکز شرعِ اخلاقی تھی۔ اب ہم نہایت مختصر طور پر شرائع ثلاثہ کا جُدا جُدا بیان کریں گے۔

(۱) شریعتِ رسمی:- قُربانیاں۔ ختنہ۔ عیدیں۔ نئے چاند۔ مذہبی حلّت و حُرمت۔ طہارتِ بدنی۔ روزہ۔ اور کاہن و سردار کاہن اور لاویوں اور عام قوم کے فرائض وغیرہ سب رسمی شریعت میں شامل ہیں۔ اِس شریعت کا بیان پیدائش کی کتاب کے سوا توریت کی چاروں کتابوں میں موجود ہے۔

(۲) شریعتِ اخلاقی۔ اس میں احکامِ عشرہ موجود ہیں۔ جو خدا نے پتھر کی دو لوحوں پر لکھے بکھاتے موسیٰ کو سونپے۔ (خروج ۳۱ : ۱۸ و ۳۲ : ۱۵-۱۶ و ۳۴ : ۲۸) اور یہ دس احکام خروج ۲۰ : ۱-۱۷ میں پائے جاتے ہیں۔ اور احبار ۱۹ اور استثنا کے چند ابتدائی ابواب میں ان کی مفصل شرح موجود ہے۔ اور اس شرحِ اخلاقی کا خلاصہ بدیں الفاظ موجود ہے "تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت رکھ" استثنا ۶ : ۵۔ یہ دس احکام کی لوحِ اوّل کے چار احکام کا خلاصہ ہے۔ "اپنے ہمسایہ سے اپنی مانند محبت رکھ" (احبار ۱۹ : ۱۸) یہ لوحِ ثانی کے چھ احکام کا خلاصہ ہے۔ اور خداوند مسیح نے بھی اخلاقی شریعت کو ہر قسم کی شریعت رسمی و ملکی کی جان ٹھہرایا۔ اور اسی خلاصہ شرحِ اخلاق کا اعادہ فرماتے ہوئے یہ کہا کہ "ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" متی ۲۲ : ۴۰ ۔

(۳) ملکی شریعت۔ اس میں بادشاہوں۔ قاضیوں اور حاکموں اور رعیت کے فرائض ہیں۔ اور علاوہ قوم اسرائیل شرائع رسمی و اخلاقی کے مخالف شرع کی خلاف ورزی کرنے والے تعزیراتِ ملکی کے ماتحت مختلف سزائیں پاتے تھے۔ تاکہ احکامِ الٰہی کی پابندی کی روح ان میں پیدا ہو۔ اور قوم خدا کی مرضی و منشاء کی قدر و منزلت کو پہچانے ۔

اخلاقی و جسمانی ہر دو قسم کے قوانین پہلو بہ پہلو اس قوم میں چلے آئے۔ اور بہت سے انبیاء یکے بعد دیگرے مختلف زمانوں اور متفرق حالتوں میں پیغامِ الٰہی لے کر اس قوم میں مبعوث ہوتے رہے۔ اور اپنے اپنے وقت میں قوم کی معاشرتی و اخلاقی اصلاح مختلف طریقوں سے کرتے آئے۔ اور ہزاروں برس

کے طویل عرصے میں خُدا کی اِس برگزیدہ و چنیدہ قوم کی مذہبی و اخلاقی حالت نے کئی رنگ پلٹے۔ کئی بار شرعِ الٰہی سے روگردانی و انحراف کرکے موردِ عتاب ٹھہری کئی بار توبہ و استغفار کے ذریعے بحال کی گئی۔ خُدا عادل ہے۔ اور اُس عادل نے قوانین کا نفاذ فرما کے اُن پر اِس مخصوص گروہ کا مخصوص عمل طلب کیا۔ لیکن اُس نے بجائے فرمانبرداری کے عدول حکمی کی۔ اِس لئے خُدا نے عادل ہونے کی حیثیت میں قانون شکن کو سزا دی۔ اور میعادِ تعزیر کے اختتام پر اُن کو رہائی دیتا رہا۔ اِس قوم کا سب سے بڑا گناہ جو خُدائے غیور کی غیرت کو جوش دلاتا رہا بُت پرستی تھا۔ جب جب اِس قوم کو اردگرد کی دیگر بے خُدا اور بُت پرست اقوام کے ساتھ ملنے کے مواقع ملے اُن کی باطل پرستی اور کُفر و شرک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور خُدا نے اِن ہی معایب و نقائص کے زنگ کو اُن کی طبائع سے مٹانے کے لئے بارہا اُنہیں مُصیبت کی آگ میں ڈالا۔ تاکہ وُہ کُندن کی طرح صاف اور خالص ہو جائیں "جب وُہ مُجھے تائے گا تو میں سونے کی مانند نکل آؤں گا۔" (ایُوب ۲۳ : ۱۰ و زبُور ۶۶ : ۱۰)

شریعت کا مرکز

بنی اسرائیل قوم کے فرائضِ مذہبی کی انجام دہی کا مرکز پہلے تو خیمہ تھا جس کا مفصّل احوال خروج باب ۲۵ میں پایا جاتا ہے۔ خیمہ کو دینی امُور کا مرکز اُس وقت اس وجہ سے بنایا گیا۔ کہ ابھی قوم اسرائیل خود آوارۂ غربت تھی۔ اور خیموں میں قیام کرتی تھی۔ اِس لئے اُن کی مذہبی ضرورت کو عارضی طور پر پُورا کرنے کے لئے خُدا نے خیمہ بنانے کا حکم دیا۔ اور ہر قسم کی شرعِ رسمی۔ مُلکی و اخلاقی کا تعلق اُسی سے تھا۔ اور جب یہ قوم رفتہ رفتہ مُلک موعُودہ کنعان پر قابض ہُوئی اور وہاں بود و باش کے لئے مکان بنائے اور قصبے و شہر آباد کئے تو عبادتِ الٰہی کے لئے بھی ایک مکان

بنایا گیا۔ اور وہ ہیکل تھی جو سلیمان بن داؤد نے شہر یروشلیم میں کوہ موریاہ پر تعمیر کی تھی۔ اور عبادت کے تمام لوازمات و اسباب خیمۂ موسوی سے اِس ہیکل میں منتقل ہوئے۔ اور ہیکل کی تعمیر کے متعلق خُدا نے پہلے ہی اُن کے ایّام مسافرت میں فرما دیا تھا " لیکن جب تم یردن پار جا کر اُس مُلک میں جس کا مالک خُداوند تمہارا خُدا تُم کو بناتا ہے بس جاؤ۔ اور وُہ تمہارے سب دُشمنوں کی طرف سے جو گرداگرد ہیں تُم کو راحت دے اور تُم امن سے رہنے لگو۔ تو وہاں جس جگہ کو خُداوند تمہارا خُدا اپنے نام کے مسکن کے لئے چُن لے وہیں تُم یہ سب کچھ جس کا میں تُم کو حُکم دیتا ہُوں لے جایا کرنا۔ یعنی اپنی سوختنی قربانیاں۔ اور اپنے ذبیحے اور اپنی دہ یکیاں۔ اور اپنے ہاتھ کے اُٹھائے ہُوئے ہدیئے اور اپنی خاص نذر کی چیزیں"۔ (استثنا ۱۲: ۱۰-۱۱ و ۱۸ و ۲۶)۔

اِس ہیکل کے ساتھ قوم بنی اسرائیل کے سوا اور کسی قوم کا کوئی تعلّق نہ تھا۔ اور نہ ہی عام اجازت تھی کہ غیر اقوام اُس سے تعلق رکھیں۔ اور نہ ہی شرعِ الٰہی کی نشر و اشاعت کا دیگر اقوام میں حُکم تھا۔ ہیکل ایک مختص بالقوم و زمان عبادت گاہ تھی۔ اور قوانین و شرعِ الٰہی بھی محدود بالقوم و زمن تھی۔ مدّتوں تک مذہبِ الٰہی اُس خاص قوم کے ساتھ خاص رہا۔ اور قوم اسرائیل کو ختنہ۔ قربانی۔ روزہ۔ سبت۔ طہارت اور حلّت و حُرمت کے احکام دینے اور ان تمام فرائض کی انجام دہی کا مرکز یروشلیم کی ہیکل کو ٹھہرانے سے خُدا کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو اردگرد کی تمام دیگر بُت پرست اقوام سے قوم مخصوص الیہ کا افتراق و امتیاز صاف نظر آئے۔ جس طرح فوجی لوگ خاص امتیازی نشانات و علامات کے باعث بادشاہ کی رعیّت کے عام افراد سے جُداگانہ اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ اُن ظاہری اور

رسمی دستورات اور ابتدائی اصولوں کی پابندی سے اُن کے اندر متابعت الٰہی کی بُنیاد رکھی جائے۔ تاکہ جہاں وُہ اپنے مویشی اور مال و اسباب کو عقیدتِ الٰہی کے مذبح پر قربان کرتے ہیں وہاں کسی وقت اپنی شخصیت کو نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے یہ ابتدائی سبق اُنہیں انبیاء کے ذریعے خُوب سکھایا۔ اور ان رسمی قربانیوں اور دیگر ظاہری اور جسمانی رسُومات کی تکمیل و تعمیل کے مطالبہ سے مقصدِ الٰہی یہ تھا، کہ فرمانبرداری اور اطاعت کے بیج کو اُن کے دِلوں میں بویا جائے۔ اور وُہ خاص رُوحانی مقصد جو ان عارضی و ظاہری رسُوم کے دائرہ کا مرکز تھا، بدیں الفاظ ظاہر کیا گیا ہے۔ "تُو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دِل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے محبّت رکھ" استثنا ۶ : ۵ ٭

عہدِ عتیق مختص بالقوم اور مختص بالزّمان تھا

اگر کوئی متلاشیٔ حق و صدق صافِ باطنی سے عہدِ عتیق کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرے تو وُہ یہ اِقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ توریت کا مذہب ایک مختص بالقوم والزّمان تھا۔ توریت میں ذاتی طَور پر ایک عالمگیر مذہب ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُس کا یہ دعویٰ ہے کہ وُہ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے دی گئی ہے۔ اُس کے تمام احکام و شرائع اور دستورات و اصُولات خاص قوم بنی اسرائیل سے ہی مختص تھے۔ اور شریعت موسوی کی تعمیل و تکمیل کا مرکز یروشلیم کی ہیکل تھا۔ یہودیت کے دائرۂ خاص سے باہر نہ تو اُس کی تبلیغ و اشاعت کا حُکم کہیں موجُود ہے، اور نہ ہی کبھی یہودی انبیاء نے اُس کی ترویج کو غیر اقوام میں جائز رکھا۔ بلکہ وُہ تو بُت پرست غیر اقوام کے درمیان خُدا کا نام لینا بھی خُدا کی بے عزّتی

وحقارت سمجھتے تھے۔ جب شاہ نبوکدنضر تمام یہودیوں کو اسیر کر کے بابل لے گیا تو
اُس وقت اُن کی دینی غیرت اور خدا کے نام کی توقیر کا اظہار ان الفاظ سے
عیاں ہے "ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے۔ اور صیّون کو یاد کر کے رو دئے۔ وہاں
بید کے درختوں پر ہم نے اپنی ستاروں کو ٹانگ دیا۔ کیونکہ وہاں ہم کو اسیر
کرنے والوں نے گیت گانے کا حکم دیا۔ اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کرنے
کا۔ اور کہا صیّون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سناؤ۔ ہم پردیس میں
خداوند کا گیت کیسے گائیں" (زبور ۱۳۷: ۱-۴) وہ غیر اقوام میں خدا کا نام لینا
خدا کو ٹھٹھوں میں اُڑانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ملکی و رسمی شرائع بہ نسبت کمزور
اور مختص بالقوم والزمان تھیں۔ اور اُن میں تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کی
صلاحیت ہی مفقود تھی۔ اور شریعت اخلاقی قوم و زمان کی قیود سے آزاد تھی۔
چنانچہ وہ اب تک یہودی۔ مسیحی اور کئی دیگر مہذب اقوام کا دستور العمل
بن کر چلی آتی ہے۔ عہد عتیق کے انبیاء خود توریت کی قربانیوں اور دیگر
رسموں کو کمزور اور ناقص بتاتے گئے ہیں۔ مثلاً سموایل نبی کہتا ہے کہ "کیا خداوند
سوختنی قربانیوں اور ذبیحوں سے اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا اس بات سے کہ
خداوند کا حکم مانا جائے؟ دیکھ فرمانبرداری قربانی سے اور بات ماننا مینڈھوں
کی چربی سے بہتر ہے" (۱ سموایل ۱۵: ۲۲)؛ داؤد نبی کا قول (زبور ۵۱: ۱۶-۱۷)
سلیمان نبی کا قول (امثال ۲۱: ۳)؛ ہوسیع نبی کا قول (ہوسیع ۶: ۶) دانی ایل نبی کا
قول (دانی ایل ۹: ۲۴-۲۷) بنی اسرائیل میں قربانیاں چڑھاتے چڑھاتے
یہ سہو و عقیدت پیدا ہو گئی کہ قربانی کی اصل روح اور غرض و غایت سے
لاپرواہ ہو کر گناہ کرنے میں آزاد اور بے خوف ہو گئے۔ اور عمداً و قصداً گناہ
کر کر کے قربانیوں اور دیگر رسوم کو رواجی و رسمی طور پر انجام دینے لگے۔ اور

اس بات کو بھول گئے کہ خدا کی فرمانبرداری قربانی چڑھانے سے بہتر ہے۔ انہوں نے عمداً گناہ کر کرکے اُن کی تلافی کے لئے قربانیاں چڑھانا ایک دستور العمل ہی بنا لیا۔ اور اس لئے خدا نے انبیاء کے ذریعے اس دستور کو نامقبول ٹھہرا کے تنبیہہ و ہدایت فرمائی۔ "خداوند فرماتا ہے لیکن میں اُس شخص پر نگاہ کروں گا۔ اُسی پر جو غریب اور شکستہ دل ہے۔ اور میرے کلام سے کانپ جاتا ہے۔ جو بیل ذبح کرتا ہے اُس کی مانند ہے جو کسی آدمی کو مار ڈالتا ہے۔ اور جو برہ کی قربانی کرتا ہے اُس کے برابر ہے جو کتے کی گردن کاٹتا ہے۔ جو ہدیہ لاتا ہے گویا سور کا لہو گذرانتا ہے۔ جو لُبان جلاتا ہے اُس کی مانند ہے جو بت کو مبارک کہتا ہے۔ ہاں اُنہوں نے اپنی اپنی راہیں چن لیں اور اُن کے دل اُن کی نفرتی چیزوں سے مسرور ہیں" (یسعیاہ ۶۶: ۲-۳ و ۱: ۱۱-۱۷) یہودی لوگ سال میں تین مرتبہ عیدیں منانے کے لئے یروشلیم میں جایا کرتے تھے۔ اور ان تینوں عیدوں یعنی عید فسح۔ عید خیام و عید پینتیکست کا تعلق ہیکل کے ساتھ تھا۔ ان عیدوں۔ قربانیوں اور دیگر تمام مذہبی رسموں کی ادائیگی کا مرکز ہیکل تھی۔ اُس کے علاوہ اور کسی جگہ ان فرائض کی انجام دہی ممنوع تھی۔ "اور خبردار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ جس جگہ کو دیکھو وہیں اپنی سوختنی قربانی چڑھاؤ۔ بلکہ فقط اُسی جگہ جسے خداوند تمہارے کسی قبیلہ میں چن لے تم اپنی سوختنی قربانیاں گذراننا۔ اور وہیں سب کچھ جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں کرنا" (استثنا ۱۲: ۱۳-۱۴)۔ اور ہیکل کا ایک خاص مقام یروشلیم ہی سے متعلق ہونا اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ اُس میں عالمگیر دینی مرکز ہونے کی قابلیت نہ تھی۔ کیونکہ بالفرض اگر تمام دُنیا توریت کی پیروی پر آمادہ ہوتی تو تمام دنیا کا عیدوں۔ قربانیوں اور دیگر رسموں کی ادائیگی کے لئے یروشلیم میں سال میں تین مرتبہ حاضر ہونا

محال ہوتا۔ اوّل تو اس قدر ہجوم کی وہاں گنجائش ہی نہ ہو سکتی تھی، اور جو وہاں نہ جاتا وُہ خُدا کا نافرمان ٹھہرتا۔ اور پھر تین مرتبہ سال میں وہاں حاضر ہونا لازمی تھا۔ تو اس صُورت میں ہزاروں کوس سے دُور دراز ممالک کے باشندے وہاں کیسے پہنچ سکتے۔ اُن کا تو سال بھر آمدو رفت ہی میں ختم ہو جایا کرتا۔ اور پھر ذرائع آمد و رفت کی دُشواریاں توریت کی توسیع اشاعت میں سدِّ راہ تھیں۔ اور ہیکل کا تمام عالم کے لئے مرجعِ دینی ہونے سے اُمورِ معاشرت میں سخت نقصان ہو کر جسمانی زندگی معرض خطر میں پڑ جاتی۔ پھر آمد و رفت کے بھاری اخراجات و مصارف کے متحمل ہونا غُربا کے لئے محال ہوتا اور وُہ اِس متبرک مقام کی زیارت سے محرُوم رہنے کے علاوہ خُدا کے مجرم ٹھہرتے۔ اور یہ ایک سخت ترین آسمانی سزا بنی نوعِ انسان کے لئے ہوتی۔ چُنانچہ کعبہ اور تیرتھوں کا وجُود اسلام اور ہندُو ازم کے مختص بالقوم و مُلک ہونے کی ایک بیّن اور مسکت دلیل ہے۔ ہم پیچھے خُوب دکھا چُکے ہیں کہ مذہب الٰہی کس طرح انفرادیت سے قومیّت میں منتقل ہُوا۔ اب عقل خواہ مخواہ یہ سوال کرتی ہے، کہ کیا خُدا صرف ایک خاندان یا ایک قوم ہی کا خُدا ہے؟ کیا وُہ محض یہُودی قوم ہی کو اپنے علم و عرفان سے مستفیض فرما کر فقط اُسی سے اپنی عبادت و طاعت اور بندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟ "کیا خُدا صرف یہُودیوں ہی کا ہے۔ غیر قوموں کا نہیں؟ بیشک غیر قوموں کا بھی ہے۔" رُومی ۳: ۲۹ وُہ تمام دینی و تادینی عالم کا خالق و رازق ہے۔" اور اُس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی۔" اعمال ۱۷: ۲۶ "تُو نے آسمان اور آسمانو کے آسمان کو اور اُن کے سارے لشکر کو اور زمین کو اور جو کچھ اُس پر ہے اور سمندروں کو اور جو کچھ اُن میں ہے بنایا، اور تو اُن سبھوں کا پروردگار ہے

اَور آسمان کا لشکر تجھے سجدہ کرتا ہے" نحمیاہ ۹: ۶۔ چُنانچہ اسی بنا پر وُہ تمام دُنیا سے اِستحقاقِ عبادت رکھتا ہے۔ اِس لئے لازمی امر ہے کہ اُس کا مذہب اِنفرادی اَور قَومی نہ ہو بلکہ عالمگیر ہو +

توریت میں ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر

عہدِ عتیق کے حدِّ رواج اَور مختص بالقوم و زمان ہونے کا مفصّل ذکر ہم نے اُوپر کر دیا ہے۔ صحائفِ عتیقہ اپنے حدِّ رواج کی خبر کے علاوہ ایک اَور عہد کی خبر بھی دیتے گئے ہیں۔ تاکہ جب اُس کے رواج کا زمانہ اِختتام کو پُہنچے تو وُہ عہد شروع ہو جائے۔ اَور جس طرح پہلے پہل مذہب الٰہی اِنفرادیت کی صُورت میں تھا، اَور پھر قومیّت میں بدل گیا تو ضرُوری امر ہے کہ اِس قومی مذہب کے بعد جو بھی مذہب ہو وُہ تدریجی ترقی کی طرف گامزن ہو۔ اَور بجائے قومی ہونے کے عالمگیر ہو۔ چُنانچہ اُس آنے والے نئے عہد کے متعلق عہدِ عتیق یہ خبر دیتا ہے۔ "دیکھ وُہ دن آتے ہیں۔ خداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اَور یہُوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ اُس عہد کے مطابق نہیں جو میں نے اُن کے باپ دادا سے کیا۔ ...... بلکہ یہ وُہ عہد ہے جو میں اِن دنوں کے بعد اسرائیل کے گھرانے سے باندھوں گا ......" یرمیاہ ۳۱: ۳۱-۳۴۔ خط عبرانی کا مُصنّف اپنے خط میں اِسی مقام کو اِقتباس کرکے آخر میں فرماتا ہے۔ کہ "جب اُس نے نیا عہد کیا تو پہلے کو پُرانا ٹھہرایا۔ اَور جو چیز پُرانی اَور مُدّت کی ہو جاتی ہے وُہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے" عبرانی ۸: ۱۳۔ اَور یہ عہد قومیّت کی اِنقیادی خصُوصیّت سے آزاد اَور عالمگیر بیان کیا گیا ہے۔ جو یسعیاہ نبی نے خُدا سے بذریعہ الہام خبر پا کے اس طرح بیان کیا ہے۔ "اَور بیگانے کی اَولاد بھی جنہوں

نے اپنے آپ کو خداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اُس کی خدمت کریں اور خداوند کے نام کو عزیز رکھیں۔ اور اُس کے بندے ہوں۔ وہ سب جو سبت کو حفظ کر کے اُسے ناپاک نہ کریں۔ اور میرے عہد پر قائم رہیں۔ میں اُن کو بھی اپنے کوہِ مُقدس پر لاؤں گا۔ اور اپنی عبادت گاہ میں اُن کو شادمان کروں گا اور اُن کی سوختنی قربانیاں اور اُن کے ذبیحے میرے مذبح پر مقبول ہوں گے کیونکہ میرا گھر سب لوگوں کی عبادت گاہ کہلائے گا۔ خداوند خدا جو اسرائیل کے پراگندہ لوگوں کو جمع کرنے والا ہے یُوں فرماتا ہے کہ میں اُن کے سوا جو اُسی کے ہو کر جمع ہوئے ہیں اوروں کو بھی اُس کے پاس جمع کروں گا۔" یسعیاہ ۵۶: ۶-۸
"وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہلِ لُغت کو جمع کروں گا۔ اور وُہ آئینگے اور میرا جلال دیکھیں گے۔" .... "اور خداوند فرماتا ہے کہ میں اُن میں سے بھی کاہن اور لاوی ہونے کے لئے لُوں گا۔" .... "اور یُوں ہو گا خداوند فرماتا ہے کہ ایک نئے چاند سے دُوسرے تک اور ایک سبت سے دُوسرے تک ہر فرد بشر عبادت کے لئے میرے حضُور آئیگا۔" یسعیاہ ۶۶: ۱۸ و ۲۱ و ۲۳-
اور جس طرح عہدِ عتیق کا بانی اور ضامن مُوسیٰ تھا۔ اُسی طرح اُس نئے عہد کے بانی و ضامن کی خبر بھی توریت میں بالتصریح و تفصیل موجود ہے ہم توریت ہی کے الفاظ میں اُس کو مفصّل طور پر قلمبند کریں گے +

نئے عہد کے بانی کے متعلق مفصّل خبریں

قول المسیح "تم کتابِ مُقدس میں ڈھُونڈتے ہو۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ اُس میں ہمیشہ کی زندگی تمہیں ملتی ہے۔ اور یہ وہ ہے جو میری گواہی دیتی ہے۔" یُوحنّا ۵: ۳۹)

(۱) وُہ یہوداہ کے فرقہ اور داوُد کے خاندان سے ہو گا۔ "دیکھ وُہ دن آتے

آتے ہیں، خداوند فرماتا ہے، کہ میں داؤد کے لئے ایک صادق شاخ پیدا کروں گا۔ اور اُس کی بادشاہی مُلک میں اقبال مندی اور عدالت اور صداقت کے ساتھ ہوگی۔ اُس کے ایام میں یہوداہ نجات پائیگا اور اسرائیل سلامتی سے سکونت کریگا۔ اور اُس کا نام یہ رکھا جائے گا خداوند ہماری صداقت ہے"۔ یرمیاہ ۲۳: ۵-۶ و یسعیاہ ۱۱: ۱-۲ و زکریاہ ۱۳: ۱ مطابق یوحنا ۱: ۴۲-

(۲) اُس کا ایک پیشرو ہوگا۔ "دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کریگا" (ملاکی ۳: ۱) "پکارنے والے کی آواز! بیابان میں خداوند کی راہ درست کرو۔ صحرا میں ہمارے خدا کے لئے شاہراہ ہموار کرو" یوحنا بپتسمہ دینے والا یسعیاہ ۴۰: ۳ مطابق متی ۳: ۱-۳

(۳) وہ کنواری سے پیدا ہوگا۔ "لیکن خداوند آپ تم کو ایک نشان بخشے گا۔ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا۔ اور وہ اُس کا نام عمانوایل رکھیگی"۔ یسعیاہ ۷: ۱۴ مطابق متی ۱: ۲۳

(۴) شہر بیت لحم میں پیدا ہوگا۔ "لیکن اے بیت لحم افراتاہ اگرچہ تو یہوداہ کے ہزاروں میں شامل ہونے کے لئے چھوٹا ہے۔ تو بھی تجھ میں سے ایک شخص نکلیگا اور میرے حضور اسرائیل کا بادشاہ ہوگا۔ اور اُس کا مصدر زمانہ سابق ہاں قدیم الایام سے ہے"۔ میکاہ ۵: ۲ مطابق متی ۲: ۱ و لوقا ۲: ۴-

(۵) اُس کو سجدہ کرنے کے لئے مجوسی آئیں گے۔ "وہ سب سبا سے آئیں گے اور سونا اور لوبان لائیں گے اور خداوند کی حمد کا اعلان کرینگے"۔ یسعیاہ ۶۰: ۶ مطابق متی ۲: ۱-۲ و ۱۱

(۶) مصر میں پناہ پائیگا۔ "جب اسرائیل ابھی بچہ ہی تھا میں نے اُس سے محبت رکھی۔ اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا"۔ ہوسیع ۱۱: ۱ مطابق متی ۲: ۱۳-۱۴

(۷) **معصوم بچوں کا قتل**۔ "رامہ میں ایک آواز سنائی دی۔ نوحہ اور زار زار رونا۔ راخل اپنے بچوں کو رو رہی ہے۔ وہ اپنے بچوں کی بابت تسلی پذیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ نہیں ہیں۔" یرمیاہ ۳۱ : ۱۵ مطابق متی ۲ : ۱۶-۱۸ ۔

(۸) **وہ روح القدس سے ممسوح ہو گا**۔ "خداوند خدا کی روح مجھ پر ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے مسح کیا۔ تاکہ خوشخبری (انجیل) سناؤں۔" یسعیاہ ۶۱ : ۱۔ اور خداوند کی روح اس پر ٹھہرے گی۔ حکمت اور خرد کی روح مصلحت اور قدرت کی روح معرفت اور خداوند کے خوف کی روح۔" یسعیاہ ۱۱ : ۲ مطابق متی ۳ : ۱۶ ۔

(۹) **قومیں اس سے برکت پائیں گی**۔ "اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔" پیدائش ۱۲ : ۲ مطابق اعمال ۳ : ۲۵-۲۶ ۔

(۱۰) **گلیل میں اس کا کام**۔ "لیکن اندوہگیں کی تیرگی جاتی رہے گی۔ اس نے قدیم زمانہ میں زبولون اور نفتالی کے علاقوں کو ذلیل کیا۔ پر آخری زمانہ میں قوموں کی گلیل میں دریائی سمت یردن کے پار بزرگی دے گا۔ جو لوگ تاریکی میں چلتے تھے انہوں نے بڑی روشنی دیکھی۔ جو موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے ان پر نور چمکا۔" یسعیاہ ۹ : ۱-۲ مطابق متی ۴ : ۱۲-۱۶ ۔

(۱۱) **اس کے معجزات**۔ "ان کو جو کچے دل ہیں کہو ہمت باندھو مت ڈرو ...... اس وقت اندھوں کی آنکھیں وا کی جائیں گی۔ اور بہروں کے کان کھولے جائیں گے۔ تب لنگڑے ہرن کی مانند چوکڑیاں بھریں گے۔ اور گونگے کی زبان گائے گی۔" یسعیاہ ۳۵ : ۴-۶ مطابق متی ۱۱ : ۴-۵ و اعمال ۲ : ۲۲ ۔

(۱۲) **گدھے پر سوار ہو کر یروشلیم میں داخل ہونا**۔ "اے دختر یروشلیم خوب للکار۔ کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور

نجات اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وُہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوار ہے۔" زکریاہ ۹: ۹ مطابق متّی ۲۱: ۵-۷ ÷

(۱۲) یہود و غیر اقوام اُسے ردّ کرینگے۔ "قومیں کس لئے جوش میں ہیں اور لوگ کیوں باطل خیال باندھتے ہیں۔ خداوند اور اُس کے مسیح کے خلاف زمین کے بادشاہ صف آرائی کرکے اور حاکم آپس میں مشورہ کرکے کہتے ہیں ..."
زبور ۲: ۱-۲ و اعمال ۴: ۲۵-۲۸ ÷

(۱۴) اپنے ایک شاگرد کے ہاتھوں گرفتار ہوگا۔ "بلکہ میرے دلی دوست نے جس پر مجھے بھروسہ تھا، اور جو میری روٹی کھاتا تھا مجھ پر لات اُٹھائی"۔
زبور ۴۱: ۹ و ۵۵: ۱۲ مطابق یوحنا ۱۳: ۱۸ و ۲۶-۲۷ ÷

(۱۵) تیس روپے میں بیچا جائیگا۔ "اور اُنہوں نے میری مزدوری کے لئے تیس روپے تول کر دئے۔ اور خداوند نے مجھے کہا کہ اُسے کمہار کے سامنے پھینک دے۔ یعنی اُس بڑی قیمت کو جو اُنہوں نے میرے لئے ٹھہرائی۔ اور میں نے یہ تیس روپے لے کر خداوند کے گھر میں کمہار کے سامنے پھینک دئے"۔
زکریاہ ۱۱: ۱۲-۱۳ مطابق متّی ۲۶: ۱۴: ۲۷: ۳-۱۰ ÷

(۱۶) شاگرد اُس سے بیوفائی کرینگے۔ "رب الافواج فرماتا ہے اے تلوار تو میرے چرواہے یعنی اُس انسان پر جو میرا رفیق ہے بیدار ہو۔ چرواہے کو مار کہ گلہ پراگندہ ہو جائے۔" زکریاہ ۱۳: ۷ مطابق متّی ۲۶: ۳۱ و ۵۶ ÷

(۱۷) جھوٹے گواہوں کی شہادت۔ "جھوٹے گواہ اُٹھتے ہیں اور جو باتیں میں نہیں جانتا وُہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ وُہ مجھ سے نیکی کے بدلے بدی کرتے ہیں۔" زبور ۳۵: ۱۱-۱۲ و ۲۷: ۱۲ مطابق مرقس ۱۴: ۵۵-۵۸ ÷

(۱۸) اُس کے مُنہ پر طمانچے مارینگے۔ "ہمارا محاصرہ کیا جاتا ہے۔ وُہ اسرائیل

کے حاکم کے گال پر چھڑی سے مارتے ہیں۔" میکاہ ۵: ۱ مطابق متی ۲۷: ۳۰ و مرقس ۱۵: ۱۹ ۔

(۱۹) اُس کے مُنہ پر تھوکیں گے اور تھپّڑ ماریں گے۔ "مَیں نے اپنی پیٹھ پیٹنے والوں کے اور اپنی داڑھی نوچنے والوں کے حوالے کی۔ مَیں نے اپنا مُنہ رسوائی اور تھوک سے نہیں چھپایا۔" یسعیاہ ۵۰: ۶ مطابق مرقس ۱۵: ۱۹-۲۰ ۔

(۲۰) وُہ تمام اذیتوں کو خاموشی سے سہیگا۔ "وُہ ستایا گیا تو بھی اُس نے برداشت کی اور مُنہ نہ کھولا۔ جس طرح برّہ جسے ذبح کرنے کو لے جاتے ہیں اور جس طرح بھیڑ بال کترنے والوں کے سامنے بے زبان ہے اُسی طرح وُہ خاموش رہا۔" یسعیاہ ۵۳: ۷ مطابق متی ۲۷: ۱۲-۱۴ ۔

(۲۱) اُس کی صلیبی حالت۔ "مَیں پانی کی طرح بہ گیا۔ میری سب ہڈیاں اُکھڑ گئیں۔ میرا دل موم کی مانند ہو گیا۔ وُہ میرے سینہ میں پگھل گیا۔ میری قوت ٹھیکرے کی مانند خشک ہو گئی۔ اور میری زبان میرے تالو سے چپک گئی۔ اور تو نے مجھے موت کی خاک میں ملا دیا۔ کیونکہ کتّوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔ بدکاروں کا گروہ مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ وُہ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں چھیدتے ہیں۔ مَیں اپنی سب ہڈیاں گن سکتا ہوں۔ وُہ مجھے تکتے اور گھورتے ہیں۔" زبور ۲۲: ۱۴-۱۷ مطابق متی ۲۷: ۳۴-۴۴ ۔

(۲۲) اُس کی پوشاک پر قرعہ اندازی۔ "وُہ میرے کپڑے آپس میں بانٹتے ہیں۔ اور میری پوشاک پر قرعہ ڈالتے ہیں۔" زبور ۲۲: ۱۸ مطابق متی ۲۷: ۳۵ ۔

(۲۳) پت اور سرکہ پلانا۔ "اُنہوں نے مجھے کھانے کو پت دیا۔ اور میری پیاس بجھانے کو اُنہوں نے مجھے سرکہ پلایا۔" زبور ۶۹: ۲۱ مطابق متی ۲۷: ۳۴، ۴۸ و یوحنا ۱۹: ۲۸-۳۰ ۔

(۲۴) وُہ چھیدا جائیگا۔ "وُہ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں چھیدتے ہیں"۔ زبُور ۲۲: ۱۶ "اور وُہ اُس پر جس کو اُنہوں نے چھیدا ہے نظر کرینگے"۔ زکریاہ ۱۲: ۱۰ مطابق یُوحنّا ۱۹: ۳۴ و ۳۷ ٭

(۲۵) اُس کی ہڈّی توڑی نہ جائیگی۔ "وُہ اُس کی سب ہڈیوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ اُن میں سے ایک بھی توڑی نہیں جاتی"۔ زبُور ۳۴: ۲۰ مطابق یُوحنّا ۱۹: ۳۲-۳۶ ٭

(۲۶) برضا و رغبت وفات پائیگا۔ "قُربانی اور نذر کو تُو پسند نہیں کرتا۔ تُو نے میرے کان کھول دئے ہیں۔ .... کِتاب کے طُومار میں میری بابت لکھا ہے۔ اَے میرے خُدا میری خُوشی تیری مرضی پُوری کرنے میں ہے"۔ زبُور ۴۰: ۶-۸ مطابق یُوحنّا ۱۰: ۱۰-۱۸ ٭

(۲۷) ہمارے گُناہوں کے بدلے مریگا۔ "یقیناً اُس نے ہماری مشقتیں اُٹھالیں۔ اور ہمارے غموں کو برداشت کیا پر ہم نے اُسے خُدا کا مارا کُوٹا اور سَتایا ہُوا سمجھا۔ حالانکہ وُہ ہماری خطاؤں کے سبب سے گھایل کیا گیا۔ اور ہماری بدکرداری کے باعث کُچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اُس پر سیاست ہُوئی۔ تاکہ اُس کے مار کھانے سے ہم شِفا پائیں .... خُداوند نے ہم سب کی بدکاری اُس پر لادی"۔ یسعیاہ ۵۳: ۴-۶ و دانی ایل ۹: ۲۶ مطابق مرقس ۱۰: ۴۵ و اعمال ۸: ۳۰-۳۵ و ا پطرس ۲: ۲۴ ٭

(۲۸) تیسرے روز قبر سے زندہ ہوگا۔ "وُہ دو روز کے بعد ہم کو حیاتِ تازہ بخشیگا اور تیسرے روز اُٹھا کھڑا کریگا۔ اور ہم اُس کے حضُور زندگی بسر کریں گے"۔ ہوسیع ۶: ۲ "اِسی سبب سے میرا دِل خُوش اور میری رُوح شادمان ہے۔ میرا جسم بھی امن و امان میں رہیگا۔ کیونکہ تُو نہ میری جان کو

پاتال میں رہنے دے گا نہ اپنے مُقدس کو سڑنے دیگا۔ تُو مجھے زندگی کی راہ دکھائے گا۔" زبُور ۱۶: ۹-۱۱ مطابق اعمال ۲: ۳۱-۳۲ و ۲: ۲۴-۲۸ و لُوقا ۲۴: ۵-۷ ٭

(۲۹) توما کو اپنے زخم دکھانا۔ "اور جب کوئی اُسے پُوچھے گا کہ تیری چھاتی پر یہ زخم کیسے ہیں، تو وُہ جواب دیگا۔ یہ وُہ زخم ہیں جو میرے دوستوں کے گھر میں لگے۔" زکریاہ ۱۳: ۶ مطابق یُوحنّا ۲۰: ۲۴-۲۵ و ۲۷ ٭

(۳۰) زندہ ہو کر آسمان پر صعُود فرمائے گا۔ "تُو نے عالمِ بالا کو صعُود فرمایا تُو قیدیوں کو ساتھ لے گیا۔" زبُور ۶۸: ۱۸ "یہوّاہ نے میرے خُداوند سے کہا تُو میرے داہنے ہاتھ بیٹھ جب تک کہ میں تیرے دُشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی نہ کردُوں۔" زبُور ۱۱۰: ۱ مطابق لُوقا ۲۴: ۵۱ و اعمال ۱: ۹ و ۲: ۳۴-۳۵

(۳۱) دوبارہ آئیگا اور تا ابد سلطنت کرے گا۔ "خُداوند میرا خُدا آئیگا اور سب قُدسی اُس کے ساتھ۔" زکریاہ ۱۴: ۵ مطابق ۲ تھسلنیکی ۱: ۷ و متّی ۱۶: ۲۷ "ایک شخص آدم زاد کی مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور قدیم الایّام تک پہنچا۔ وُہ اُسے اُس کے حضُور لائے، اور سلطنت اور حشمت اور مملکت اُسے دی گئی، تاکہ سب لوگ اور اُمتیں اور اہلِ لُغت اُس کی خدمت گزاری کریں۔ اُس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے جو جاتی نہ رہے گی اور اُس کی مملکت لازوال ہوگی۔" دانی ایل ۷: ۱۳-۱۴ مطابق متّی ۲۸: ۱۸ و یُوحنّا ۵: ۲۲-۲۳ و فلپّی ۲: ۹-۱۱ و ۲ پطرس ۱: ۱۱ ٭

"اس لئے ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہُوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا۔ اور سلطنت اُس کے کاندھے پر ہوگی۔ اور اُس کا نام عجیب۔ مشیر۔ خُدائے قادر ابدیّت کا باپ۔ سلامتی کا شہزادہ ہوگا۔ اُس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی

کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ وہ داؤد کے تخت اور اُس کی مملکت پر آج سے ابد تک حکمران رہے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشے گا۔ ربّ الافواج کی غیوری یہ کرے گی" یسعیاہ ۹: ۶-۷ مطابق لوقا ۱: ۳۱-۳۳

عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے بانیوں کی باہمی مشابہت

قولُ المسیح "ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں" لوقا ۲۴: ۴۴

ہم اوپر عہدِ جدید کے ہونے والے بانی کی تمام زندگی کی مکمل تصویر نبیوں کے صحیفوں اور زبور کی پیشین گوئیوں میں دکھا چکے ہیں۔ اب صرف توریت کی شہادت باقی ہے، جو ہم ابھی پیش کرنے والے ہیں۔ تمام الہامی انبیا اپنے صحائف منزلہ الہیہ میں بانیٔ عہدِ جدید کی تصویر کے جدا جدا پہلو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ناظرین مندرجہ بالا اکتیس (۳۱) پیشین گوئیوں میں کھینچی ہوئی تصویر کو بانیٔ عہدِ جدید کی تصویر کے ساتھ جو انجیل مقدس (عہدِ جدید) میں موجود ہے ملا دیکھیں تو دونوں میں سرِمو فرق نہ پائیں گے۔ وہ تصویر جو موسیٰ اور مابعد کے متعدد انبیا نے اُس موعود کی کھینچی ہے اُس کے تمام خط و خال خداوند مسیح کے ساتھ پورے پورے طور پر صادق آتے ہیں۔ تمام اخبار عتیقہ و اذکار سابقہ کا کھوج سوائے سردارِ کائنات و سرچشمۂ حسنات جناب فضیلت مآب خداوند مسیح کی عدیم النظیر اور فقید المثال ہستی کے کسی بھی دوسری ہستی میں اصلاً نہ ملیگا۔ ہم اپنے اِس دعویٰ کی صداقت اور حقیقت کو عہدِ عتیق کے بانی موسیٰ نبی کی زبانی اور بھی زیادہ صفائی سے پایۂ ثبوت کو پہنچائیں گے۔ موسیٰ توریت کی پانچویں کتاب میں یوں فرماتا ہے۔ "اور خداوند

نے مجھ سے کہا کہ وُہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وُہی وُہ اُن سے کہیگا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وُہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لونگا۔" (استثنا ۱۸: ۱۷-۱۹-

اِس کے ساتھ مسیح کا قول بھی ملاحظہ ہو "کیونکہ اگر تم مُوسیٰ کا یقین کرتے تو میرا بھی یقین کرتے۔ اِس لئے کہ اُس نے میرے حق میں لکھا ہے۔" یُوحنّا ۵: ۴۶۔ خُداوند نے مُوسیٰ سے کہا کہ" اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔" یہاں مُوسیٰ اُس ہونے والے نبی کو اپنی مانند کہتا ہے۔ تو اب یہ دیکھنا مُناسب ہے کہ مُوسیٰ اور مسیح میں کن کن باتوں میں مُشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اگر اِن دونوں میں خاص خاص صفات مُشترک نہ ہوں تو مُشابہت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی ہم مسیح پر اِس پیشین گوئی کو چسپاں کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مشابہت ثابت ہو جائے تو پھر خُداوند مسیح ہی اِس خبر کے مفہوم کا مصداق ہوگا نہ کہ کوئی اَور۔ مندرجہ ذیل امُور متقابلہ پر غور کیجئے:-

(۱) مُوسیٰ کی پیدائش کے وقت اسرائیلیوں کے لڑکے شاہ فرعون کے حکم سے مروائے جاتے تھے۔ خروج ۱: ۱۵-۱۶ و ۲۲	(۱) مسیح کی پیدائش کے وقت شاہ ہیرودیس کے حکم سے لڑکے قتل کروائے گئے۔ متی ۲: ۱۶
(۲) مُوسیٰ کو بچپن میں خُدا نے عجیب حکمت سے بادشاہ کے دستِ ستم سے بچایا۔ خروج ۲: ۵-۱۰	(۲) مسیح کو بچپن میں خُدا نے فرشتے کے ذریعے آگاہی دیکر عجیب طور پر شاہ ہیرودیس کے دستِ ستم سے بچایا۔ اور لُطف یہ کہ مُوسیٰ

موسیٰ	مسیح
	نے بھی مصر میں پناہ پائی اور مسیح نے بھی مصر ہی میں پناہ پائی - متی ۲: ۱۳-۱۵+
(۳) موسیٰ بارہ قبیلوں کا ہادی تھا۔	(۳) مسیح کے شاگرد بھی بارہ تھے۔ بجائیکہ وہ تمام دُنیا کا ہادی ٹھہرا۔
(۴) موسیٰ کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو خون بنا دیا۔ خروج ۷: ۱۹-۲۰	(۴) مسیح کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو مے بنایا - یوحنا ۲: ۷-۹+
(۵) موسیٰ نے معجزانہ طور پر بحرِ قلزم کے دو حصے کر دئے۔ اور بنی اسرائیل سلامتی سے اُس میں سے گذر گئے۔ اور دریا سے کسی جان کا کبھی نقصان نہ ہوا۔ خروج ۱۴: ۲۱-۲۲	(۵) مسیح نے اعجازی قوت سے جھیل کے طوفان کو روکا اور اپنے شاگردوں کی جانیں ہلاکت سے بچائیں۔ لوقا ۸: ۲۲-۲۵+
(۶) موسیٰ نے حورب کی چٹان سے پانی نکالا اور قوم کی پیاس بجھا کر اُنہیں مرنے سے بچایا۔ خروج ۱۷: ۳-۶	(۶) خداوند مسیح نے فرمایا "زندگی کا پانی میں ہوں۔ جو کوئی مجھ سے پیتا ہے وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا" یوحنا ۴: ۱۴۔ اور پولوس رسول حورب کی چٹان کو جس سے موسیٰ نے پانی نکالا، خداوند مسیح سے ملاتا ہے۔ ۱-کرنتھیوں ۱۰: ۴+
(۷) موسیٰ نے قوم اسرائیل کو من کھلایا جو معجزانہ طور پر آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ خروج ۱۶: ۱۴-۱۵	(۷) مسیح نے ایک دفعہ پانچ ہزار کی بھیڑ اور دوسری دفعہ چار ہزار کی بھیڑ کو معجزانہ طور پر صرف چند روٹیوں سے آسودہ کیا۔ اور بہت روٹی بچ بھی رہی۔ متی ۱۴: ۱۵-۲۱ و ۱۵: ۳۲-۳۸۔ اور پھر فرمایا۔

	"تمہارے باپ دادوں نے بیابان میں مَن کھایا اور مر گئے۔" "مَیں ہُوں وُہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اُتری۔ اگر کوئی اِس روٹی میں سے کھائے تو ابد تک زندہ رہیگا۔" یُوحنّا ۶: ۴۹-۵۱۔
(۸) مُوسیٰ نے اِسرائیلیوں کو شاہِ مِصر کی غلامی سے چھڑایا۔	(۸) مسیح نے ابلیس، گُناہ اور مَوت کی غلامی سے ایمانداروں کو آزاد کیا۔ یُوحنّا ۸: ۳۲-۳۶ و عبرانی ۲: ۱۵
(۹) مُوسیٰ نے اپنے مِن جانبِ خُدا نبی ہونے کو مُعجزات سے ثابت کیا۔ اِستثنا ۳۴: ۱۰-۱۲	(۹) مسیح نے فرستادۂ خُدا ہونے کے ثبوت میں مُعجزات پیش کئے۔ یُوحنّا ۵: ۳۶ و اعمال ۲: ۲۲
(۱۰) مُوسیٰ چالیس روز تک بغیر کھائے پیئے خُدا کے حضُور میں رہا۔ خرُوج ۳۴: ۲۸	(۱۰) مسیح چالیس روز تک بلا خورد و نوش جنگل میں خُدا کی قُربت میں رہا۔ متّی ۴: ۱-۲
(۱۱) مُوسیٰ کا چہرہ خُدا کے جلال کی تجلّی سے چمکنے لگا۔ اور اُس کی صُورت تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ لوگ اُس سے ڈرنے لگے۔ خرُوج ۳۴: ۲۹-۳۵ و ۲ کرنتھی ۳: ۷۔	(۱۱) مسیح کی صُورت کوہِ حرمون پر تبدیل ہو گئی اور سُورج کی مانند چمکنے لگی۔ اور اُس کے شاگرد نہایت خوفزدہ ہُوئے اور لُطف یہ کہ مُوسیٰ بھی اُس وقت ایلیاہ کی ہمراہی میں مسیح کے ساتھ پایا گیا۔ متّی ۱۷: ۲-۸ و مرقس ۹: ۲-۸ و لُوقا ۹: ۲۸-۳۶۔
مُوسیٰ کی صُورت کوہِ سینا پر نُورانی ہو گئی۔	مُوسیٰ کی صُورت کوہِ سینا پر تبدیل ہوئی

	اور مسیح کی صورت کوہ حرمون پر نورانی ہوگئی۔ دونوں نظارے پہاڑی ہیں۔
(۱۲) پرانا عہد موسیٰ کے ذریعے خون سے باندھا گیا۔ خروج ۲۴: ۸ و عبرانی ۹: ۱۸-۲۰۔	(۱۲) نیا عہد مسیح کے خون سے باندھا گیا۔ لوقا ۲۲: ۲۰ و ۱ کرنتھی ۱۱: ۲۵ و عبرانی ۹: ۱۱-۲۲
(۱۳) "شریعت تو موسیٰ کے ذریعے دی گئی۔" یوحنا ۱: ۱۷	(۱۳) "مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی۔" یوحنا ۱: ۱۷
(۱۴) موسیٰ نے آخری وقت یشوع پر ہاتھ رکھ کر اسے مخصوص کیا۔ اور اپنی جگہ اسے قوم کا ہادی بنا کر وصیت کی۔ گنتی ۲۷: ۱۵-۲۳ و استثنا ۳۴: ۹	(۱۴) مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو برکت دی۔ اور روح القدس سے مسح کر کے اپنی جگہ قائم مقام بنا کر وصیت کی۔ متی ۲۸: ۱۸-۲۰ و یوحنا ۲۰: ۲۱-۲۳
(۱۵) موسیٰ کی قبر معدوم البتہ ہے۔ کوئی اس کی بابت نہیں جانتا۔ استثنا ۳۴: ۶ و خط یہوداہ ۹ آیت۔	(۱۵) خداوند مسیح کی قبر بھی معدوم ہے۔ اگر ہے تو خالی ہے۔ مسیح زندہ ہوگیا۔ متی ۲۸: ۵-۷ و لوقا ۲۴: ۳-۷ و ۱ کرنتھی ۱۵: ۲۰ و اعمال ۲: ۳۲۔

اوپر ہم نے پندرہ امور میں موسیٰ اور خداوند مسیح کی مشابہت دکھائی ہے۔ جس سے بتمام وکمال طور سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ کی وہ خبر جو اس نے (اپنی مانند ایک نبی" کے برپا ہونے کے متعلق دی تھی وہ بجز خداوند مسیح کے اور کسی نبی یا رسول پر ہرگز ہرگز صادق نہیں آسکتی۔ اور پھر یشوع کے زمانے تک کسی ایسے نبی کی بعثت کا اشارہ تک نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے یوں لکھا ہے۔" اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی

نبی مُوسیٰ کی مانند" جس سے خُداوند نے رُوبرُو باتیں کیں نہیں اُٹھا۔ استثنا ۳۴: ۱۰
اَور اُسکے بعد بھی کسی نبی نے نہ تو بالصّراحت اَور نہ بالاِشارت اُس موعُود نبی کے آ
چُکنے کا کہیں ذکر کیا۔ اِس لیٔے عہدِ عتیق کے سب سے آخری نبی نے بھی مُوسوی
شریعت ہی کی طرف قوم کی توجہ کی رہنمائی کی۔ اگر وُہ موعُود نبی اُسکے زمانہ تک آ چُکا
ہوتا تو وُہ قوم کو اُسکی طرف توجہ دلاتا نہ کہ مُوسیٰ کی طرف۔ لیکن وُہ شرع مُوسوی ہی
کی یاد دہانی کرواتا ہے۔ "تُم میرے بندے مُوسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض و احکام کو جو
مَیں نے حورب پر تمام بنی اسرائیل کیلئے فرمائے یاد رکھو۔" ملاکی ۴: ۴ پس ثابت ہُوا کہ توریت
کے سب سے آخری نبی یعنی ملاکی کے زمانہ تک بھی وُہ نبی ظاہر نہ ہُوا تھا۔ اِس لئے اُس
نبی کی کھوج ہمیں ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں کرنی پڑے گی دیں حالیکہ
ملاکی نبی نے بھی اُس موعُود نبی اَور اُس کے پیشرَو (یُوحنّا بپتسمہ) کے ظہورِ
آیندہ کی صریح خبر بدیں الفاظ دی۔ "دیکھو مَیں اپنے رسُول کو بھیجُوں گا۔
اَور میرے آگے راہ درست کرے گا۔ اَور خُداوند جس کے تُم طالب ہو
ناگہاں اپنی ہیکل میں آ موجُود ہوگا۔ ہاں عہد کا رسُول جس کے تُم منتظر ہو
آئے گا۔ ربُّ الافواج فرماتا ہے۔" ملاکی ۳: ۱، مطابق مرقس ۱: ۲ و لُوقا ۷: ۲۰
و یُوحنّا ۲: ۱۳-۱۷۔ چُنانچہ ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں خُداوند یسُوع مسیح
کا ظہور ہُوا۔ اَور وُہ عدیمُ السّہیم شخصیت اَور فقیدُ المثل ہستی تمام انبیاء
کی پیش خبریوں کو پُورا کرنے اَور قوم کے طویل انتظار کا جواب دینے کے لئے
زینت افزائے کاشانۂ گیتی ہُوئی۔ پُرانے عہد کے موعُود نبی و بادشاہ اَور
نئے عہد کے خُداوند مسیح کی ذات میں سر مُو فرق نہیں۔ وُہ دونوں ایک ہی ہیں۔
ایک خواب ہے تو دُوسرا اُس کی تعبیر ہے۔ اگر عہدِ عتیق انتظار کی دراز تیرہ
شب ہے تو عہدِ جدید اُس انتظار کا جواب اَور حصُولِ مقصُود کا روزِ روشن

ہے۔ اور خداوند مسیح نے بارہا انبیاء سابقہ کو خود اپنی ذات پر چسپاں کیا۔ ملاحظہ ہو لوقا ۲۴: ۴۴ و ۴ : ۱۷-۲۱ و متی ۲۲: ۴۲-۴۶ و یوحنا ۵: ۳۹-

پس ثابت ہوا کہ توریت میں جو ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر پائی جاتی ہے وہ عہدِ مسیحیت ہے۔ اور جس بانی عہدِ جدید کی خبریں عہدِ عتیق نے دی ہیں وہ بانی خداوند یسوع مسیح ہے جس نے اِس عالم آب و گِل کو اپنے مبارک قدموں کی برکت سے سرفراز فرمایا۔

اِلہام و مذہب الٰہی کی تدریجی کمالیت

اگر صحیفۂ فطرت پر ایک غائر اور تحقیقی نظر ڈالی جائے تو ایک قانون نظر آتا ہے جو تمام موجودات عالم میں مشترک طور پر جاری وساری ہے۔ اور وہ قانون ہے تدریجی ارتقاء۔ ہر شے ادنیٰ سے اعلیٰ اور ناقص سے کامل کی طرف ترقی کرتی ہوئی صاف نظر آتی ہے یعنی یہ نہیں کہ رات کو دانہ کا بیج بویا جائے اور صبح کو وہ پچاس فٹ اونچا درخت ہو کر پھل دینے لگے۔ بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ایک مخصوص وقت پر کمال کو پہنچتا ہے۔ ہر شے کی پیدائش، وسطی اور انتہائی حالت اِس حقیقت کی تائید و تصدیق کرتی ہے۔ جبکہ جسمانی و مادی عالم میں تدریجی ارتقاء کا قانون خالق نے موضوع کر دیا ہے۔ تو لازمی امر ہے کہ اخلاقی و روحانی امور میں بھی ایسا ہی ہو۔ کیونکہ صحیفۂ فطرت اور صحیفۂ الہام دونوں کا مصنّف خدا تعالیٰ ہے۔ کائنات جس خدا کا فعل ہے اِلہام اُسی کا قول ہے۔ لہٰذا دونوں میں مطابقت و مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ عقلی و علمی ارتقاء میں بھی تدریجی ترقّی و کمالیت کا اٹل قانون جاری وساری نظر آتا ہے۔ طالب علم جوں جوں عقلی منازل کو طے کرتا جاتا ہے ہر مرحلہ پر اُس کے حسب لیاقت کتب درسی

پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے ہی روز بچے کے ہاتھ میں گلستان بوستان دے دی جائیں۔ یہی حال نزول الہام الٰہی کا ہے۔ خدا اہلِ دُنیا کی حالتِ اساسی، وسطی اور انتہائی کے تناسب سے اپنے مکاشفہ و الہام نازل فرماتا ہے۔ اُس نے اپنا الہام و مکاشفہ انفرادیت سے شروع کیا۔ اور خاص اشخاص کو بہت سادہ احکام و قوانین دے کر اُن سے اُن کی تعمیل طلب کی۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چُن لیا، اور اپنے احکام و قوانین زیادہ تعداد میں مُوسیٰ کی معرفت اُن پر نازل کئے۔ اور اُن کی تعمیل و تقلید کی تاکید زمانہ بہ زمانہ طرح بہ طرح انبیاء کی معرفت فرماتا رہا۔ وہ الہام صرف قوم اسرائیل ہی سے متعلق تھا، اور مذہب الٰہی قومی مذہب تھا۔ اور ضروری تھا کہ مذہب الٰہی انتیادی خصُوصیت سے نکل کر عمُومیت میں تبدیل ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا جیسا ہم پیشتر بالتفصیل دکھا چکے ہیں۔ چونکہ خصُوصیت عمُومیت کی ایک فرد ہے۔ لہٰذا خُدا نے اپنا الہام و مکاشفہ ابتدائی خاص سے شروع کر کے عام تک پہنچایا۔ پہلے اُس نے خاص افراد کو چُنا۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چُن لیا۔ جس طرح خداوند مسیح نے اپنے بارہ شاگردوں کو چُن لیا اور اُنہیں فرمایا "مَیں نے تمہیں چُن لیا اور تم کو مقرر کیا کہ جا کر پھل لاؤ" (یُوحنا ۱۵: ۱۶) اور اس عالمگیر مذہب کے بانی نے اپنی خدمت کو اُسی جگہ سے شروع کیا جہاں انبیاء متقدمین نے اپنے کام کو چھوڑا تھا۔ یعنی یہُودی قوم سے شروع کر کے تمام اقوام عالم تک اور یروشلیم سے شروع کر کے تمام دُنیا کی حدُود تک اپنی خدمت کو وُسعت دی (لُوقا ۲۴: ۴۷) مرکز سے شروع کر کے محیط کی طرف بڑھنا مسیح کا مقصد تھا۔ اسی لئے آپ نے ایک جگہ فرمایا "مَیں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی ۱۵: ۲۴) یہ

ہی تھا مرکز سے شروع کرنا۔ یروشلیم سے شروع کرنا۔ لیکن بعد میں آپ نے فرمایا۔ "میری اَور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانے (قومِ اسرائیل) کی نہیں۔ مجھے اُن کا بھی لانا ضرور ہے۔ اَور وہ میری آواز سُنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اَور ایک ہی چرواہا ہوگا" یہی تھا محیط تک پہنچنا۔ زمین کی اِنتہا تک گواہ ہونا۔ (یُوحنا ۱۰: ۱۶ اور اعمال ۱: ۸) دُنیا کی ہر شے مرکز سے محیط کی طرف بڑھتی ہُوئی نظر آتی ہے۔ اَور خداوند مسیح نے بھی اس مقررہ قانون کے مطابق اپنے کام کو مرکز سے آغاز کر کے دائرہ کی طرف بتدریج بڑھایا۔ اَور قومی مذہب کو بتدریج عالمگیر مذہب میں مُنتقل فرمایا۔ اَور الہام الٰہی کی تدریجی کمالیت کے متعلق خطِ عبرانی کا مُصنف یُوں فرماتا ہے۔ "اگلے زمانے میں خُدا نے باپ دادوں سے حِصّہ بہ حِصّہ اَور طرح بطرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے اس زمانے کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا" (عبرانی ۱: ۲) ۔

عالمگیر مذہب

عالمگیر مذہب وُہ ہوسکتا ہے جو جُغرافیائی حدُود و قیُود سے آزاد ہو۔ تمام نسلوں اَور قوموں کی رُوحانی و اخلاقی زندگی پر یکساں طور پر اثر انداز ہو۔ اَور جس میں من کُل الوجُوہ تمام عالم کے دستُور العمل ہونے کی کامل صلاحیت و قابلیت موجود ہو۔ اَور بنی نوعِ اِنسان کی اخلاقی ضروریات اَور رُوحانی جذبات کی تسکین و آسُودگی کا ضامن ہو۔ اَور کامل تحقیق کے لئے فردِ واحد بھی یہ کہنے کی جُرأت نہ کر سکے کہ اس مذہب میں میری رُوحانی حوائج و ضرُوریات کا جواب نہیں ہے۔ ہم مسیحی مذہب کو اس معنی کا عالمگیر مذہب ادلہ یقینیہ و براہین

شافعیہ و قطعیہ سے ثابت کریں گے۔ ذرا انصاف پروری اور صدق دلی سے تمام دلائل پر غور فرمائیے۔

عہدِ جدید کی بُنیاد عہدِ عتیق پر

عہدِ جدید کی بُنیاد عہدِ عتیق پر رکھی گئی ہے۔ اور نئے عہد کے بانی نے پُرانے عہد کے سلسلے کو توڑا نہیں، بلکہ اُسی کی بُنیاد پر رُوئے زمین کر قومی مذہب کی عمارت کو بتدریج تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اور جہاں عہدِ عتیق کے انبیاء نے اپنا کام چھوڑا تھا، خُداوند مسیح نے اُسی جگہ سے شروع کر کے اُسے قومی دائرہ سے نکال کر بتدریج عمومیت کی طرف ترقّی دی۔ اور جو مخالفین مسیحیّت بربط دھرمی اور تعصب کی سیاہ عینکیں لگا کر اصل حقیقت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے اور یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ خُداوند مسیح نے توریت کو ردّ اور باطل کر دیا ہے۔ یہ اُن کی خوش فہمی ہے۔ اور محض کوتاہ اندیشی ہے۔ اور حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ توریت کی خبر ملاحظہ ہو۔ "دیکھ وہ دن آتے ہیں خُداوند فرماتا ہے۔ جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔" (یرمیاہ ۳۱: ۳۱) پھر اِس آنے والے نئے عہد کی عمومیّت کی خبر پر غور کرو۔ "وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہلِ لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئیں گے اور میرا جلال دیکھیں گے۔" (یسعیاہ ۶۶: ۱۸) الفاظ "وہ دن آتے ہیں" اور "وہ وقت آتا ہے" قابلِ غور ہیں۔ اور یہ اُس آنے والے نئے عہد اور اُس کے ہونے والے بانی کے متعلق صریح پیش خبری ہیں۔ خُدا کے علم و ارادہ میں توریت کا حدِّ رواج مسیح تک تھا۔ "لیکن جب وقت پُورا ہو گیا تو خُدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہوا اور شریعت کے ماتحت پیدا ہوا۔ تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو مول لے اور ہم کو لے پالک ہونے کا درجہ ملے" (گلتی ۴: ۴-۵) اور

لازم تھا کہ عہدِ جدید کا بانی "شریعت کے ماتحت" پیدا ہوتا کہ شریعتِ سابقہ
کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ جو شریعت موسوی کو کامل کرنے آیا تھا وہ پہلے خود اُس کا
پابند ہوا۔ چنانچہ آٹھویں روز اُس کا ختنہ ہوا۔ لوقا ۲ : ۲۱ مطابق احبار
۱۲ : ۳۔ اور مریم مقدسہ شرع موسوی کے مطابق پاک ہونے کے دن پورے
ہونے پر ہیکل میں قربانی چڑھانے گئیں۔ لوقا ۲ : ۲۲-۲۴ مطابق احبار ۱۲ : ۶
-۸ مسیح نے بپتسمہ بھی لیا۔ متی ۳ : ۱۳-۱۷ وہ ہر سال عیدوں کے لئے یروشلیم
کو جایا کرتا تھا۔ لوقا ۲ : ۴۱-۴۲ مطابق خروج ۲۳ : ۱۴-۱۷ وہ ہیکل کا محصول
ادا کرتا تھا۔ متی ۱۷ : ۲۴-۲۷ مطابق خروج ۳۰ : ۱۳ یہودی روزہ رکھتے تھے
مسیح نے بھی چالیس دن روزہ رکھا۔ متی ۴ : ۱، لوقا ۴ : ۲ مطابق احبار ۱۶ : ۲۹
و یسعیاہ ۵۸ : ۳-۷۔ آپ نے ایک کوڑھی کو معجزانہ طور سے شفا دی اور
اُسے موسوی دستور کی ہدایت فرمائی۔ متی ۸ : ۱-۴ مطابق احبار ۱۴ : ۱-۷ اور
آپ نے اپنی خدمت کے آغاز ہی میں فرمایا "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں
کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا (کامل) کرنے آیا
ہوں"۔ متی ۵ : ۱۷ چنانچہ آپ نے شریعت موسوی کی تکمیل فرمائی اور اُس
کو قومی دائرہ سے نکال کر عالمگیر وسعت دی۔ اُس کی تردید و تنسیخ نہیں بلکہ
تکمیل فرمائی اور اُس کو انفرادی خصوصیت سے نکال کر عمومیت میں تبدیل
کیا۔ اور تمام اقوامِ عالم کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت اُس میں پیدا
کردی۔ جس طرح ایک گورنر کا رعب و اقتدار اور حکومت و اختیار صرف ایک
ہی صوبہ تک محدود و مختص ہوتا ہے۔ اور اُس کے اپنے صوبہ سے باہر اُس کے
احکام و قوانین کچھ اثر نہیں رکھتے۔ اسی طرح موسوی شرائع و احکام کا دائرہ
اثر صرف یہودی قوم تک ہی محدود تھا۔ اور یہودیت کے باہر انبیاء کے

قوانین اور اُن کی آواز کا کچھ اثر نہ تھا۔ تعزیراتِ پاک و ہند کے قوانین و دفعات صرف ان ممالک کی حدود کے اندر ہی زور رکھتے ہیں۔ اور فرانس جرمنی اور امریکہ کے لوگوں سے اُن کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شریعتِ موسوی تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی بنفسہٖ کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور خداوند مسیح کی آمد اور ظہور کا سب سے اعلےٰ مقصد یہی تھا کہ مذہب الٰہی عالمگیر ہو جائے۔ چونکہ خدا تمام دُنیا کا واحد مالک اور شہنشاہ ہے اس واسطے مسیح شریعت کو جو مختص بالقوم و الزمان ہونے کے باعث کمزور اور ادھوری تھی کامل کرنے آیا۔ اور فرمایا کہ "میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا (کامل) کرنے آیا ہوں"۔ ہم آگے چل کر اچھی طرح دکھائیں گے کہ توریت کی تکمیل مسیح نے کس صورت میں فرمائی۔ اور کس طرح قومی مذہب کو عالمگیر مذہب کی صورت دے دی ۔

توریت کا تجزیہ

توریت کا تجزیہ کیا جائے تو اُس میں تین قسم کے مضامین دستیاب ہوتے ہیں۔ اوّل۔ احکام۔ دوم۔ اخبار۔ سوم تعلیم۔

احکام کی دو قسمیں ہیں:۔ یعنی امر اور نہی۔ امر وہ احکام ہیں جن پر عمل کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔ مثلاً "تو سبت کا دن پاک ماننا"۔ "تو اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزت کرنا"۔ وغیرہ اس قسم کے تمام احکام کو اوامر کہتے ہیں۔ اور نہی وہ احکام کہلاتے ہیں، جن میں کسی کام کے کرنے کی ممانعت پائی جائے۔ مثلاً "تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔ نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔ تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا"۔ وغیرہ اس قسم کے امتناعی احکام کو نواہی کہتے ہیں پھر اخبار تین قسم کی ہیں۔ یعنی حال کی۔ ماضی کی۔ اور مستقبل کی۔

اوّل۔ اخبار حال وہ ہیں جو موسیٰ اور دیگر انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں واقعات موجودہ اور تجاربِ مشہودہ کی بنا پر لکھیں۔

دوئم۔ اخبار ماضی۔ جیسے موسیٰ نے دُنیا کی پیدائش۔ آدم کی نافرمانی و اخراج از جنت العدن۔ اور طوفانِ نوح کے واقعات لکھے۔ اور ان اخبارِ سابقہ کو الہام الٰہی کی روشنی میں قلمبند کیا۔

سوئم۔ اخبار مستقبل۔ جیسے موسیٰ اور اس کے ماقبل و مابعد کے انبیاء نے خداوند مسیح کے متعلق خبریں دیں۔ یہ خبریں انبیاء خُدا سے حاصل کر کے بوساطت الہام لکھتے تھے۔ اور انہیں کو پیشین گوئی کہتے ہیں۔ اوامر و نواہی اور اخبار باقسام ثلثہ تو تمام صحائف عتیقہ و جدیدہ کو من حیث المجموعہ شامل ہیں۔ یعنی انجیل میں بھی توریت کی طرح موجود ہیں لیکن احکام ہی دو طرح کے ہیں جو صرف توریت ہی سے متعلق ہیں یعنی ۱۔ احکام خاص اور احکام عام۔ اب ہم ان کا مفصل بیان کریں گے ۔۔

احکامِ خاص

قربانیاں۔ ختنہ۔ روزہ۔ نذریں۔ طہارتِ بدنی۔ سبت۔ عیدیں اور حلت و حرمت وغیرہ جو سب ہیکل کے ساتھ متعلق تھے۔ اور حکام و قضاۃ و شاہان بنی اسرائیل کے متعلق سیاسی قوانین و فرائض سب احکام خاص میں شامل ہیں۔ اور شرائع رسمی و ملکی ان ہی سے متعلق تھیں۔ ان کا تعلق صرف قوم اسرائیل کے ساتھ تھا۔ دیگر اقوام میں نہ تو کبھی ان کی ترویج کی کوشش کی گئی اور نہ ایسا کرنے کا کوئی حکم ہی تھا۔ احکام خاص اپنی ذات اور مقصد میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت ہی نہ رکھتے تھے۔ ان کا تعلق صرف یہودی مذہب۔ تمدن و معاشرت اور قومیت سے تھا۔ مثلاً عیدیں یہودی تاریخ کے خاص واقعات کی یادگاریں تھیں۔

یہودیت سے باہر کی دُنیا کو اُن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اُس کی
تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں۔ مثلاً ایک فوجی آدمی اگر اپنے لباس پر تمغے
لگاتا ہے تو وہ اُس کی جنگی زندگی کے واقعات کی یادگاریں اور نشانیاں ہیں۔
اگر دُوسرے لوگ جن کو محاربہ و مکابرہ سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا اُس فوجی
کی دیکھا دیکھی اپنے لباس پر تمغے لگالیں تو وہ بے مطلب اور بے معنی ہوں گے۔
فوجی لوگوں کے چند خاص ظاہری امتیازات ہوتے ہیں، جن کے باعث وہ
عوام النّاس سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور وہ امتیازی علامات اُن ہی کے لئے
خاص ہوتی ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے لیے۔ اسی طرح توریت کی رسمی و ملکی شرائع
یہودیت کو اُس وقت کی تمام دیگر اقوام سے ممتاز کرتی تھیں۔ اور دُوسری وجہ
احکام خاص کے نفاذ کی یہ تھی، کہ اِن ظاہری اور جسمانی قوانین کے ذریعے اُن میں،
الٰہی متابعت و فرمانبرداری کی رُوح پیدا کی جائے۔ یہ گویا ایک ابتدائی تربیت
تھی۔ اور اس تربیتِ اوّل سے منتہائے مقصود یہ تھا کہ اخلاقی و رُوحانی شریعت
کی پابندی کرنا سیکھیں۔ جیسے حرُوفِ تہجی بچّوں کو محض اس لئے سکھائے جاتے
ہیں کہ اُن کے ذریعے وہ کسی وقت اعلیٰ علمی کتابیں پڑھ سکیں۔ اسی طرح احکامِ
خاص بھی اُس قوم کے لئے بطور ابتدائی سبق کے تھے۔ اور جب کوئی طالبِ علم
مولوی فاضل بن جاتا ہے تو پھر اُسے حرُوفِ تہجی پر مغز مارنے کی ضرورت نہیں
رہتی۔ اور قاعدۂ حرُوفِ تہجی کے متروک ہونے سے وہ قاعدہ ردّ و باطل نہیں ہو
جاتا بلکہ جس حد تک پہنچانا اُس کا مقصُود تھا اُس تک پہنچ کر اُس کی ضرورت
نہیں رہتی۔ اسی طرح احکامِ خاص اعلیٰ اخلاقی و رُوحانی شریعت تک پہنچا کر
متروک العمل ہو گئے۔ اور پھر پھر کر اُن کی رَٹ لگانا ایسا ہی عبث ہے جیسے
کوئی مولوی فاضل ہو کر دوبارہ حرُوفِ تہجی کی مشق شروع کرے۔ چراغ کی ضرورت

اُس وقت تک ہُوا کرتی ہے جب تک آفتاب طلُوع نہ ہو لیکن آفتاب کی آمد سے چراغ ردّ و باطل نہیں ہو جاتا بلکہ اُس کی ضرُورت نہیں رہتی۔ پس سُورج کی موجودگی میں بتّی کے چراغ جلانا نادانی ہے۔ "اور ہمارے پاس نبیوں کا وہ کلام ہے جو زیادہ مُعتبر ٹھہرا اور تم اچھا کرتے ہو جو یہ سمجھ کر اُس پر غور کرتے ہو کہ وہ ایک چراغ ہے جو اندھیری جگہ میں روشنی بخشتا ہے۔ جب تک پَو نہ پھٹے اور صُبح کا ستارہ تمہارے دلوں میں نہ چمکے" (۲ پطرس ۱: ۱۹) اور وہ شرعی زمانہ مذہبِ الٰہی کی طفولیّت کا زمانہ تھا۔ اور خُداوند مسیح نے اُسی کو شباب کے عہد تک پہنچایا۔ "جب میں بچہ تھا تو بچّوں کی طرح بولتا تھا۔ بچّوں کی سی طبیعت تھی۔ بچّوں کی سی سمجھ تھی۔ لیکن جب جوان ہُوا تو بچپن کی باتیں ترک کر دیں" (۱۔کرنتھی ۱۳: ۱۱) "پس شریعت مسیح تک پہنچانے کو ہمارا اُستاد بنی۔ تاکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں۔ مگر جب ایمان آ چکا تو ہم اُستاد کے ماتحت نہ رہے" (گلتی ۳: ۲۴-۲۵) اب ذرا تفصیل کے ساتھ دکھایا جائے گا کہ کس طرح احکامِ خاص کا تکملہ عہدِ جدید میں آ کر ہو گیا۔ اور شرعِ رسمی میں سے چند بڑی بڑی رسُوم کو لے کر انجیلِ مُقدّس میں اُن کی تکمیل دکھائی جائے گی۔ یعنی اُس آغاز کا انجام دکھایا جائے گا۔ اُس خواب کی تعبیر پیش کی جائے گی۔

قُربانیاں لفظ قُربانی کا مادّہ قُرب (نزدیکی) ہے یعنی قُربانی ایک ایسا شرعی فعل ہے جس کے ذریعے انسان خاطی و عاصی تقرّبِ الٰہی کو حاصل کر سکے۔ شرعِ مُوسوی میں بنی اسرائیل قوم کو قُربانی چڑھانے کے خاص احکام تھے۔ اور وہ بموجب فرمانِ الٰہی پانچ قسم کی قُربانیاں گُذرانتے تھے۔ احبار کی کتاب میں اُن کا مُفصّل بیان مل سکتا ہے۔

واضح ہو کہ انسان اِس دُنیا کی کسی بھی شئے کا مالک نہیں بلکہ مُختار ہے۔ اور

خُدا سب دُنیا کا واحد مالک ہے "زمین اور اُس کی معموری خُداوند ہی کی ہے۔ جہان اور اُس کے باشندے بھی" (زبُور ۲۴: ۱) "اور ہزاروں پہاڑوں کے چوپائے میرے ہی ہیں۔ مَیں پہاڑوں کے سب پرندوں کو جانتا ہُوں۔ اور میدان کے درندے میرے ہی ہیں۔ اگر مَیں بھُوکا ہوتا تو تُجھ سے نہ کہتا۔ کیونکہ دُنیا اور اُس کی معموری میری ہی ہے" (زبُور ۵۰: ۱۰-۱۲) اور انسان کے قبضے میں اِن اشیاء کی ذاتوں کے منافع اور فوائد ہی ہیں۔ اور انسان کو یہی حُکم تھا کہ ان جانوروں کی ذاتوں کے فوائد کو قُربان کرے۔ اور چُونکہ اُن کی ذات کے فوائد کو قُربان کرنے کے لئے اُن کو ذبح کرنا پڑتا تھا، اور بغیر ذبح کئے وہ فوائد عقیدت الٰہی کے مذبح پر قُربان نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اِس واسطے قُربانی کے لئے جانور ذبح کیے جاتے تھے، اور یہ ایک طرح کا ایثار تھا جو وہ خُدا کے حُکم کے مُطابق اُس کی خُوشنُودی و رضاجوئی کے لئے کرتے تھے۔ اور اس سے مقصُود یہ تھا کہ تقربِ الٰہی کے حصُول کی خاطر ان معمولی منافع کو قُربان کرتے کرتے اُن میں خُدا کی مُحبت یہاں تک بڑھ جائے کہ کسی وقت وہ اپنی جان بھی اُس کی خاطر قُربان کر دینے میں دریغ نہ کریں۔ اور ایک طرف تو خود انکاری و ایثار کی رُوح اُن میں پیدا ہو جائے۔ دُوسری طرف وہ یہ احساس کرنے لگ جائیں کہ خُدا کی شریعت کا عدُول کرنے سے جو موت اُنہوں نے کمائی وہ جانوروں پر وارد ہو رہی ہے۔ اور خُدا ہماری جانوں کو اِس قدر عزیز رکھتا ہے کہ ان بیگناہ جانوروں کی جانوں کو ہماری جانوں کا مُبادلہ ٹھہراتا ہے۔ تو بھی "مُمکن نہیں کہ بَیلوں اور بکروں کا خُون گُناہوں کو دُور کرے" (عبرانی ۱۰: ۴) "بلکہ وہ قُربانیاں سال بسال گُناہوں کو یاد دِلاتی ہیں" (عبرانی ۱۰: ۳) چُونکہ خُدا عادل ہے، اور عدل کا تقاضا ہے کہ جان کے بدلے جان لی جائے۔ اِس لئے

عارضی طور پر یہ حیوانی مجازی قربانیاں مسیح کی حقیقی قربانی کے ایماء کے طور پر قائم رہیں۔ اور جب خداوند مسیح نے حقیقی اور اصلی قربانی دے دی تو ان مجازی قربانیوں کا رواج اسی وقت سے بند ہو گیا۔ اور موسوی قربانیاں مسیح کی قربانی کی ایک تمثیل ہی تھیں۔ "کیونکہ شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کا عکس ہے اور ان چیزوں کی اصلی صورت نہیں" عبرانی ۱۰:۱ ۔

اگر بالفرض محال حیوانی قربانی عدلِ الٰہی کے تقاضا کو پورا کر سکتی ہے تو سوال لازم آتا ہے کہ قربانی سے عابد کو فائدہ پہنچتا ہے یا معبود کو اور یا مذبوح کو؟ اگر کہا جائے کہ عابد کو۔ تو یہ خلافِ انصاف ہے۔ کیونکہ مجرم کو فائدہ پہنچانا عدل نہیں۔ بلکہ از روئے عدل مجرم کو نقصان کا متحمل ہونا لازمی ہے۔ اور جبکہ گناہ کے باعث مجرم انسان سزائے موت کا مستحق ہے۔ (رومی ۶:۲۳) تو اس کی جان کا مبادلہ حیوان کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ بھی عدل کو پورا نہیں کرتا۔ اور پھر جانور کسری طور پر قربان کیا جاتا ہے۔ اور فعل کسری نہ تو نیک ہو سکتا ہے نہ بد۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک خونی کی جان کے عوض میں سرکار کو ایک بکرا یا بیل پیش کیا جائے۔ اور اگر کہا جائے کہ قربانی سے خدا کو فائدہ پہنچتا ہے تو یہ اس کی ذات بے نیاز و لااحتیاج کے منافی ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔ وہ غنی ہے اس لئے اس کو کسی فائدہ کے حصول کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ جانور کی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے تو یہ خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ ہلاکت کسی ذی جان کے لئے فائدہ مند ہو نہیں سکتی۔ اور اگر کہا جائے کہ قربانی سے کسی کو بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا، تو اس صورت میں قربانی ایک فضول اور بے بنیاد کام ٹھہرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیوانی قربانی اگر خداوند مسیح کی حقیقی و اخلاقی قربانی کی علامت نہ سمجھی جائے تو وہ ظلم و تشدد کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور خداوند مسیح کی آمد پر قربانیوں

کے رواج بند ہو جانے کی خبر خود عہدِ عتیق میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو " اور باسٹھ ہفتوں کے بعد مسیح قتل کیا جائے گا۔ اور وہ ایک ہفتہ کے لئے بہتوں سے عہد قائم کرے گا۔ اور نصف ہفتہ میں ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا" (دانی ایل ۹: ۲۶-۲۷)۔ جس طرح موسم برسات کی بافراط و بہتات بارشیں فصلوں کو چاہی آبپاشی کی طرف سے بے نیاز کر دیتی ہیں، اور پھر آبپاشی کے محدود انسانی ذرائع بند ہو جاتے ہیں، اسی طرح مسیح کی حقیقی اور کامل قربانی کے بعد پھر کسی حیوانی قربانی کی ضرورت نہ رہی۔ جانور کی قربانی کسری اور مجہول ہوتی تھی۔ اور خداوند مسیح کی قربانی اختیاری اور معصوم قربانی ہے۔ آپ کا فرمان ملاحظہ ہو۔

" باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ تاکہ اُسے پھر لے لوں۔ کوئی اُسے مجھ سے چھینتا نہیں۔ بلکہ میں اُسے آپ ہی دیتا ہوں۔ مجھے اُس کے دینے کا بھی اختیار ہے، اور اُسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا" (یوحنا ۱۰: ۱۷-۱۸)۔

ختنہ ختنہ کا آغاز ابراہام سے ہوا۔ خدا تعالے نے اُس کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ اور ختنہ اُس عہد کے لئے بطور ایک نشان کے ٹھہرایا۔ خداوند نے ابراہام سے فرمایا۔ " اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے۔ اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے" (پیدائش ۱۷: ۱۰-۱۱) اور ختنہ کا حکم صرف بنی اسرائیل کے ساتھ ہی خاص تھا۔ ابراہام کی نسل سے باہر کسی اور قوم کو اُس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں۔ بلکہ اقوام کی تفریق تو نوح کے بیٹوں سِم۔ حام اور یافت ہی سے

ہو جاتی ہے۔ صِرف یہُودی قوم ہی ابراہام کی نسل تھی۔ اِس لئے ختنہ کا حُکم
صِرف اُسی کے لئے دِیا گیا تھا۔ اور اِس رَسم کا رُوحانی مطلب بھی توریت میں
بدیں الفاظ موجود ہے۔ "پس اپنے دِلوں کا ختنہ کرو اور آگے کو گردن کش نہ
رہو" (استثنا ۱۰: ۱۶) "اور خُداوند تمہارا خُدا تمہارے اور تمہاری اولاد کے
دِل کا ختنہ کرے گا" (استثنا ۳۰: ۶ و یرمیاہ ۴: ۴) اگرچہ وعدے کی نسل
ہونے کے سبب سے یہُودی قوم کے لئے ختنہ لازمی تھا۔ لیکن اگر تمام
دُنیا کی اقوام کے لئے ختنہ کا حُکم خُدا ہو سے تو وہ رُوحانی معنی میں ہی
ہو سکتا ہے۔ اور ختنہ کا رُوحانی مفہوم ہی دِل کی غلاظت کو کاٹ پھینکنا
تھا۔ رُوحانی مفہوم و مطالب کا محسوسات و جسمانیات کے پیرایہ میں
متمثل ہونا کوئی امرِ جدید اور دُور از فہم بات نہیں۔ پولُس رسُول فرماتا ہے
"کیونکہ وہ یہُودی نہیں جو ظاہر کا ہے۔ اور نہ وہ ختنہ ہے جو ظاہری و جسمانی ہے۔
بلکہ یہُودی وُہی ہے جو باطن میں ہے۔ اور ختنہ وُہی ہے جو دِل کا اور رُوحانی ہے
نہ کہ لفظی" (رومیوں ۲: ۲۸-۲۹) "نہ ختنہ کوئی چیز ہے نہ نامختونی۔ بلکہ نئے سِرے سے
مخلوق ہونا" (گلتیوں ۶: ۱۵ و ۱ کرنتھیوں ۷: ۱۹ و گلتیوں ۵: ۲-۳ و کلسیوں ۲: ۱۱) ختنہ
بعض حالتوں میں طبّی لحاظ سے مُفید ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی رُوحانی
فائدہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مختون اور نامختون ہر دو قسم کے لوگ دُنیا میں
موجود ہیں اور دونوں فریق گُناہ کے ماتحت ہیں۔ اگر ختنہ سے رُوحانی و
اخلاقی زندگی کی اصلاح و بہبود ممکن ہوتی تو لازم تھا کہ مختون بلحاظ رُوحانیت
و پاکیزگی کے نامختونوں سے بدرجہا افضل ہوتے۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف
ہے۔ خُداوند مسیح کا ختنہ ابراہام کی نسل ہونے کے سبب ہُوا لیکن غیر یہُودی
چونکہ ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں اِس لئے اُن پر ختنہ کروانا لازمی نہیں ہے

اِسی واسطے مسیحیت کے قیام پر ختنہ موقوف ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ نئے عہد میں بپتسمہ کی رسم قائم ہوئی۔ (متی ۲۸ : ۱۹)

سبت آفرینشِ عالم کے عظیم الشان اور لاثانی واقعہ کی یادگار کے طور پر سبت کو مُقدّس ٹھہرایا گیا۔ اُس روز خُدا نے تمام بے جان اور جاندار۔ دیدنی اور نادیدنی اشیاء کو بنا کر فراغت پائی۔ (پیدائش ۲ : ۳) اور خُدا نے سبت کا دِن شریعت میں دو وجوہات کے ماتحت شامل کیا۔

اوّل۔ سبت کو آفرینشِ عالم کی یادگار ٹھہرانے اور شریعت میں داخل کرنے سے خُدا کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ مابعد زمانوں میں اِس دُنیا کی علّتِ فاعلی کسی وہمی ہستی کو نہ ماننے لگ جائیں۔ اور خیالاتِ باطلہ و توہّماتِ مظنونہ میں نہ پھنس جائیں۔ بلکہ جب جب سبت کو منائیں تو یاد کریں کہ یہ وہ دِن ہے، جس دِن خُدا نے تخلیقِ عالم سے فراغت پائی تھی۔ "ایمان ہی سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ تمام عالم خُدا کے کہنے سے بنے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو" (عبرانی ۱۱ : ۳)

دوم۔ سبت کے دِن کو مُقدّس ٹھہرانے کی دُوسری وجہ یہ تھی کہ قوم اسرائیل دُنیوی دھندوں اور فکروں و جھگڑوں میں یہاں تک نہ پھنس جائے کہ خُدا کی یاد ہی بسر جائے۔ اِس واسطے مصلحتًا پابندی اور عبودیت کی رُوح اُن میں پیدا کرنے کے لئے یہ خاص دِن اُن کے واسطے جسمانی دھندوں سے فراغت پانے اور عبادت میں صرف کرنے کے لئے مُقرّر کیا گیا لیکن جو شخص سیدھی اور صاف نیّت سے خُدا کی عبادت نہیں کرتا اُس کے لئے سبت اور باقی سب دن برابر ہیں۔ یہودیوں میں سبت کے متعلق ایسی سُوءِ عقیدت پیدا ہو گئی کہ وہ اُس روز میں نیکی کرنا بھی گُناہ سمجھنے لگے۔ اِسی

واسطے خداوند مسیح نے بارہا اُن کے اِس غلط خیال کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور ایک دفعہ فرمایا۔ "میں تم سے پوچھتا ہوں کہ آیا سبت کے دن نیکی کرنی روا ہے یا بدی کرنی؟ جان کو بچانا یا ہلاک کرنا۔" (لوقا ۶: ۹) اور جب آپ نے اُس مریض کو تندرست کر دیا تو "وہ آپے سے باہر ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم یسوع کے ساتھ کیا کریں؟" (آیت ۱۱) ایک اور موقع پہ مسیح نے سبت کے روز ایک کُبڑی عورت کو جو ۱۸ برس سے کسی بد رُوح کے باعث مریض تھی شفا بخشی تو عبادت خانے کا سردار ناراض ہو کر کہنے لگا۔ "چھ دن ہیں جن میں کام کرنا چاہیئے۔ پس اُن ہی میں آ کر شفا پاؤ نہ کہ سبت کے دن۔" لوقا ۱۳: ۱۴) وہ سبت کے روز سُوئی تک کو ہاتھ لگانا بھی گُناہ سمجھتے تھے۔ اُن کی سُوءِ عقیدت اور فضول نمائش کو مٹانے کے لئے مسیح کے زندہ ہو کر صعود فرمانے کے بعد رسُولی عہد میں سبت کی جگہ ہفتے کا پہلا دن (اتوار) مقرر ہُوا۔ اور جس طرح سبت آفرینش عالم کے عدیم النظیر واقعہ کی یاد دِلاتا ہے۔ اِسی طرح ہفتے کا پہلا دن مسیح کے گناہ موت اور قبر پر فوق الفطرت طاقت سے غالب آنے کی فقید المثل واقعہ کی یادگار ٹھہرا۔ سبت وُہ دن ہے جو تمام دُنیا میں زندگی کا مبداء سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اُس روز خُدا تعالےٰ نے تاثیب گیتی میں شرح تخلیق کے کام کو تمام کیا۔ اور ہفتے کا پہلا دن وُہ ہے جس میں انسان بلکہ تمام مخلوقات کو گناہ موت اور ظلمات وفنا کے قبضہ سے چھڑا کر کھوئی ہُوئی زندگی کو پھر سے بحال کیا گیا۔ (رُومیوں ۸: ۲۰-۲۱) اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔ "سبت آدمی کے واسطے بنا ہے نہ آدمی سبت کے واسطے۔ پس ابنِ آدم سبت کا بھی مالک ہے۔" (مرقس ۲: ۲۷-۲۸) اور صرف سبت کے روز ہی عبادت کو کافی نہیں ٹھہرایا بلکہ فرمایا۔ "ہر وقت دُعا مانگتے رہنا اور ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔" لوقا ۱۸: ۱۔ اور ہر وقت اور ہر طرح سے رُوح میں دُعا

اور منت کرتے رہو۔ اور اسی غرض سے جاگتے رہو کہ سب مقدسوں کے واسطے بلاناغہ دعا مانگا کرو۔" (افسی ۶ : ۱۸)۔ اگر اب کوئی سبت کے دن کو دنیا کی تخلیق کی یادگار سمجھ کر اُس کی تعظیم کرے تو اس میں کوئی بُرائی نہیں۔ پر یہودیوں کی طرح اُس کی سطحی و ظاہری پابندی جس میں نیکی کرنا بھی گناہ میں داخل ہے سراسر معیوب ہے۔ اس لئے سبت تمام عالم کا دستور العمل ہونے کے ناقابل ہے۔ اسی لئے پولوس رسول فرماتا ہے۔ "پس کھانے پینے یا عید یا نئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں۔" (کلسی ۲ : ۱۶ اور گلتی ۴ : ۹-۱۰)۔ خداوند مسیح نے سارے دن پاک رکھنے اور ان میں عبادت کرنے کی تاکید فرمائی۔ پس سبت کی کوئی خصوصیت نہ رہی :

ظاہری طہارت شریعت موسوی میں بدنی طہارت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو (گنتی ۱۹ : ۷-۲۲) اور اس ظاہری و جسمانی طہارت سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ وہ لوگ باطنی اور روحانی پاکیزگی کے طالب ہوں۔ اور اُس کے لئے کوشش کریں۔ اگرچہ جسم کی صفائی، تندرستی و صحت کے زاویۂ نظر سے نہایت ضروری و لازمی ہے اور اس کی صفائی سے خدا ناراض نہیں ہوتا۔ اور بلکہ خوش ہوتا ہے۔ تاہم روحانی زندگی کے ارتقا میں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ باطنی پاکیزگی وہ ہے جس کے لئے داؤد نبی خدا سے یوں التجا کرتا ہے۔

"اے خدا! میرے اندر پاک دل پیدا کر اور میرے باطن میں از سرِ نو مستقیم روح ڈال۔" (زبور ۵۱ : ۱۰) اگرچہ ہندو لوگ تیرتھوں پر جا کر باطنی پاکیزگی کی بے کار اور موہوم اُمید پر اشنان وغیرہ کرتے ہیں۔ تو بھی تیرتھ اشنان کرنے والوں اور نہ کرنے والوں میں بلحاظ پاکیزگی کوئی مابہ الامتیاز نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر دو قسم کے لوگ گناہ کی غلامی میں خوب پھنسے ہوئے ہیں۔ کہنیوں تک ہاتھ دھونے۔ وضو کرنے۔

اور اشنان کرنے سے باطنی طہارت ناممکن ہے۔ اسی واسطے جب ظاہر دار فقیہ
و فریسی خداوند مسیح کے سامنے اُس کے شاگردوں کی یوں شکایت کرنے لگے
کہ "تیرے شاگرد بزرگوں کی روایت کو کیوں ٹال دیتے ہیں کہ روٹی کھاتے وقت ہاتھ
نہیں دھوتے" (متی ۱۵: ۲) تو خداوند مسیح نے اُنھیں یوں جواب دیا کہ "جو چیز
مُنہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو مُنہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک
کرتی ہے" (آیت ۱۱) اور شاگردوں کی فرمائش پر اپنے جواب کی یوں تفصیل فرمائی
"جو کچھ مُنہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا اور پاخانے میں نکل جاتا ہے۔ مگر جو باتیں
مُنہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے
خیال۔ خُون ریزیاں۔ زناکاریاں۔ حرامکاریاں۔ چوریاں۔ جھوٹی گواہیاں۔ بدگوئیاں
دل ہی سے نکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ مگر بغیر ہاتھ دھوئے
کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا" (متی ۱۵: ۱۷-۲۰ و مرقس ۷: ۱۸-۲۲) اور
فقیہوں اور فریسیوں کی ظاہرداری و تصنع کے خلاف بہت ملامت کی۔
"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پیالے اور رکابی کو اُوپر سے
صاف کرتے ہو۔ مگر وہ اندر لُوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں" (متی ۲۳: ۲۵
و ۲۶-۲۸) تمام اناجیل باطنی طہارت اور اندرونی پاکیزگی کی تعلیم و تلقین سے
مملُو ہیں۔ بلکہ اگر یُوں کہیں تو زیادہ حق ہوگا کہ مسیح کی تعلیم کا تمام تر مقصود
مُدعا ہی باطنی پاکیزگی تھا۔ پس مسیح کی کامل شریعت کی آمد سے توریت کی ظاہری
اور ادھوری شریعت خود بخود متروک ہو گئی۔ اور جس اعلیٰ مقصد کی انجام
دہی کے لیے خدا نے وہ ابتدائی اور ناکامل شریعت دی تھی اُس نے مسیح کی کامل
واکمل شریعت کے ذریعے تکمیل پائی۔ اور وہ مختص بالقوم و زمان شرع (احکام
خاص) عالمگیر اور ابدی و دائمی شرع کی آمد پر متروک العمل ہو گئی۔ کیونکہ وہ

"صرف کھانے پینے اور طرح طرح کے غسلوں کی بناء پر جسمانی احکام ہیں جو اصلاح کے وقت تک مقرر کئے گئے ہیں" عبرانی ۹: ۱۰- خداوند مسیح کی کامل شریعت کا حکم طہارتِ باطنی کے متعلق ملاحظہ ہو۔ "پس اے عزیزو! چونکہ ہم سے ایسے وعدے کئے گئے۔ تو آؤ۔ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی اور روحانی آلودگی سے پاک کریں۔ اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں" (۲ کرنتھی ۷: ۱)۔

حلت و حرمت توریت میں بعض اشیاء کھانے پینے کے لحاظ سے حلال اور بعض حرام ٹھہرائی گئی تھیں (استثناء ۱۴: ۳-۲۱) امورِ معاشرت میں حلال و حرام اور پاک و ناپاک کے متعلق اوامر و نواہی خدا نے دو اعلےٰ روحانی مقاصد کے ماتحت فرمائے۔ اول یہ کہ وہ منازلِ جسمانیہ سے شروع کر کے بتدریج منازلِ روحانیہ کی طرف قدم اٹھائیں۔ ادنےٰ سے آغاز کر کے اعلےٰ کی طرف بڑھنا سیکھیں۔ اور جسم سے شروع کر کے روح کی طرف بڑھیں۔ حرام کا روحانی مفہوم گناہ اور حلال کا روحانی مطلب نیکی و پاکیزگی ہے۔ "بدی سے نفرت رکھو نیکی سے لپٹے رہو" (رومی ۱۲: ۹) دوم یہ کہ خدا کی برگزیدہ قوم اور غیر اقوام میں امتیاز نظر آئے۔ اور رفتہ رفتہ روحانی و اخلاقی امتیاز جسمانی اور معاشرتی امتیازات کی جگہ لے لے۔ اور کسی وقت وہ روحانی امتیاز خصوصیت کی قیود سے نکل کر عمومیت میں منتقل ہو جائے "تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔ تاکہ لوگ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں" (متی ۵: ۱۶) "بے ایمانوں کے ساتھ ناہموار جوئے میں نہ جتو۔ کیونکہ راستبازی اور بے دینی میں کیا میل جول؟ یا روشنی و تاریکی میں کیا شراکت؟ مسیح کو بلیعل کے ساتھ کیا موافقت؟ یا ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا واسطہ؟ اور خدا کے مقدس کو بتوں سے کیا مناسبت ہے؟" (۲ کرنتھی ۶: ۱۴-۱۶) یہ امتیاز

تھا جو اُس معاشرتی و جسمانی امتیازات کی جگہ لینے والا تھا۔ اسی واسطے حِلّت و حُرمت کے قومی اور زمانی احکام کا باطنی اور رُوحانی مفہوم خداوند مسیح نے یُوں ظاہر فرمایا "جو چیز مُنہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو مُنہ سے نکلتی ہے وُہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے۔" (متی ۱۵ : ۱۱) مُقدّس پطرس رسُول نے بھی توریت کے حُکم کے مطابق خدا کی اُتاری ہوئی چیزوں میں حلال و حرام کا امتیاز ظاہر کیا تھا۔ لیکن خدا نے فرمایا "کہ جس کو خدا نے پاک ٹھہرایا ہے تو اُنھیں حرام نہ کہہ۔" (اعمال ۱۰ : ۱۱ - ۱۵) قابلِ غور امر یہ ہے کہ جب خدا خود پاک ہے تو اُس نے ناپاک چیزیں کیسے پیدا کر دیں؟ کیا کبھی سُورج سے تاریکی برآمد ہو سکتی ہے؟ ایک نقیض دُوسرے نقیض کی علّت ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا جب خدا پاک ہے تو اُس نے کوئی شئے بذاتہٖ ناپاک پیدا نہیں کی۔ اور حِلّت و حُرمت کے احکام کا نفاذ محض فرمانبرداری اور پابندی کی رُوح بنی اسرائیل میں پیدا کرنے کی غرض سے ہُوا تھا۔ مُقدّس پولُس رسُول فرماتا ہے "خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شُکرگُزاری کے ساتھ کھائی جائے۔" (۱ تمتھیُس ۴ : ۴) کوئی بذاتہٖ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔" (رُومی ۱۴ : ۱۴) پھر فرماتا ہے "کھانا ہمیں خدا سے نہیں ملائے گا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں۔" (۱ کرنتھی ۸ : ۸) "کیونکہ خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو رُوح القُدس کی طرف سے ہوتی ہے۔" (رُومی ۱۴ : ۱۷) البتہ اگر ہمارے کھانے پینے سے کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہو تو اس نیت سے کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے اور محبت کا قاعدہ نہ ٹوٹے احتیاط

لازمی ہے (رومی ۱۴: ۱۵ و ۱ کرنتھی ۸: ۱۳) "کیونکہ ساری شریعت پر ایک ہی سے پورا عمل ہو جاتا ہے۔ یعنی اِس سے کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ (گلتی ۵: ۱۴)"

روزہ جس رُوحانی مقصد سے روزہ کا حکم قوم یہود کو دیا گیا وہ بہت تھا۔ اِس میں ایک تو عابد کے جسمانی ایثار کی علامت پائی جاتی ہے۔ عابد اپنے معبودِ حقیقی کے عشق و محبت میں یہاں تک محو ہو جاتے کہ کوئی جسمی فکر اُس کی اِس عقیدت و محبت پر غالب نہ آسکے۔ بلکہ اگر اُس کو اپنی تمام لذائذ و حظائظِ نفسانی اور آرائش و زیبائشِ جسمانی اپنے محبوبِ حقیقی کی قربان گاہ عقیدت و محبت پر نثار کرنی پڑ جائیں تو مطلق دریغ نہ کرے اور وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ "آدمی صرف روٹی سے جیتا نہیں رہتا۔ بلکہ ہر بات جو خدا کے مُنہ سے نکلتی ہے" (متی ۴: ۴) دوم یہ کہ بعض دفعہ عابد اپنے معبود کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کوئی گناہ کر کے اُس کی ناراضگی کو محسوس کرتا ہے اور اُس کی ناراضگی کے باعث طبیعت میں بے چینی۔ اضطراب اور قلق اِس درجہ بڑھ جاتا ہے۔ کہ کھانا پینا قدرتی طور پر اچھا نہیں لگتا۔ اور انسان خور و نوش اور آسائش و زیبائش کو یکسر ترک کر کے سوگوار حالت میں بیٹھتا ہے جیسے داؤد نبی سے جب خلاف مرضیِ خدا گناہ مرزد ہوا اور اُس نے خدا کی ناراضگی کو محسوس کیا، تو نہایت غمگین اور بے چین ہو کر روزہ رکھا اور تخت کو چھوڑ کر ٹاٹ اوڑھا اور فرش پر پڑا رہا۔ (۲ سموایل ۱۲: ۱۶-۱۷ و یوناہ ۳: ۵) سوم حضرت ابو البشر (آدم) کے گناہ میں گر جانے کے باعث تمام بنی آدم موروثی ناپاکی میں مُبتلا ہیں۔ اور گناہ تمام دُنیا پر مرض کی طرح غالب ہے۔ اور اِس مرض نے زندگی کے شیریں چشمہ کو کڑوا کر دیا ہے۔ اور انسان اپنی ذاتی کوشش و تدبیر

سے پاک بننے میں قطعی قاصر ہے۔ اِس واسطے جب تک اُن کے پاس مرضِ رُوحانی کا کوئی حکیم و شافی ظاہر نہ ہو تب تک مریضانِ گُناہ کا غمگین حالت میں رہنا اور روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اور مرض کی حالت میں ویسے بھی کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ اور خُداوند تعالےٰ نے زکریاہ نبی کی معرفت گویا مرضِ گُناہ کے حکیم حاذق خُداوند مسیح کی خبر دی۔ اور فرمایا "کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہُوداہ کے لئے خوشی اور خرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہوگا۔" (زکریاہ ۸: ۱۹) اور یُوحنا کے شاگرد اور فریسی جو روزہ کے بڑے پابند تھے مسیح کے شاگردوں کی شکایت کرنے لگے کہ وُہ روزہ کیوں نہیں رکھتے؟ خُداوند مسیح نے اُنہیں جواب دیا کہ "کیا براتی جب تک دُولہا اُن کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں؟" (مرقس ۲: ۱۹) گویا مسیح کی آمد سے مریضانِ گُناہ کے دلوں میں ایک زبردست اُمید اِس بات کی جھلک رہی تھی کہ اب غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے گُناہوں کو مٹانے والا ظاہر ہوگیا ہے۔ اب کیوں مایُوس رہیں۔ "یسُوع نے سُن کر اُن سے کہا۔ تندرستوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو۔ مَیں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بُلانے آیا ہُوں۔" (مرقس ۲: ۱۷) یہُودی لوگ دیگر دینی رسُوم کی طرح روزہ کی رسم پر بھی ظاہرداری اور ریاکاری کی رنگ آمیزی کر چکے تھے۔ اِس لئے خُدا نے اُنہیں یُوں ملامت کی۔ اور روزہ کی اصل غایت کو اُن پر بدیں الفاظ ظاہر فرمایا "کیا یہ وُہ روزہ ہے جو مُجھ کو پسند ہے؟ ایسا دِن کہ اُس میں آدمی اپنی جان کو دُکھ دے۔ اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے۔ اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے؟ کیا تُو اِس کو روزہ اور ایسا دِن کہے گا جو خُداوند کا مقبُول ہو؟ کیا وُہ روزہ جو مَیں چاہتا ہُوں یہ نہیں کہ ظُلم کی زنجیریں توڑیں اور جُوئے کے بندھن کھولیں۔ اور مظلُوموں کو آزاد کریں۔ بلکہ ہر

ایک جُوئے کو توڑ ڈالیں ؟ کیا یہ نہیں کہ تُو اپنی روٹی بھُوکوں کو کھلائے اور مسکینو
جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کِسی کو ننگا دیکھے تو اُسے پہنائے ۔ اور تُو ا
ہم جنس سے رُوپوشی نہ کرے" (یسعیاہ ۵۸: ۵ - ۷) اور خُداوند مسیح نے بھی فر
"اور جب تُم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صُورت اُداس نہ بناؤ ۔ کیونکہ وُہ
مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں روزہ دار جانیں ۔ مَیں تُم سے سچ کہتا ہُوں کہ وُہ اپنا
پا چُکے بلکہ جب تُو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور مُنہ دھو ۔ تاکہ آدمی نہیں
تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے ..." (متی ۶: ۱۶-۱۸) انجیل
مُقدس میں روزہ کے متعلق نہ تو تاکید ہے اور نہ اِمتناع ۔ بلکہ عابد کی اپنی
پر منحصر ہے کہ جب ایسے حالات پیش آئیں جن سے روزہ کی نوبت پہنچے تو ر
رکھے ۔ اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے ۔ پر کِسی خاص دِن یا مہینہ یا موسم کی تخصیص
کی کوئی ہدایت نہیں اور نہ ہونی چاہیئے ۔ روزہ ایماندار کی تمام زندگی پر حاوی
ہے ۔ پس نئے عہد کی کامل شریعت میں آکر روزہ لازمی حُکم نہ رہا بلکہ اختیاری
ہو گیا ۔

عیدیں یہُودیوں کے لِئے تین عیدیں مقرر تھیں ۔ "تُو سال بھر میں تین بار
لِئے عید منانا" (خروج ۲۳: ۱۴) اور یہ عیدیں اُن کی گُذشتہ تاریخ کے واقعات
یادگاریں تھیں ۔

(۱) پہلی عید فسح تھی جو مارچ یا اپریل میں ہوتی تھی ۔ یہ بنی اِسرائیل کے مِصر
کی غُلامی سے چُھٹکارے کی یادگار تھی ۔ اِس موقع پر بھُنا ہُوا گوشت بے خمیر
روٹی اور کڑوی ترکاری کے ساتھ کھانے کا حُکم تھا (خروج ۱۲: ۸) اِس کے
ہی سات روز تک خمیر کو گھروں سے جُدا کرنے کا حُکم تھا ۔ اِسی واسطے
کو عید فطیر بھی کہا گیا ۔ کڑوی ترکاری کھلانے سے مُراد یہ تھی کہ جب جب

منائی جائے مصر کے گذشتہ دُکھوں کو یاد کیا جائے۔ اور خمیر کو جدا کرنے سے مراد تھی کہ گناہ و شرارت کو اپنے دلوں سے نکالیں۔ عین اُس وقت جبکہ عید فسح کا موقع تھا، خداوند مسیح نے اپنی جان تمام جہان کے اسیران گناہ کی خاطر دے کر انہیں شیطان اور گناہ کی شدید غلامی سے آزاد فرمایا۔ (عبرانی ۲: ۱۴-۱۵) اور یہودی عید فسح کا تکملہ مسیح کی قربانی میں ہو گیا۔ اور کڑوی ترکاری کھانے کی رسم اور بھنا ہوا گوشت کھانے میں مسیح کے صلیبی دُکھوں اور اُس کے جسمانی و رُوحانی صدمات کی پیشین گوئی موجود ہے۔ "پھر اُس نے روٹی لی اور شکر کر کے توڑی اور یہ کہہ کر اُن کو دی کہ یہ میرا بدن ہے۔ جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو۔ اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ میرے اُس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے۔" (لوقا ۲۲: ۱۹-۲۰) جس طرح فسح کی عید یہود کے لئے مصر کی غلامی سے آزاد ہونے کی یادگار تھی، اُسی طرح پاک عشاء ربانی کی رسم ابلیس و گناہ کی غلامی سے چھٹکارے کی ابدی اور دائمی یادگار ٹھہری۔ مُقدس پولوس رسول فرماتا ہے "پُرانا خمیر نکال کر اپنے آپ کو پاک کر لو۔ تاکہ تازہ گندھا ہوا آٹا بن جاؤ۔ چنانچہ تم بے خمیر ہو۔ کیونکہ ہمارا بھی فسح یعنی مسیح قربان ہوا۔ پس آؤ عید کریں، نہ پُرانے خمیر سے اور نہ بدی و شرارت کے خمیر سے بالکل صاف دلی اور سچائی کی بے خمیر روٹی سے۔" (اکرنتھی ۵: ۷-۸) اور یوں وہ مختص بالقوم و زمان یادگار ایک عالمگیر اور دائمی رُوحانی عید میں منتقل ہو گئی۔

(۲) عید پنتی کوست یا ہفتوں کی عید۔ یہ عید مصر کی غلامی سے چھٹکارے کے پچاسویں دن قائم ہوئی۔ ماہ مئی یا جون کے درمیان میں ہوتی تھی۔ یہ ایک طرف مصر سے آزادی کی اور دوسری طرف شریعت الٰہی کے دیئے جانے کی

یادگار تھی۔ اِس میں یہودی لوگ اپنے گیہوں اور جَو کے پہلے پھل خُدا کے لیے نذر کرتے تھے۔ یہ عید رُوح القدس میں گُناہ سے آزاد ہونے کی گویا علامت تھی۔ کیونکہ جہاں خُداوند کا رُوح ہے وہاں آزادی ہے" (۲ کرنتھی ۳: ۱۷) چنانچہ خُداوند مسیح کے صعود کے دس دن بعد رُوح القدس اِسی عید کے موقع پر نازل ہُوا تھا۔ اور رُوحانی معنی میں پہلے پھل وُہ تین ہزار مرد تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خُداوند کی نذر کر دیا (اعمال ۲: ۴۱) انجیل میں اپنی شخصیت کو نذر کرنے کا حکم ہے (رومیوں ۱۲: ۱ و کُلسّی ۱: ۱۰ و عبرانی ۱۳: ۱۵) عید پنتکوست کا کمال رُوح القدس کے نزول پر ہوگیا۔ اور رُوح القدس اُن پر آگ کی پھٹتی ہُوئی زبانوں کی صُورت میں نازل ہُوا۔ اور وُہ غیر زبانیں بولنے لگے۔ ہر ایک اپنے مُلک کی بولی وہاں سُنتا تھا یہ گویا الٰہی اشارہ تھا کہ خُدا کا مذہب قومی دائرہ سے نکل کر تمام اہلِ اُمّت کا دستور العمل بن جائے اور پاک صحائف کے تراجم تمام دُنیا کی زبانوں میں ہو جائیں۔ تاکہ سب قومیں بلا امتیاز و خصوصیت اُس سے فائز المرام ہو سکیں۔ اور مذہب الٰہی تمام دُنیا کا مذہب ہو جائے۔

۳۔ عید خیام سے مراد قوم یہود کی غریب الوطنی اور دشت نوردی کی یادگار تھی۔ یہ عید الخیام میں ہوتی تھی۔ اُن کی مسافرت کے ایام اور خیموں کی سکونت کے دوران میں فیضِ الٰہی و برکاتِ سماوی کے نزول کی یادگار تھی۔ آخر اُن کی دشت گردی اور بادیہ پیمائی مُلک کنعان کی مستقل سکونت پر منتج ہُوئی۔ اگرچہ اُن کی مسافرت کا نشانہ مُلک کنعان تھا۔ مگر حقیقت میں وُہ ایک بہتر یعنی آسمانی مُلک کے مشتاق تھے" (عبرانی ۱۱: ۱۶) اور تمام ایماندار بندوں کا بھی وُہی نصب العین ہے۔ مُقدّس پولُس رسُول فرماتا ہے "جب تک ہم بدن کے وطن میں ہیں خُداوند کے ہاں سے جلا وطن ہیں" (۲ کرنتھی ۵: ۶)

"کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیمہ کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا۔ تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنایا ہوا گھر نہیں۔ بلکہ ابدی ہے" (۲-کرنتھی ۵: ۱) اور اسی آسمانی وطن کی بابت خداوند مسیح نے فرمایا "میرے باپ کے گھر میں بہت سے مکان ہیں ..... کیونکہ میں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے جگہ تیار کروں" (یوحنا ۱۴: ۲) مقدس پطرس رسول فرماتا ہے "اپنے آپ کو پردیسی اور مسافر جان کر ان جسمانی خواہشوں سے پرہیز کرو جو روح سے لڑائی رکھتی ہیں" (۱-پطرس ۲: ۱۱) ان تین بڑی عیدوں کے علاوہ دو اور چھوٹی عیدیں بھی تھیں۔ یعنی عید پوریم اور عید تجدید۔ لیکن یہ خدا کی مقرر کردہ نہ تھیں۔ بلکہ ایک ملکہ آستر کے زمانے میں اور دوسری یہوداہ مکابی کے وقت میں یہودیوں نے خود مقرر کر لی تھیں۔ ان دونوں موخر الذکر عیدوں کا یروشلیم کی ہیکل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ سب عیدیں قومی فتوحات کی یادگاریں تھیں وہ صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق تھے۔ اور تمام دنیا کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے وہ تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کے قابل نہ تھیں۔ اس لئے وقت پورا ہونے اور اپنے حالیہ رواج کے اختتام پر رہ بند ہو گئیں۔ اور ہیکل کے بغیر ان پر عمل کرنا ہی ناممکن تھا۔ اس لئے جب ہیکل نہ رہی تو عیدیں کیسے رہ سکتی تھیں۔ خداوند مسیح کی قربانی اور محبت کا تعلق تمام دنیا کے ساتھ ہے۔ (انجیل یوحنا ۳: ۱۶ و خط ۱-یوحنا ۲: ۲) لہٰذا اس کے متعلق تمام واقعات کا تعلق تمام لوگوں بلکہ تمام عالم کے ساتھ ہے۔

طریق عبادت ہم پیچھے کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ یہودی مذہب کا مرکز ہیکل تھی جس میں ان کی تمام مذہبی رسوم اور عبادت قومی صورت میں انجام پاتی تھیں۔ اور خدا کا یہ بھی حکم تھا کہ اگر تم غیر معبودوں اور بتوں کی پرستش کرو گے

اور نیک نیتی سے میری عبادت بجا نہ لاؤ گے۔ تو مَیں اِس ہیکل کو گرا دُوں گا اور تُمہیں اِس زمین سے نِکال دُوں گا۔ (۱ سلاطین ۹: ۶-۹) اور اِس اِنتظام سے اُن کے اندر عبادتِ الٰہی کی خالص رُوح پیدا کرنا مقصُود تھا۔ اور جب وُہ خُدا کی خالص عبادت کے کھنڈرات پر بُت پرستی کی عمارت اُٹھانے لگے۔ اور غیر معبُودوں کی طرف مائِل ہُوئے۔ تو خُدا نے بھی اُنہیں ترک کر دیا۔ اور ایک بُت پرست کسدی بادشاہ بنُوکدنظر کے ذریعے اسیر ہو کر بابل لے جائے گئے۔ اور مُقدس ہیکل بھی برباد کی گئی۔ (یرمیاہ ۵۲: ۱۳) ایماندار یہُودی اُس غریبُ الوطنی اور اسیری کے زمانہ میں بھی خُدا کو نہ بھُولے۔ اور اکثر تین مرتبہ دن میں یروشلیم کی طرف رُخ کر کے نماز کیا کرتے تھے۔" اور جب دانی ایل نے معلُوم کیا کہ اُس نوشتہ پر دستخط ہو گئے۔ تو اپنے گھر میں آیا۔ اور اپنی کوٹھڑی کا دریچہ جو یروشلیم کی طرف تھا کھول کر دن میں تین مرتبہ حسبِ معمُول گھٹنے ٹیک کر خُدا کے حضُور دُعا اور اُس کی شُکر گذاری کرتا رہا۔" (دانی ایل ۶: ۱۰ و ۱ سلاطین ۸: ۴۸) اِس بیان سے بخُوبی معلُوم ہو سکتا ہے کہ وُہ ہیکل کے رُخ پر تین دفعہ دن میں نماز پڑھتے تھے۔ اور بانیٔ اسلام نے رُخ کعبہ پر نماز گذارنا یہُودیوں سے سیکھا۔ اور کئی ماہ تک بیت المقدس (ہیکل) کے رُخ پر نماز ادا کرتے اور کرواتے رہے۔ اور یہُود کی نماز عبرانی زبان میں ہوتی تھی۔ اہلِ اسلام بھی عربی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ اِس سے اِسلام کا ایک قومی مذہب ہونا ظاہر ہے۔ بھلا اہلِ عرب تو اپنی مُلکی زبان عربی میں نماز پڑھیں۔ دیگر ممالک کے مُسلمان تو عربی نہیں ہیں۔ اُن پر عربی زبان کی قید لگانا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ کیا خُدا سوائے عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا؟ مسیحیت کی عمومیت اور عالمگیری کی یہ کیسی بیّن دلیل ہے کہ مسیحی ہر زبان میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور

تمام دُنیا کی زبانوں میں انجیل کا رواج پایا جاتا ہے۔ یہ صرف مقلدانِ آنخداوند کی کوئی اپنی ایجاد کردہ تجویز نہ تھی جس پر انہوں نے عمل کر لیا۔ بلکہ رُوح القدس کی ہدایت کے ماتحت انجیل مُقدس کے دُنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے کئے گئے۔ (اعمال ۲:۲-۸) اور زبان کی تخصیص کسی مذہب کے عالمگیر ہونے کی محدود و مانع ہے۔ اسی واسطے مُقدس پولُوس رسُول بیگانی زبان میں دُعا مانگنے اور کلام کرنے کو معیُوب ٹھہراتا ہے۔ (اکرنتھی ۱۴:۱-۲۴) یہُودی ہیکل کے رُخ پر نماز پڑھتے تھے اور اہلِ اسلام کعبہ کے رُخ پر۔ لیکن خُداوند مسیح نے تخصیص جہت و سمت کا جھگڑا ہی ختم کر دیا جس میں ظاہر داری کا بھی امکان نہیں رہتا (ملاحظہ ہو متی ۶:۵-۶) یعنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے پوشیدگی میں دُعا مانگنے کا حکم دیا۔ شریعت مُوسوی پر عمل درآمد کے لئے ہیکل کا وجُود لازمی تھا۔ اور بغیر ہیکل کے یہُودی مذہب ایک قالب بے جان کی مثال تھا۔ خُداوند مسیح چُونکہ عالمگیر مذہب کا بانی ہو کر آیا تھا، اِس لئے جب ایک دفعہ اُس کے شاگردوں نے ہیکل کی زیارت کے لئے اُس سے سوال کیا، تو اُس نے فرمایا "میں تُم سے سچ کہتا ہُوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہیگا جو گرایا نہ جائے" (متی ۲۴:۲) اور پھر سامری عورت نے آپ سے کہا کہ "ہمارے باپ دادوں نے اِس پہاڑ پر پرستش کی۔ اور تُم کہتے ہو کہ وُہ جگہ جہاں پرستش کرنی چاہیئے یروشلیم میں ہے" یسُوع نے اُس سے کہا اے عورت میری بات کا یقین کر کہ وُہ وقت آتا ہے کہ تُم نہ تو اِس پہاڑ پر باپ کی پرستش کرو گے اور نہ یروشلیم میں ...... مگر وُہ وقت آتا ہے، بلکہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار باپ کی پرستش رُوح اور سچائی سے کریں گے"۔ یُوحنا ۴:۲۰-۲۴) اور ایمانداروں کے دلوں کو خُدا کا مقدس (ہیکل) کہا گیا۔ (اکرنتھی ۳:۱۶-۱۷) اور آپ کے قول کے مُطابق ہیکل سلیمانی سنہ ۷۰ء میں برباد ہو گئی اور

مذہب اپنی خصوصیت کی قیود سے آزاد ہو گیا تاکہ کُل دُنیا کا دستورالعمل بن سکے۔

ہم بالتفصیل دکھا چکے کہ کس طرح اور کن معنوں میں خداوند مسیح نے شریعت موسوی کی تکمیل فرمائی۔ اور احکام خاص کس طرح اور کیوں متروک العمل ہو گئے۔ ردّ نہیں کئے گئے بلکہ اُن کی ضرورت نہ رہی۔ شباب کی آمد سے طفلی ردّ نہیں ہو جاتی بلکہ شباب کی کمالیت میں گم ہو جاتی ہے۔ جب بنیاد پر اُوسارے لگا کر عمارت کو انجام تک پہنچایا جاتا ہے تو بنیاد ردّ نہیں ہو جاتی بلکہ چھپ جاتی ہے۔ توریت کی ناکامل شریعت مسیح کی کامل شریعت (یعقوب ۱: ۲۵) کی آمد پر ردّ و باطل نہیں ہوئی بلکہ اُس کی کمالیت میں چھپ گئی ہے۔ اس واسطے کامل اور عالمگیر شریعت کے رواج پانے سے موسوی ناکامل شریعت ایسی ہی غائب ہو گئی جیسے آفتاب کے طلوع ہونے پر چراغ گل کر دیا جاتا ہے۔ خداوند مسیح نے شرع الٰہی کے حقیقی اور باطنی معنوں کو روشن کر دیا۔ اور اُس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونک کر اور اُس کے حجاب خصوصیت کو اُتار کر عمومیت کے وسیع میدان میں بے نقاب کر کے اور تمام دُنیا کے لئے اُس کو ہدایت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب اِس متروک شدہ شرع موسوی و احکام خاص پر عمل کرنے کے خلاف انجیل مقدس کی تعلیم ملاحظہ ہو۔

"مگر اب جو تم نے خدا کو پہچانا۔ بلکہ خدا نے تم کو پہچانا تو اُن ضعیف اور نکمی ابتدائی باتوں کی طرف کس طرح پھر رجوع ہوتے ہو جن کی دوبارہ غلامی کرنا چاہتے ہو۔ تم دنوں اور مہینوں اور مقررہ وقتوں اور برسوں کو مانتے ہو" (گلتی ۴: ۹-۱۰) "پس کھانے پینے یا عید یا نئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں" (کلسی ۲: ۱۶-۱۷) "جب تم مسیح کے ساتھ دُنیوی ابتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے، تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔

آدمیوں کے حکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو۔ کہ اسے نہ چھونا اسے نہ چکھنا اور اسے ہاتھ نہ لگانا" (کلسیوں ۲: ۲۰-۲۱) اور اُس عالمگیر نئے عہد کی آمد اور اُس کی شریعِ کامل کے رواج پانے پر "نہ یونانی رہا نہ یہودی۔ نہ ختنہ نہ نامختونی۔ نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے" (کلسیوں ۳: ۱۱)۔ جیسے ایک معمار جب مکان کی محراب بناتا ہے اور اُس کے نیچے اینٹوں کا ایک عارضی سہارا لگاتا ہے اور جونہی وہ محراب پختہ ہوجاتی ہے وہ ماتحت قالب کو گرا دیتا ہے۔ اسی طرح توریت کے احکام خاص کامل مذہب اور کامل شریعت کے قیام پر منسوخ العمل ہو گئے۔

احکامِ عام

اخلاقی شریعت کے احکام عشرہ جو خدا نے موسیٰ کو دیئے لکھ کے سونپے (خروج ۳۱: ۱۸) انہیں کو احکام عام کہا جاتا ہے۔ اور یہ احکام ہیں جو ہر زمانے میں متبوع اور مطاع رہے اور رہیں گے۔ یہی احکام شامل کا مرکز اور روحِ رواں تھے۔ اور ان میں تمام دُنیا کا دستورالعمل ہونے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح انسان کی جسمانی زندگی کے لئے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ طبعی وفطری سامان کافی ووافی ہیں، اسی طرح ہماری روحانی اور مجلسی زندگی کے لئے یہ احکام نہایت ضروری اور مفید ہیں۔ ان احکام کا بیان خروج ۲۰: ۱-۱۷ اور مفصل تشریح احبار باب ۱۹ میں موجود ہے۔ اور خداوند مسیح نے ان کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ "خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر

تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۲۲: ۳۷-۴۰) جیسے توریت کے احکام خاص ظاہر بات سے تعلق رکھتے تھے، اُسی طرح احکام عام انسان کی باطنی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مسیح کی تمام تعلیم باطنیت سے متعلق ہے۔ تمام پائبران ربانی اور داعیان حقانی ایک ہی قومی مرکز کے گرد چکر لگاتے رہے۔ اور اپنی قومی حدود سے نہ تو وہ خود آگے بڑھے اور نہ ہی اُنہیں خدا کی طرف سے ایسا اختیار ہی دیا گیا تھا۔ لیکن عہدِ جدید کے بانی و مبدا نے تمام دُنیا کو اپنا دائرہ عمل بنایا۔ اور توریت کے قومی مذہب کی میعاد کو یوحنا تک محدود ٹھہرایا۔ "کیونکہ سب نبیوں اور توریت نے یوحنا تک نبوت کی" (متی ۱۱: ۱۳) "شریعت اور انبیاء یوحنا تک رہے اُس وقت سے خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے" (لوقا ۱۶: ۱۶) اور شریعت اخلاقی (احکامِ عام) کے متعلق فرمایا۔" آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطے کے مٹ جانے سے آسان ہے" (لوقا ۱۶: ۱۷ و متی ۵: ۱۸-۱۹) اور جس طرح ایک گورنر کے اختیارات کا زور صرف ایک ہی صوبے تک محدود ہوتا ہے، اسی طرح انبیائے توریت کا اختیار اور منصب قومِ یہود سے باہر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ اُن کا یہ سلسلہ یوحنا اصطباغی پر اسی خصوصیت سے جڑا آیا۔ ایک شہنشاہ کے اختیارات ایک گورنر کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ہیں۔ چنانچہ اسی طرح عالمگیر عہد کے بانی کے اختیارات اور ذاتی قابلیت انبیاء عہدِ عتیق سے بہت زیادہ ہونی چاہیئے۔ اور درحقیقت ایسا ہی ہے آپ نے اپنے آپ کو تمام انبیاء سابقہ سے بہر صورت افضل ظاہر کیا۔ مثلاً "یہاں وہ ہے جو یونس سے بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲: ۴۱) "یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے۔" (آیت ۴۲) داؤد سے بڑا ہونا (متی ۲۲: ۴۴-۴۵) "یہاں وہ ہے جو

ہیکل سے بھی بڑا ہے" (متی ۱۲: ۶) "پیشتر اس سے کہ ابراہام پیدا ہوا میں ہوں" (یوحنا ۸: ۵۸)۔ موسیٰ پر فضیلت (عبرانی ۳: ۳-۶) فی الحال ہم مسیح کے فضائل کے متعلق اِن چند امثلہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ کسی مناسب مقام پر مفصل بیان کریں گے۔

واضح ہو کہ خداوند مسیح نے اپنی مختصر سی زمینی زندگی میں عالمگیر مذہب کی صرف بنیاد ہی رکھی۔ اور جس طرح توریت کا زمانہ مذہب کی ابتدائی حالت کا زمانہ تھا، اُسی طرح مسیح کا زمانہ مذہبِ الٰہی کی وسطی حالت کا زمانہ تھا۔ اور جس طرح توریت کے تمام انبیاء مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عالمگیر وسعت کی خبر دے گئے تھے، اُسی طرح خداوند مسیح بھی اپنے بعد ایک دوسرے مددگار کے نزول و ظہور کی خبر دے گئے"۔ "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا..... وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا" (یوحنا ۱۶: ۱۲-۱۴ و ۱۵: ۲۶) اور مذہبِ الٰہی کو انتہائی کمالیت تک پہنچانا رُوح القدس کا کام تھا جس کا خداوند مسیح نے وعدہ فرمایا تھا۔ مذہب کی ارتقائی حیثیت سے توریت کا زمانہ ابتدائی مسیح کی زمینی زندگی کا زمانہ وسطی۔ اور رُوح القدس کا زمانہ انتہائی کمالیت کا زمانہ ہے۔ خداوند نے اپنی زمینی زندگی میں عالمگیر مذہب کی صرف بنیادیں رکھیں اور کسی قدر خصوصیت سے نکال کر عمومیت میں بدل دیا۔ مثلاً یہودی قوم تمام دیگر غیر اقوام کو نامختون بے دین۔ لامذہب اور گمراہ سمجھ کر اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ اور بالخصوص یہودی لوگ سامریوں سے بہت زیادہ متنفر تھے۔ اور اُنہیں حقیر اور ناچیز جانتے تھے۔ مگر مسیح نے سامریوں کے ساتھ

ہمیشہ نیک سلوک کیا۔ اور اُن کی قدر کی۔ یہود کو اُن کی ظاہرداری۔ خود پرستی
اور تعصب پر بارہا ملامت کی۔ ایک رحم دل سامری کی تعریف کی اور مغرور کاہن
اور خود سر لاوی کو ملامت کی۔ (لوقا ۱۰: ۲۵-۳۷) پھر ایک دفعہ دس کوڑھی
آپ سے شفا پا کر گئے۔ اُن میں سے ایک نے جو سامری تھا لوٹ کر خداوند
کی شکرگزاری کی۔ آپ نے اُس کے ایمان کی تعریف کی (لوقا ۱۷: ۱۵-۱۹)۔
ایک دفعہ جب سامریوں نے آپ کو اپنے گاؤں میں ٹھہرنے نہ دیا اور شاگردوں
کا پارۂ غیظ بہت چڑھ گیا اور اُس گاؤں پر آسمان سے آگ برسانا چاہتے
تھے۔ تو آپ نے شاگردوں کو جھڑکا۔ اور فرمایا "ابن آدم لوگوں کی جان برباد
کرنے نہیں بلکہ بچانے آیا ہے" (لوقا ۹: ۵۱-۵۶) اور پھر یوحنا ۴: ۷-۲۶
میں سامری عورت کا مشہور قصہ سب جانتے ہیں۔ کہ مسیح نے کیسے محبت
سے اُس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ اور سور فینیکی عورت جو غیر قوم تھی مسیح کے
پاس آئی۔ آپ نے اُس کی مُراد کو پورا کرنے کے علاوہ اُس کے ایمان کی
تعریف کی (متی ۱۵: ۲۱-۲۸) اور ایک دفعہ جب ایک غیر قوم صوبہ دار کے
نوکر کو آپ نے شفا دی تو اُس صوبہ دار کے ایمان کی بدیں الفاظ تعریف
کی "میں نے ایسا ایمان اسرائیل میں بھی نہیں پایا" (لوقا ۷: ۹) اور آپ نے ایک
جگہ جو انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل کہی ہے۔ اُس میں باغ سے مُراد
یہودی قوم۔ اور ٹھیکیداروں سے مُراد اُس کے رہبر اور کرتا دھرتا یعنی
فقیہہ اور فریسی۔ اور باغ کو اُن ٹھیکیداروں سے چھین کر اوروں کو دے
دینے سے مُراد غیر اقوام کو دینے سے ہے۔ یہ مذہب کی عالمگیری کی ایک
تمثیلی پیشین گوئی تھی۔ (لوقا ۲۰: ۹-۱۸ و متی ۲۱: ۳۳-۴۵) پھر آسمان کی
بادشاہت کو رائی کے دانہ اور خمیر سے تشبیہ دے کر مسیحیت کی عمومیت و

ہمہ گیری کی خبر دی (متی ۱۲: ۳۱-۳۲)۔ غرضیکہ مسیح نے ہر پہلو اور ہر صورت سے
شریعت کو کامل کیا۔ اور عالمگیر مذہب کی بنیادیں پختہ کر کے اُن پر عملی طور سے
کام بھی کیا۔ اگرچہ اس عظیم مہم کی راہ میں حاسد اور مخالف طاقتیں دیوار
بن کر حائل ہوئیں۔ مگر آپ کے عزمِ آہنی نے اپنی مقدس خدمت کے لئے
اس خار زار میں رستہ تلاش کر ہی لیا۔ اور بے پناہ نفرت کے جو تُند دھارے جو
یہود کے اعصاب میں تیر رہے تھے۔ اور مخالفت و منافرت کا مہیب سمندر
جو اُن کے اعماقِ قلب میں طوفان خیز تھا آپ کے پائے استقلال کو شکستہ نہ
کر سکا۔ اگرچہ وُہ ہمیشہ آپ کی شدید مصیبت، مظلومیت اور موت میں اپنے
ستارۂ اقبال کی فال نکالتے تھے۔ اور اُس نُور کے سامنے اپنی پوشیدہ ذلیل
اور معیوب مصائب و نقائص کو بے نقاب دیکھ کر اُس کو بجھا دینے کے ہر
وقت درپے رہتے تھے۔ اور اپنی اِن مکروہ مساعی میں کامیاب بھی ہوئے۔
لیکن پھر بھی "جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وُہی کونے کے سرے کا پتھر ہوا"
(مرقس ۱۲: نئے عہد کے بانی کو نئے عہد کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنی جان دینی پڑی۔
۱۰، ۱۱) اسی لئے پہلا عہد بھی بغیر خون کے نہیں باندھا گیا" (عبرانی ۹: ۱۸ مطابق خروج
۲۴: ۸) اور شریعتِ موسوی کی تکمیل کا تمام تر دارومدار آپ کی پاک اور
بے عیب و ہمہ گیر قربانی پر تھا۔ اسی واسطے آپ مذہبِ الٰہی کو عالمگیری کی انتہائی
حدود تک اپنی زمینی زندگی میں پہنچا نہ سکے۔ بلکہ انتہائی کاملیت کی ابتدا
آپ کی موت قیامت اور صعود کے بعد ہوئی۔ کیونکہ آپ کی قربانی کے بغیر
شریعت عتیقہ کامل نہ ہو سکتی تھی۔ اور وُہ آپ کی صلیب پر کامل ہوئی۔ اور
آپ نے کہا "پورا ہوا" اور سر جھکا کر جان دے دی۔ (یوحنا ۱۹: ۳۰) اور قبر پر
دعوت پر کامل فتح پا کر اپنے حواریوں کو یہ وصیت کی کہ "آسمان اور زمین کا کل

اِختیار مُجھے دیا گیا ہے۔ پس تُم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اور اُنہیں باپ اور بیٹے اور رُوح القُدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اور اُنہیں یہ تعلیم دو کہ اِن سب باتوں پر عمل کریں جن کا مَیں نے تُم کو حکم دیا ہے دیکھو مَیں زمانے کے آخر تک ہمیشہ تُمہارے ساتھ ہُوں" (متی ۲۸: ۱۸-۲۰) "اور اُس نے اُن سے کہا کہ تُم تمام دُنیا میں جا کر ساری خلق کے سامنے اِنجیل کی مُنادی کرو۔ جو ایمان لائے اور بپتسمہ لے وُہ نجات پائے گا۔ اور جو ایمان نہ لائے وُہ مُجرم ٹھہرایا جائے گا" (مرقس ۱۶: ۱۵-۱۶) اور اُن سے کہا یُوں لکھا ہے کہ مسیح دُکھ اُٹھائے گا۔ اور تیسرے دِن مُردوں میں سے جی اُٹھیگا۔ اور یرُوشلیم سے شرُوع کر کے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی مُعافی کی مُنادی اُس کے نام سے کی جائے گی" (لُوقا ۲۴: ۴۶-۴۸)۔

رُوح القُدس کا نزُول اور مذہبِ الٰہی کی اِنتہائی کمالیت

ہم پیچھے دکھا چُکے کہ عہدِ عتیق نے مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عمُومیت کی خبریں دیں چُنانچہ وقت پُورا ہونے پر خُداوند مسیح آیا۔ اور اُس نے اُسی مذہب کو ابتدائی حالت سے اُٹھا کر وسطی حالت تک پہنچایا۔ اور اپنی جان تمام جہان کے گُناہوں کے لیئے دے کر شریعت کی تکمیل فرمائی۔ لیکن دُنیا کی حدُود تک اُس مذہب کو وُسعت نہ دے سکے۔ بلکہ آپ نے بھی اپنے ایک اور قائم مقام یعنی رُوح القُدس کے نزُول کی خبر اپنے شاگردوں کو دی۔ اور مذہب کو وسطی حالت سے نکال کر اِنتہائی کمالیت تک پہنچانا اپنے ہونے والے قائم مقام کے لئے چھوڑ گئے۔ اور زندہ ہو کر اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کی۔ "اور دیکھو جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے مَیں اُس کو تُم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالمِ بالا سے تُم کو قُوّت کا لباس نہ ملے اِس شہر میں ٹھہرے رہو" (لُوقا ۲۴: ۴۹) اور قبر سے زندہ ہو کر چالیس دِن تک اُن

ہرطرح برطرح ظاہر ہوتے رہے۔ لیکن صعود فرمانے سے پہلے پھر اُسی خبر کو دہرایا۔ "لیکن جب رُوح القدس تُم پر نازل ہوگا تو تُم قوت پاؤ گے۔ اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہوگے" (اعمال ۱: ۸) آپ کے اِن الفاظ سے خوب روشن ہے کہ آپ نے مذہب الٰہی کی ہمہ گیر وسعت کو رُوح القدس کے نزول کے ساتھ مشروط ٹھہرایا۔ اور حسب وعدہ اپنے صعود کے دس روز بعد ہی رُوح القدس کو اُن پر عید پنتی کوست کے دن نازل فرمایا چنانچہ اُس کے نزول کی خبر یُوں ہے۔ "جب عید پنتی کوست کا دن آیا تو وہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ کہ یکایک آسمان سے ایسی آواز آئی جیسے زور کی آندھی کا سناٹا ہوتا ہے۔ اور اُس سے سارا گھر جہاں وہ بیٹھے تھے گونج گیا۔ اور اُنہیں آگ کے شعلے کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں دکھائی دیں اور اُن میں سے ہر ایک پر آ ٹھہریں۔ اور وہ سب رُوح القدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں بولنے لگے۔ جس طرح رُوح نے اُنہیں بولنے کی طاقت بخشی" (اعمال ۲: ۱-۴) اور دیگر غیر مسیحی لوگوں نے جو لاکھوں کی تعداد میں اُس وقت وہاں عید کے لئے جمع تھے یہ تمام ماجرا دیکھا۔" اور سب حیران اور متعجب ہو کر کہنے لگے۔ دیکھو یہ بولنے والے کیا سب گلیلی نہیں؟ پھر کیونکر ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے وطن کی بولی سنتا ہے؟" (اعمال ۲: ۷-۸) اور رُوح القدس نے نازل ہو کر اُسی جگہ سے اپنا کام شروع کیا۔ جہاں خداوند مسیح چھوڑ گئے تھے۔ اور اُسی وقت لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسیح پر ایمان لے آئی۔ "پس جن لوگوں نے اُس کا کلام قبول کیا اُنہوں نے بپتسمہ لیا اور اُسی روز تین ہزار آدمیوں کے قریب اُن میں مل گئے" (اعمال ۲: ۴۱) اور معتقدانِ مسیح کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ "مگر کلام کے سننے والوں میں سے بہتیرے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ مردوں اور عورتوں کا شمار شامل نہیں ان کی تعداد

پانچ ہزار کے قریب ہو گئی" (اعمال ۴:۴) اور رُوح القُدس نے جو اُن کو مُلک مُلک کی غیر زبانیں بولنے کی قوت بخشی۔ تو یہ گویا خُدا کا ایک صاف صریح اشارہ اِس امر کا تھا کہ کلامِ مُقدس کے ترجمے دُنیا کی تمام زبانوں میں کر دئیے جائیں تاکہ کوئی بشر خُدا کی رُوحانی برکتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ خُدا کی اِسی ہدایت کے ماتحت مسیح کی شمعِ عشق کے پروانوں نے انجیلِ جلیل کے ترجمے دُنیا کی ہر زبان میں کر دئے۔ اور یسعیاہ نبی کی وہ پیشین گوئی پوری ہُوئی کہ "وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہلِ لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئیں گے اور میرا جلال دیکھیں گے" (یسعیاہ ۶۶:۱۸)۔ اور جس طرح یہودیوں نے خُداوند مسیح کو دکھ دیا اور ستایا تھا اُسی طرح اب اُس کے شاگردوں کو ستانے لگے۔ اُن کو قیدوں میں ڈالنے اور طرح طرح سے ایذائیں دینے لگے۔ تاکہ وہ مسیح کے نام کی منادی بند کر دیں۔ لیکن مسیح کی محبت کا شعلہ اُن کے دل کے مذبح پر اور بھی تیزی سے جلنے لگا۔ اور سب سے پہلے مسیح کے خادم ستفنس نے جامِ شہادت نوش کیا۔ "تاہم خُدا کا کلام پھیلتا رہا۔ اور یروشلیم میں شاگردوں کا شمار بہت ہی بڑھتا گیا۔ اور کاہنوں کا بڑا گروہ اِس دین کے تحت میں ہو گیا" (اعمال ۶:۷) "اور وہ ہیکل میں اور گھروں میں ہر روز سکھانے اور اِس بات کی خوشخبری دینے سے کہ یسوع ہی مسیح ہے باز نہ آئے" (اعمال ۵:۴۲)۔

مسیحیت غیر اقوام میں

آخر وہ وقت آ گیا کہ "یروشلیم سے شروع کر کے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے" (لوقا ۲۴:۴۷)۔ چنانچہ شاگردوں نے یروشلیم میں اپنی خدمت کو شروع کیا۔ اور رُوح القُدس کی طاقت سے معمور ہو کر بہت کامیابی حاصل کی۔ اب وہ یروشلیم سے باہر نکلتے ہیں۔ فلپس سامریہ میں جاتا ہے اور سامری لوگ اُس

کے کلام سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ (اعمال ۸: ۴-۸) پطرس بھی غیر قوموں میں منادی کرنے لگا اور اُن پر رُوح القدس نازل ہُوا۔ (اعمال ۱۰: ۴۵) اور اُنہوں نے بپتسمہ لیا (آیت ۴۸)۔ مگر جب رسُولوں نے غیر اقوام کی طرف رُخ کیا اور اُنہیں خُدا کی بادشاہت میں کُشادہ دلی سے شامل کرنے لگے تو یہودی مسیحی اُن پر اعتراض کرنے لگے اور اُن میں بڑی بحث ہوئی۔ (اعمال ۱۱: ۱-۲) اور پطرس نے اُن کو یُوں جواب دیا "پس جب خُدا نے اُن کو بھی وُہی نعمت دی جو ہم کو خُداوند یسُوع مسیح پر ایمان لا کر ملی تھی تو میں کون تھا کہ خُدا کو روک سکتا۔ وہ یہ سُن کر چُپ رہے اور خُدا کی بڑائی کر کے کہا۔ تو بے شک خُدا نے غیر قوموں کو بھی زندگی کے لئے توبہ کی توفیق دی ہے" (اعمال ۱۱: ۱۷-۱۸) اور جب یہودیوں کی مُخالفت و مخاصمت اور بُغض و حسد کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگا تو پولوس اور برنباس دلیر ہو کر بولے کہ "ضرُور تھا کہ خُدا کا کلام پہلے تمہیں سُنایا جائے۔ لیکن چُونکہ تم اُسے رَدّ کرتے ہو اور اپنے آپ کو ہمیشہ کی زندگی کے ناقابل ٹھہراتے ہو۔ تو دیکھو ہم غیر قوموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں" (اعمال ۱۳: ۴۶) چنانچہ اُس وقت سے رسُول دلیرانہ طور پر غیر اقوام میں مسیح کی گواہی دینے گئے اور پولوس رسُول اپنے آپ کو غیر قوموں کا رسُول کہتا ہے۔ (اعمال ۹: ۱۵ و رومی ۱۱: ۱۳ و گلتی ۲: ۸-۹ و افسی ۳: ۱ و ۸) اور خُداوند مسیح کا وُہ قول پُورا ہُوا کہ "جب رُوح القدس تم پر نازل ہوگا تو تم قوت پاؤ گے۔ اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گے" (اعمال ۱: ۸) اور مذہب الٰہی کی ہمہ گیر وُسعت اور انتہائی کاملیت کا زمانہ رُوح القدس کے نزُول سے لے کر قیامت کے دن تک وسیع ہے۔ چُنانچہ پہلی صدی عیسوی سے لے کر آج تک جو عالمگیر ترقی مسیحیت نے کی ہے وُہ کسی منطقی دلیل سے ثابت کئے جانے کی مُحتاج نہیں "عیاں راچہ بیاں" قالب دُنیا

کے مصنفانہ رئیسہ اسی کے حلقہ بگوش ہیں۔ علمی عقلی۔ مذہبی اور مالی ہر قسم کی ترقی بھی اسی کے ہاتھوں کو چوم رہی ہے۔ اور ہر ملک و قوم میں مسیح کے گواہ تمام زبانوں میں انجیل مقدس کا اشتہار دے رہے ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے اپنے مذہب کی حقانیت اور صداقت کو تمام روئے زمین پر پھیلانے کے لئے اپنی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ سے ذرائع و وسائل بھی ایسے زبردست مہیا کر دیئے ہیں کہ اُس کی نشر و اشاعت بآسانی تمام ہو سکے۔ مثلاً اُس نے اپنے خادموں کو پریس اور مطابع ایجاد کرنے کی حکمت بخشی۔ تاکہ وہ انجیل کو ہر زبان میں بہ تعداد کثیر تھوڑے عرصہ میں چھاپ کر تیار کریں۔ اور موٹر۔ ریل گاڑی اور ہوائی جہاز اور بحری جہاز و تار برقی کے ذریعے انجیل مقدس دنیا کے ہر حصے میں پہنچا سکیں۔ ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں۔ اور پریس کی اختراع کچھ ایسے خداداد عجیب و غریب سامان ہیں کہ جن سے بڑھ کر انجیل کی ترویج و توسیع اشاعت کے معاون ملنے محال ہیں۔ ریڈیو کی دریافت نے مبشرانِ کلام کے حوصلوں کو اور بھی بلند کر دیا ہے یہ ہیں وہ ذرائع جو مسیحیت کی ترویج اور تشہیر عامہ کے لئے خدا تعالےٰ کی حکمت و دانش پر دلالت کرتے ہیں۔ آج اقوام عالم اور ادیانِ دہر تمام امور میں مسیحیت کی تقلید پر جھکے ہوئے ہیں۔ اگرچہ زبان سے مسیح اور مسیحیت کو طعن و دشنام کرتے ہیں مگر باطن میں اُس کی تاثیر سحر تخمیر کو خوب محسوس کرتے ہیں۔ اور مسیحیت کے آفتابِ صداقت کے سامنے تمام دیگر مذاہب کے چراغ گُل ہوتے جاتے ہیں اور وہ وقت آنے والا ہے کہ سب اپنے اپنے مدھم عارضی چراغوں کو پھونک مار کر بجھا دیں گے۔ اور مسیحیت کے نیر درخشاں کی ضیاباریوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ اور خداوند مسیح کو جو تمام دنیا کے پیر طریقت ہیں اپنے دلوں

پرمسریر آرا فرمائیں گے۔ "تاکہ یسُوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا ٹکے۔ خواہ آسمانیوں کا خواہ زمینیوں کا۔ خواہ اُن کا جو زمین کے نیچے ہیں۔ اَور خُدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اِقرار کرے کہ یسُوع مسیح خُداوند ہے" (فلپی ۲: ۱۰-۱۱)۔

مسیحیت ہند میں اِس وقت متعدد مذاہب پاکستان و ہندوستان میں نظر آتے ہیں۔ اَور روز بروز بہت سے مذہبی فرقے برپا ہوتے جاتے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں مذاہب کی تعداد عابدوں کی تعداد سے بڑھ نہ جائے۔ اَور لُطف یہ ہے کہ ہر مذہب اَور ہر فرقہ یہی دعوےٰ کرتا ہے کہ وُہ واحد عالمگیر الٰہی مذہب ہے اَور دُوسرے مذاہب باطل اَور انسانی اِختراع ہیں۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب خُدا واحد مسلّم ہے تو وُہ ایک ہی خُدا اِتنے متناقض و متضاد مکاشفے کیسے دے سکتا ہے؟ اگر تمام مذہبی کتابیں اِلہامی مان لی جائیں تو ماننا پڑیگا، کہ اُن سب کا اِلہام خُدا کی طرف سے نہیں ہُوا۔ اَور تعجب انگیز امر یہ بھی ہے کہ عام طَور پر مسیحیت کے باہر تمام مذاہب اُمُورِ معاشرت کو بھی مذہب کا جُزو بنائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ کھانا پینا۔ پہننا اَور چند امتیازی علامتیں رکھنا سب جسمانی باتیں ہیں۔ اَور مذہبیات و رُوحانیات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں۔ آج جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کی عالمگیری کے دعویدار ہیں، وُہ محض مسیحیت کی تقلید پر خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ اَور عالمگیر مذہب جیسا ہم ثابت کر چکے مسیحیت سے باہر اَور کوئی نہیں۔ اِنجیل ہی کے آفتاب فیضانِ صداقت کی ضیا باریوں سے دُختر کُشی۔ رسم ستی۔ اَور غلامئی نسوان و بردہ فروشی کی ستم رانیوں کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔ اَور وُہی رسُومِ بد جو بہت کوتاہیٔ نظر و فکر اَور خساست و انقباضِ طبائع محجوب عند الخواص باعثِ صد افتخار و مباہات اَور موجبِ حسنات سمجھی جاتی تھیں۔ آج مسیحیت خواص مجیبہ اَور تاثیراتِ غریبہ کے طفیل معیُوب و مذموم سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ

تھا تو اِس قدر کہ "اہنسا پرمو دھرما" کے خیالات مروّج تھے۔ اور اگر ظلم تھا تو اِس اِنتہا کا کہ ستی اور دختر کُشی کی قبیح رسُوم کو ثوابِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ اور رحم و قہر کی متضاد تین پر بطورِ افراط و تفریط عمل درآمد ہوتا تھا۔ مسیحیت نے ہر شعبۂ انسانیت میں من کُل الوجوہ اعتدال و میانہ روی کو عملی صُورت میں رواج دیا۔" راجہ رام موہن رائے جب یُونانی و عبرانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے سیرامپور گئے تو وہاں ولیم کیری صاحب نے ستی کی رسم کے خلاف اُن کو اُبھارا اور آخر کار اُن دونوں کی کوشش سے سرکار اِس رسم کے خلاف قانُون نافذ کرنے پر مجبُور ہوئی۔ اور ولیم کیری صاحب کے تبلیغی اثر سے سرکار نے ہندوستان کی قبیح رسُوم کو مثلاً دُختر کُشی وغیرہ کو قانُوناً بند کیا۔ جس طرح مکان کے اندر چراغ کے داخل ہونے سے چھت کے جالے۔ دیواروں کی گرد آلودگی و گندگی۔ شہتیروں کی بوسیدگی اور فرش کی ناہمواری و غلاظت صاف نظر آتی اور صاحبِ خانہ کو اپنے مکان کی ایسی ردّی حالت سے نفرت و کراہیت پیدا ہو کر اُس کی قطع و برید اور صفائی کا فوری خیال پیدا ہوتا ہے۔ اِسی طرح مسیحیت جو ایک چراغ معرفتِ الٰہی اور مفارقِ سفیدی و سیاہی ہے جب ظلمت کدۂ ہند میں داخل ہوا تو ہر مذہب کو اپنے اپنے معائب و نقائص صاف صاف نظر آنے لگے۔ اور اِس چراغ معرفت و حقیقت اور شمعِ فیضان و صداقت کی آمد سے ہر کسی کو اپنے اپنے گھر کی پڑ گئی۔ اور مسیحیت کے اخلاقِ فاضلہ اور شمائلِ حسنہ کی روشنی میں ہر مذہب و ملت نے اپنے اپنے مذہبی عقائد و رسُوم اور اخلاق و آداب کی ترمیمات اور نئی نئی تاویلیں و تشریحیں کر کے مسیحیت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور تمام ہندوستان میں سوشل ریفرمیشن کے آثار نظر آنے لگے۔ اور مسیحیت نے نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے خارستان کو گُل و گلزار بنایا

بلکہ ہمہ اقوامِ عالم میں باوجود انتہائی مشکلات کے اپنی ترویج و اشاعت کیلئے میدان تلاش کر لئے۔ اِس وقت انجیل مقدس کے تراجم قریب نوصد (۹۰۰) زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اور یہ ترجمے و تفسیریں دوسری صدی عیسوی سے ہی ہوتے آئے ہیں کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ آج مسیحیت کی تقلید پر قرآن شریف بھی چند زبانوں میں چھپنے لگا ہے تاکہ مسیحیت کی طرح اپنی عالمگیری کا دعویٰ کر سکے۔ اور وید وغیرہ اہل ہنود کی مذہبی علماء کی جانکاہیوں اور دیدہ ریزیوں سے انگریزی اور چند دیگر زبانوں میں نظر آئے۔ اور اب چند مشرقی زبانوں میں بھی ملبس نظر آنے لگے ہیں۔ یہ سب مسیحیت کی خوشہ چینیوں کے نتائج ہیں۔ آج سے پیشتر کبھی ویدوں نے سوائے سنسکرت کے کسی اور زبان کا منہ بھی دیکھا؟ کبھی ادنےٰ اقوام میں اُن کی منادی کی گئی؟ اور اچھوتوں کو وید کے واعظ ہونے کا حق دیا گیا؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اُن کو وید پڑھنا گناہِ کبیرہ سمجھا گیا۔ آج کیوں اچھوتوں کو وید پڑھنے سے منع نہیں کیا جاتا؟ آج کیوں گھر گھر میں وید پڑھے ہیں؟ آج کیوں شدھی سنگٹھن قائم ہیں؟ صرف مسیحیت کی نظیر فیض اثر کے نتائج ہیں۔ مسیحیت بغیر کسی سیاسی غرض کے صرف خداوند مسیح کے ارشادِ فیض بنیاد کی تعمیل کی خاطر اچھوت و پسماندہ اقوام کو وقت قابلیت اور سیم و زر خرچ کر کے اپنے میں ملا کر اونچ نیچ کے مذموم امتیازات کو مٹا رہی ہے۔ ہندو مسلم اقوام وہ بڑے درخت ہیں۔ اور پسماندہ گروہ چھوٹے چھوٹے پودے جو اُن کے سایہ میں صدیوں رہ کر نشوونما پانے کے ناقابل رہے۔ مسیحیت اِن کمزور اور نیم جان پودوں کو اُن کے نیچے سے اُکھاڑ کر علیحدہ لگاتی اور تعلیم و تہذیب کے پانی سے سینچتی ہے۔ تاکہ وہ بھی اُن تناور درختوں کی طرح پرورش پا کے سربلند و سرفراز ہو جائے۔ انجیل تمام اقوامِ عالم کو ایک دوسرے کے بھائی

اور ایک ہی نسل و خاندان کے آدمی بیان کرتی ہے۔ "اور اس (خدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی۔" (اعمال ۱۷: ۲۶ و کلسی ۳: ۱۱ و گلتی ۳: ۲۷ - ۲۸) اور مسیحیت ہی واحد عالمگیر مذہب ہے۔ اور تمام دنیا کا دستور العمل ہونے کی کامل اور اکمل۔ قابلیت وصلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کھانے پینے پہننے کے متعلق کوئی قید نہیں لگاتا۔ ذات پات کے مخصوص و الجھیڑوں کو جائز نہیں سمجھتا۔ تلوار و خنجر اور تیغ و تفنگ اور باہمی منافرت و مخاصمت کے برخلاف سخت امتناعی احکام لگاتا ہے مسیحیت ایک خورشید رخشاں ہے اور تمام دیگر مذاہب ستارے مسیحیت ایک بحر بیکراں ہے اور تمام دیگر مذاہب ندی نالے۔ آخران سب ندی نالوں اور دریاؤں وغیرہ کو اسی ایک سمندر (مسیحیت) میں آکر گرنا ہے۔ "پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔" (یوحنا ۱۰: ۱۶ فلپی ۲: ۱۰ - ۱۱ وافسی ۱: ۱۰ متی ۲۸: ۱۸ - ۱۹ و اعمال ۴: ۱۲)۔

لوگ مذہب سے کیوں بیزار ہیں؟

آج کل لاکھوں لوگ مذہب سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اور ایسے حضرات تمام خرابیوں کی جڑ مذہب کو قرار دیتے ہیں۔ اور مذہب کی جان کا فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اس بیجا نیت کی اولیت کا سہرا بالخصوص اُن سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں کے سر ہے جنھوں نے اس بیسویں صدی کے آغاز سے آج تک جنم لیا ہے۔ اور بالعموم ہندو مذہب کی ناستک تعلیمات کے سر ہے جس نے لوگوں کو خدا اور مذہب کی طرف سے لاپرواہ کر دیا ہے۔ اور تیسری وجہ مذہب سے بیزاری کی مغربی خیالات و نظریات کی ہند میں ترویج ہے۔ مذہب تو انسانی فطرت کا ایک جزو غیر منفک ہے۔ اور اس سے پیچھا چھڑانا فطرۃ کے خلاف جہاد ہے۔ البتہ یہ بات سو فیصدی درست ہے کہ نقلی مذاہب جو لوگوں کے خود ساختہ ہیں ضرور موجودہ انحطاط و تخریب کے ذمہ دار ہیں۔ اور ان کا استیصال

ہی تعصب۔ مخاصمت ومنافرت۔ حسد وکینہ اور خود غرضی کے وجود کے لئے جو اِس وقت اِنسانیت کے عروق میں خونِ حیات بن کر تیر رہے ہیں موت کا پیغام ہو سکتا ہے۔ لیکن اِس اقدام سے پہلے نقلی و اصلی مذاہب کی تحقیق ضروری ہے۔ ہم آگے چل کر مناسب مقام پر اِس موضوع کو چھیڑیں گے۔ فی الحال اِنسان کی مذہبی بیزاری کے موجبات کا سراغ لگانا انسب اور ضروری ہے۔

وجہ اوّل۔ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا ہماری حسب منشاء ہو۔ جو ہم چاہیں وہ پورا کرے۔ اور جدھر ہم چاہیں اُسے پھیر لیں۔ وہ ہماری جائز و ناجائز خواہشات کے پورا کرنے میں ذرا پس وپیش نہ کرے۔ اگر آدھے لوگ چاہیں کہ بارش نہ ہو اور آدھے چاہیں کہ بارش ہو تو خدا آنِ واحد میں ان دونوں کی خواہش کو پورا کرے۔ لوگوں نے خدا کو لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر سمجھ رکھا ہے جس کا انتخاب رائے عامہ پر منحصر ہے۔ اور جس کی عبادت مشروط اِس بات سے ہے کہ پہلے وہ اُن کی ہر طرح کی نیک وبد خواہشات کو بلاحیل وحجت پورا کرے۔ چونکہ حرص وہوا کے بندوں کی نفسانی خواہشات کا جواب خدا کی طرف سے دیا نہیں جاتا۔ اِس لئے وہ جھٹ ایسے پاک طرفہ خدا سے منکر ہو کے کسی ایسے نئے خدا کو ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہر وقت اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرے۔

وجہ دوم۔ مذہب کی پابندی نفسانیت اور دُنیا داری سے روکتی ہے۔ (متی ۱۰: ۳۷-۳۸) اور ایک ہی وقت میں اِنسان خدا اور دولتِ دُنیا کو پیار نہیں کر سکتا۔ (متی ۶: ۲۴) اور "بنی آدم کا دل اُن میں بدی پر بشدت مائل ہے۔" (واعظ ۸: ۱۱) چونکہ مذہب کی پیروی میں زخارفِ دُنیا اور جیفۂ جہان کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ اور لوگ اِس وقت اِس دلفریب ودلآویز دُنیا کے تیرِ نگاہ کے زخم خوردہ ہیں۔ اور مذہب کی بُنیاد پر دولت پرستی۔ اقبال وکامرانی۔ نفسانیت وعشرت پرستی

اور حکومت و سیاست کی نظر فریب عمارتیں اُٹھا چکے ہیں۔ اور ان دلکش مگر فانی عمارتوں کو ڈھانا اور مذہب کی محبت کو دل میں بٹھانا اُن کے بنے ہوئے ضمیر کے لحاظ سے زیادہ محال معلوم ہوتا ہے۔ اِس لئے وُہ مذہب کو اپنی نفسانی خواہشات کی راہ میں سد سکندری سمجھ کر اُسے اُٹھا پھینکنا چاہتے ہیں۔ مذہب اور نفسانیت دو متضاد اشیاء ہیں۔ اور ایک ہی وقت میں ایک شخص اِن دونوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ "کیونکہ جسم رُوح کے خلاف خواہش کرتا ہے اور رُوح جسم کے خلاف اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ تاکہ جو تم چاہتے ہو وُہ نہ کرو" (گلتی ۵: ۱۷ و اکرنتھی ۲: ۱۴)۔

وجہ سوم۔ مذہبی احکام اور تعلیمات کا رُوحانی نکتہ نگاہ بہت بلند و بالا ہے۔ اِس لئے عامۃ الناس اُن تعلیمات کو صرف سُن اور پڑھ کر ہی محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔ اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کا عملی پہلو بہت پست اور کمزور ہو چکا ہے۔ اب ان مذہبی درس و تدریس اور قوانین پر عمل کرنا محال و ناممکن سمجھ کر مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ مذہب کا نکتہ نظر نہایت اعلیٰ و ارفع ہے اور کاش ہم اُس تک پہنچ سکتے۔ اِس صورت میں مذہب کی فضیلت کا اقرار اور اپنی نقابلیت کا انکار ہوتا۔ لیکن یہاں مذہب کا انکار اور اپنی قابلیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ تو اُس شخص کا سا حال ہُوا جو کبھی اُستاد کامل کے آگے زانوئے شاگردی تہ کر لیتے تو عار کرتے۔ اور جب علم حاصل نہ ہو سکے تو کہے کہ علم فضول شے ہے اور اس کا وجود عدم برابر ہے۔

وجہ چہارم۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں خدا دکھاؤ۔ بغیر دیکھے ہم اُس کو کیسے مان

نہیں ؟ اگر خُدا اپنی شانِ کبریائی و اُلوہیت کے ساتھ نادیدہ و پوشیدہ اور فوق الفہم و ادراک رہے تو لوگ اُس کو کسی دیدنی و ظاہری صُورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وُہ دیدنی صُورت میں ظاہر نہ ہو تو اُس کی ہستی کے متعلق شکوک میں پڑ کر آخر اُس سے مُنکر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وُہ کسی دیدنی مظہر یں مجسّم اختیار کر کے مرئی و مجسّم ہو جائے اور انسان کی فہم و سمجھ کے مطابق اُس کی خُدا بینی کی خواہش کا جواب دے تو لوگ اُس کو محض ایک مجذوب و رسیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کر اُس کی اُلوہیت و خُدائی کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ اب بتلایئے ان دو صُورتوں کے علاوہ اور کونسی تیسری صُورت ممکن ہے جس سے خُدا انسان کی آرزوؤں کو پُورا کر سکے۔

وجہ پنجم۔ درحقیقت لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے مجموعہ مُرکّب سے بیزار ہیں۔ آپ یہ خُوب ذہن نشین کر لیجیئے کہ اُمورِ معاشرت ہرگز مذہب کا جُزو نہیں ہیں۔ جس طرح لوہا نہ نہیں اور نہ زر لوہا ہے۔ اسی طرح معاشرت مذہب نہیں اور مذہب معاشرت نہیں ہے۔ روٹی سے بھُوک مٹتی اور پانی سے پیاس تو بُجھتی ہے مگر جس طرح روٹی سے پیاس نہیں بُجھ سکتی اور پانی سے بھُوک دُور نہیں ہو سکتی۔ اُسی طرح معاشرت کو مذہب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی مذہب معاشرت کی جگہ لے سکتا ہے۔ دونوں کے اغراض و مقاصد میں بُعد المشرقین ہے۔ کھانا پینا اور پہننا (اُمورِ معاشرت) حوائج جسمانیہ و نفسانیہ کی آسُودگی کے لئے ضرُوری ہے۔ اور مذہب حوائج رُوحانیہ و خواہشاتِ اخلاقیہ کی تسکین و آسُودگی کا ذمہ وار ہے۔ دونوں کے مقاصد میں مغائرت و تفاوت اظہر من الشمس ہے۔ خُدا کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اِس لئے "خُداوند نے ہر ایک چیز خاص مقصد کے

لئے بنائی" (امثال ۱۶: ۴) دراصل امورِ معاشرت کو غلطی سے مذہب کا جزو سمجھ کر لوگوں نے تمدنی معاشرتی اور سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مذہب کی آڑ میں جھگڑے کھڑے کر کے مذہب کو بدنام کر رکھا ہے۔ اور اسی قسم کے جھگڑے ہمارے ملک میں لاانتہا قتل و خون اور غارت گری اور منافرت کا صریح سبب ٹھہرے ہیں۔ خون کرواتے ہیں۔ ان میں سے ایک سور اور گائے کا مسئلہ ہے۔ حیوانی جانوں کی حفاظت کی خاطر انسانی جانوں کو ہلاک کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر حیوان کو مارنا گناہِ صغیرہ ہے تو انسان کو مارنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اس صورت میں صغائر کی مدافعت کے لئے کبائر کے مرتکب ہونا کیسی نامعقول فلاسفی ہے۔ جب تک کھانے پینے اور مختلف ظاہری امتیازی نشانات رکھنے کو مذہب کا جزو سمجھا جائیگا تب تک ہماری سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی رہیں گی۔ اور اتحاد تعاون و اشتراک کے الفاظ ایک قالبِ مردہ کی طرح روحِ معانی سے تا ابد خالی رہیں گے۔ ان الفاظ کو اگر شرمندۂ معانی بنانا مقصود ہے تو معاشرت کو مذہب سے جدا کر کے دونوں میں امتیازی حد لگا دو۔ افسوس کا مقام ہے کہ غیر مسیحی اکثریت کا ظالمانہ دنیوی اقتدار انجیل کے ہمہ گیر و ہمہ رس روحانی مذہب کو گوشۂ لحد میں لٹا دینے کے لئے محض اس واسطے تلا ہوا ہے کہ وہ معاشرت کو مذہب کا جزو نہ سمجھتے ہوئے دونوں کو الگ الگ رکھتا ہے۔ انجیل کا فرمان ملاحظہ ہو۔ "کھانا ہمیں خدا سے نہیں ملائیگا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں۔ اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں" (اکرنتھی ۸: ۸) "کوئی چیز بذاتہ حرام نہیں۔ لیکن جو اس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔ اگر تیرے بھائی کو تیرے کھانے سے رنج پہنچتا ہے تو پھر تو محبت کے قاعدے پر نہیں چلتا" (رومی ۱۴: ۱۴-۱۵) "کیونکہ خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف

ہے جو رُوح القُدس کی طرف سے ہوتی ہے۔" (رُومی ۱۴: ۱۷) "کیونکہ خُدا کی پیدا کی ہُوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز اِنکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شُکرگزاری کے ساتھ کھائی جائے۔" (۱ تمتھیس ۴: ۴)۔

"جب تُم مسیح کے ساتھ دُنیوی اِبتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ آدمیوں کے حُکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو۔ کہ اسے نہ چُھونا۔ اُسے نہ چکھنا۔ اُسے ہاتھ نہ لگانا" (کُلسی ۲: ۲۰-۲۱)۔ پھر ختنے کے اِمتیازی نشان کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ "نہ ختنہ کوئی چیز ہے۔ نہ نامختُونی۔ بلکہ خُدا کے حُکموں پر چلنا ہی سب کچھ ہے۔" (۱ کرنتھی ۷: ۱۹ و کُلسی ۳: ۱۱) طبی نکتہ نگاہ سے گائے، سُور کے گوشت اور حُقہ نوشی کے فوائد یا نقائص کچھ ہی ہوں۔ پر طبی و معاشرتی معاملات پر رائے زنی کرنا مذہب کا کام نہیں۔ شراب کو اگر مذہب ناجائز قرار دیتا ہے تو محض اِس لئے کہ اُس کے معائب و نقائص کا پلڑا اُس کے فوائد کی بہ نسبت بہت بھاری ہے۔ اِنسان شرابی ہو کر بدکلامی کرتا۔ گالیاں دیتا۔ لڑائی دنگا کرتا۔ اور مدہوش ہو کر خُدا کی عبادت سے اِضطراری طور پر غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن گوشت خوری و حُقہ نوشی سے نہ تو مدہوش ہو کر عبادت میں غفلت کر سکتا اور نہ ہی اُن سے کسی قسم کی بے ہوشی طاری ہو کر کسی ناجائز حرکت یا فعل کے صدور کا امکان ہوتا ہے۔ اگر شراب نیک نیتی سے حالات پیش آمدہ کے مُطابق جائز فائدہ کے حصُول کے لئے (مثلاً بطور دوا) استعمال کی جائے۔ تو کم از کم مسیحیت اُس کی مخالف نہیں ہے۔ دیکھئے سنکھیا شراب کی بہ نسبت زیادہ خطرناک اور مُہلک شئے ہے۔ لیکن ہر مذہب کا مریض اطباء سے دوا کے طور پر لے کر استعمال کرتا ہے۔ صرف نیت کی نیکی یا بدی کی بات ہے۔ اگر کوئی نیک نیتی سے سنکھیا استعمال کرے تو مرض سے

شفا بالکل ہے۔ اور اگر بدنیتی (خودکشی کے لئے) سے استعمال کرے تو نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔ اور یہی گناہ ہوتا ہے۔ یہی حال شراب کا ہے۔ ہر شے میں حد سے تجاوز کرنا مضرت رساں ہے۔ اور امورِ معاشرت میں یہ اصول بالکل درست ہے۔ پھر ذات پات اور اونچ نیچ کے امتیازات مسیحیت کے باہر تمام مذاہب میں نمایاں اُبھری ہوئی جگہ رکھتے ہیں۔ اس امتیاز پسندی کے اختلال و خبط نے مذہبی دیوانوں کے دماغ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ اور ہر متعصب و ناراض شخص اپنی ضمیر شکنی کئے بغیر ان کو انسان تصور نہیں کہہ سکتا ہے۔ دُنیا کے اندر جہاں تعصب برِصغیر کی تباہ حالی۔ عدم تعاون عدم اشتراک اور عدم مساوات کی حمایت کرنے والی یہی ذات پات کی واہیات رسمیں و رسوم ہیں۔ یہاں بر صغیر ایک مستقل مذہب کا قائم مقام ہے۔ یہ سب غیر مشرقی امور ہیں۔ مذہب کے اندر ان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور مسیحیت واحد حقیقی مذہب ہے جو ذات پات کے امتیازات کی بنیان پر فاتحہ پڑھنے میں نہایت سرگرداں واقع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو "اُس (خدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی۔" (اعمال ۱۷: ۲۶) "نہ یہودی رہا نہ یونانی۔ نہ ختنہ نہ نامختونی۔ نہ وحشی۔ نہ سکوتی نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے۔" (کلسی ۳: ۱۱) "اور تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا۔ نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی۔ نہ کوئی غلام نہ آزاد۔ نہ کوئی مرد نہ عورت۔ کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔" (گلتی ۳: ۲۷ - ۲۸) مسیحیت کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب آقا و غلام اور محمود و ایاز کو سلک اتحاد و اشتراک میں منسلک کرکے ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ البتہ آج ہر مذہب مسیحیت کی ادھوری اور ناتمام سی نقل ضرور اتار رہا ہے۔

تاہم نقل نقل ہی ہے اور اصل اصل۔

کچھ سال ہوئے ایک شخص میرے ساتھ مذہب کے متعلق بات چیت کرنے آیا۔ اور اُس نے حسب معمول گوشت خوری کے جواز و عدم جواز کے متعلق گفتگو چھیڑ دی۔ میں اُس بحث کا خلاصہ اِس جگہ پیش کرتا ہوں تاکہ معاشرت و مذہب کے موضوع پر زیادہ روشنی پڑے۔

ہندو صاحب۔ صاحب تم لوگ گوشت کھاتے اور جیو ہتیا جیسے مہاں پاپ کے مرتکب کیوں ہوتے ہو؟

راقم۔ پہلے آپ میرے سوالات کا جواب دیں۔ پھر میں آپ کے سوال کا معقول اور تسلی بخش جواب دوں گا۔

ہندو صاحب۔ بہتر! فرمایئے۔

راقم۔ آپ انسانی اجسام، حیوانی اجسام اور نباتی اجسام میں کیا فرق مانتے ہیں؟

ہندو صاحب۔ انسانی اجسام کو ہم ارواح کے اصلی گھر مانتے ہیں۔ اور حیوانی و نباتی اجسام کو قیدیں۔ یا یوں سمجھیں کہ جسم انسانی کرم جونی اور جسم حیوانی و نباتی بھوگ جونی ہیں جب روح انسانی جسم میں رہ کر بُرے اعمال کرتی ہے۔ تو وہ اُن کا پھل بھوگنے کے لئے حیوانی و نباتی اجسام (قیدوں) میں ڈالی جاتی ہے۔

راقم۔ بہت خوب! میں نے آپ کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ اب مجھے یہ بتلایئے کہ کسی قیدی کو قید سے رہا کرنا یا کروانا رحم میں داخل ہے یا نہیں؟

ہندو صاحب۔ جی ہاں! قیدیوں اور مظلوموں پر رحم کرنا نہایت مستحسن فعل ہے۔ اِسی واسطے ہم لوگ اندھوں لنگڑوں اور اپاہجوں اور

حیوانات پر رحم کرتے ہیں۔ ہمارے گئوشالہ اور یتیم خانے اِس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔

راقم۔ بہت بہتر! تو اب اپنے سوال کا جواب سُنیئے۔ ہم نباتات کو کھاتے ہیں تاکہ قیدی ارواح کو نباتی اجسام سے آزاد کریں۔ لیکن وہ ارواح نباتی قیود سے چھوٹ کر فوراً حیوانی اجسام میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ہماری ہمدردی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ انہیں حیوانی قیود میں رہنے دیں۔ چنانچہ ہم حیوانات کو کھا لیتے ہیں۔ حیوانی قیود سے نکل کر ارواح انسانی قالبوں میں یعنی اپنے اصلی گھروں میں آجاتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہم انسانوں کو نہیں کھاتے۔ ہم اُن قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے اصلی گھروں میں پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ آپ بھی اس پُراُپکار میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں یعنی نباتات کو کھاتے ہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اور ہم اُن کی آزادی کی خاطر ایک اور کٹھن منزل کو طے کرتے ہیں۔ کہو صاحب پھر گوشت کھانا کیسے پاپ ٹھہرا؟

ہندو صاحب۔ واہ صاحب! آپ نے نئی فلاسفی سے اِس مسئلہ کو حل کیا۔ لیکن میرا دل قائل نہیں ہوا۔ ہم تو "اہنسا پرمو دھرما" کے قائل ہیں۔

راقم۔ خیر آپ قائل رہیں۔ لیکن اِس مسئلہ کی حمایت سے آپ کی مشکلات بہت بڑھ جائیں گی۔

ہندو صاحب۔ وہ کیسے؟

راقم۔ اوّل تو یہ بدھ مت کی تعلیم ہے۔ اور ویدوں کے صریح مخالف ہے۔ ویدوں میں اسومیدھ یگ گئو میدھ یگ اور نرمیدھ یگ (انسانی قربانی) کے احکام صاف موجود ہیں۔ اور اُن پر صدیوں عمل درآمد

ہوتا رہا ہے۔ مغربی مسیحی علماء کے علاوہ ڈاکٹر راجندر لال مترا جیسے وحید
العصر اور یگانۂ روزگار سنسکرت عالم نے بھی ویدوں کی کامل تحقیق و
جستجو کے بعد صاف اقرار کیا۔ کہ "ویدوں میں جانوروں کی قربانی کا
ویسا ہی حال ہے جیسا توریت کی کتاب احبار میں" (دیکھو ڈاکٹر مذکور
کی تصنیف "انڈو آرینس") بدھ مذہب کے عروج اور ویشنومت
کے عروج و اثر نے ان ویدوں کی تعلیم کو زوال پہنچایا۔ اسی وقت سے یہ
قربانیاں تو بند ہو چکیں لیکن ویدوں میں اُن کے احکام اب بھی اُسی
طرح موجود ہیں۔

دوم۔ لیکن اب بدھ کی تعلیم سے بھی آپ کا دامن چھوٹ نہیں سکتا۔
یعنی "اہنسا پرمو دھرما" کے اصول پر عملدرآمد قطعی محال ہے۔ دیکھئے
پانی اور ہوا اور نباتات میں بے شمار جیو موجود ہیں لیکن آپ ان کو استعمال
کرتے ہیں پلیگ کے دنوں میں کروڑوں چوہے عدم آباد پہنچائے جاتے
ہیں جراثیم کی برکت سے ملیریا اور ہیضہ و تپ دق وغیرہ امراض لاحق
ہوتے ہیں۔ ایسے امراض میں مریض کو دوا دینے یا ٹیکہ کرنے سے یہی
مقصد ہوتا ہے کہ بیماری کے جراثیم دوا کے زہر سے ہلاک ہو جائیں۔
کپڑوں یا بالوں میں جوئیں پڑ جائیں یا گندے پانی پر مچھر پیدا ہو جائیں۔
یا مکھیاں ہیضے کے ایام میں بڑھ جائیں تو اُن کو فنا کر دیا جاتا ہے۔
زہریلے جانوروں کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ ٹڈی دل کے انڈوں بچوں کو
زندہ دبا دیا جاتا ہے۔ کیا کوئی آریہ یا ہندو ڈاکٹر اس خلافِ فطرت اصول
پر عمل کر سکتا ہے؟ ہاں! اگر حکمت و طبابت کو بند کر دیا جائے۔ اور
انسانی زندگی کی قیمت ایک مچھر کے برابر سمجھی جانے لگے تو یہ ہو سکتا ہے۔

سوم - آپ رُوح کو قدیم اور ناقابلِ فنا سمجھتے ہیں۔ اِس صُورت میں گوشت خوری سے جیو ہتیا تو نہیں البتہ پرکرتی (مادّہ) ہتیا ہو سکتی ہے - پھر آپ پرکرتی کو بھی قدیم اور غیر فانی مانتے ہیں۔ تو اِس صُورت میں جیو ہتیا پرکرتی ہتیا دونوں ناممکن ہیں - کیونکہ مادہ و اَرواح ناقابلِ فنا ہیں -

چہارم - جیو ہنسا خلافِ فطرت نہیں بلکہ موافقِ فطرت ہے - ایک زندگی کا قیام دُوسری زندگی کی فنا پر منحصر ہے - مثلاً بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا کر جیتی ہیں - اِسی طرح تمام موجُودات پر غور فرمائیے -

پنجم - اگر کہو کہ یہ قانُون صرف حیوانات کے لیئے ہے اِنسان کے لیئے نہیں۔ تو اوّل تو اِس میں یہ قباحت آئے گی کہ اِنسان بھی حیوانات میں شامل ہے۔ وُہ حیوانِ ناطق مسلّم ہے - لیکن اِس سے بڑھ کر یہ امر قابلِ غور ہے کہ دُنیا کے بعض حصص ایسے بھی ہیں کہ وہاں نباتی زندگی قطعی ناپید ہے مثلاً سائیبریا کے میدان کے باشندے اور اسکیمو لوگ صرف گوشت کھاتے اور کھالیں پہنتے ہیں - اب آپ کا یہ استقراء ٹوٹ گیا کہ انسان کے لیئے گوشت کھانا گناہ ہے - کُل اِنسانوں کے لیئے گوشت خوری گناہ ہے یہ غلط ہے - اگر "کُل" کی جگہ "بعض" استعمال کریں تو پھر ہم "بعض اِنسانوں" سے ہندُو آپ مُراد لیں گے - یعنی اِنسان کُلی کے بعض افراد ہندو ہی کے لیئے گناہ ہے - اگر اہنسا پرمو دھرما "خُدا کا ایک عالمگیر قانُون ہے" تو اِس پر عمل در آمد ناممکن ہے - اور پھر کیا یہ کیا دل لگی ہے کہ بعض اقوام (اسکیمو وغیرہ) کا جینا صرف گوشت خوری ہے - مسیحی کھانے پینے کو مذہب کا کوئی حصّہ نہیں سمجھتے - مذہب رُوحانی زندگی سے متعلق ہے نہ کہ جسمانیات سے - اگر ہم گوشت کھائیں تو مذہب کی خلاف ورزی نہیں

اور اگر نہ کھائیں تو مذہب کی اطاعت نہیں۔ حکم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک امر۔ دوسرا نہی۔ جیسے گناہ نہ کرو یہ نہی ہے۔ نیکی کرو یہ امر ہے۔ لیکن گوشت کے متعلق یہ دونوں قسم کے حکم نہیں ہیں۔ اس لئے امورِ معاشرت اختیاری باتیں ہیں اور مذہب کا جزو نہیں ہیں۔ "پس تم کھاؤ یا پیو یا جو کچھ کرو۔ سب خدا کے جلال کے لئے کرو" (اکرنتھی ۱۰: ۳۱)

وہ صاحب اِن دلائل سے قائل ہو کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی درشن نہ دئے۔ میرا مقصد یہ نہ تھا کہ اُس کو دلائل سے ہرا دوں۔ بلکہ صرف اظہارِ حق سے غرض تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ معاشرت و مذہب کی تفاوت و مغائرت کو سمجھ لے۔ اب میں پھر پہلے جملے کو دوہراتا ہوں کہ لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے معجونِ مرکب سے بیزار ہیں۔

ششم۔ حضور خداوند مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ "تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ" (متی ۲۸: ۱۹) اور کہ تم "زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گے" (اعمال ۱: ۸) جب اُس قادر ہستی نے یہ حکم دیا تو اس کی تعمیل کے لئے اس قسم کی آسانیاں بھی بہم پہنچا دیں کہ جن سے مذہبِ الٰہی کی ترویج و اشاعت ہر جگہ بلا وقت ہو سکے۔ اور مبشرانِ انجیل کے ذہنوں کو اس قدر روشن کر دیا کہ وہ دنیا کے گمنام حصص اور دُور دراز اقالیم و ممالک کی دریافت میں کامیاب ہو گئے۔ اور تمام ملکوں کے راستے کھل گئے اور ذرائع آمد و رفت نہایت آسان ہو گئے۔ اور چھاپہ کی مشین کی ایجاد سے انجیل کی اشاعت کو بہت مدد ملی۔ اور چھاپہ کی ایجاد سے وہ تمام مشکلات جو مختلف فلسفوں کی ترویج و تشہیرِ عام کی سدِّ راہ تھیں یکسر دُور ہو گئیں۔ اور ذرائع سفر کی آسانیاں ایک ملک کے فلسفوں و خیالوں کو دوسرے ملکوں

ہیں بڑھ گئیں۔ پہلے ایک دو فلسفوں سے ایک ذہن آشنا ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں کی لکھی ہوئی کتابیں ایک تو گراں قیمت پر ملتی تھیں۔ اور پھر دوسرے ممالک کے راستے نامعلوم ہونے کے باعث ہر جگہ مروّج نہ ہو سکتی تھیں۔ اس لئے بہت کم لوگ اُن سے واقف ہو سکتے تھے۔ اور لوگ غیر ممالک کے مذہبی فلسفوں سے نابلد و بے نصیب رہتے تھے۔ اب سینکڑوں فلسفوں اور نظریوں نے دماغ کو متعدد و مختلف خیالات کی گھڑ دوڑ کا میدان بنا رکھا ہے۔ اور مختلف فلسفوں اور علوم نے باہم انجذاب و تجذیب اور تاثر و تاثیر کر کے ایک نیا خمیر اُٹھایا ہے جس کو "مذہب سے بیزاری" کہنا درست ہے۔ اب لوگ اس کشمکش و پیچ میں ہیں کہ کس خیال یا نظریہ کو اپنائیں اور کس کو ترک کر دیں۔ اتنے کثیر خیالات کا موازنہ و مقابلہ کر کے کسی صحیح عقیدہ کی بنیاد رکھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ آخر انسان کا محدود دماغ کیا کرے۔ اس ذہنی کشمکش و بے چینی سے لاچار ہو کر لوگ مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں۔ عقائد کی روز افزوں کثرت بھی مذہب کی بے قدری کا موجب ہے۔ کیونکہ جس قدر کسی چیز کی زیادتی ہو اُسی قدر لوگ اس کی بے قدری کرتے ہیں۔

مذہبی بیزاری کا علاج ہم اس بیان کے آغاز میں ذکر کر چکے کہ مذہب انسان کی فطرت کا جزوِ اعظم ہے۔ اور اُس سے دامن چھڑانا مشکل ہے۔ جب لوگ خدا کو چھوڑ دیتے ہیں تو اُن کو ایک فرضی معبود ایجاد کرنا پڑتا ہے۔ ویدو سماجیوں نے خدا کو چھوڑا تو انہیں ستیہ نند اگنی ہوتری موجد دیو سماج کے سنگین مجسمہ پر جبینِ نیاز رگڑنی پڑی۔ اسی طرح بُت پرستوں نے خدا کی جگہ فرضی بُت بنا کر اُن کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب انسان

کی فطرت ہے۔ اور اُس کی قیوُد سے آزاد ہونا محال۔ جب مذہب کی ضرورت ثابت ہوگئی تو اب موازنۂ مذاہب سے اِس امر کا کھوج لگانا ضروری ہے کہ کونسا مذہب خُدا کا عطا کردہ ہے۔ ہم "عقل اور مذہب" کے بیان میں بخوبی ثابت کر چکے کہ خُدا ایک ہے اور اُس کا مذہب بھی ایک ہے۔ اب ہم ایک سادہ سا معیار پیش کریں گے جس سے ناظرین کو مذہب الٰہی اور انسان کے اختراعی مذاہب میں نمایاں امتیاز نظر آئے گا۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ عقلمند والدین اپنے بچوں کو ہمیشہ وُہ چیز دیتے ہیں۔ جس کی اُن کے پاس کمی ہو۔ اور ضرورت بھی اُسی شئے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ "تم میں ایسا کونسا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وُہ اُسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے۔ پس جبکہ تم بُرے ہو کر اپنے بچّوں کو اچھی چیزیں دینی جانتے ہو۔ تو تمہارا آسمانی باپ جو آسمان پر ہے۔ اپنے مانگنے والوں کو اچھّی چیزیں کیوں نہ دیگا؟" (متّی ۷۔ ۹۔ ۱۱) اگر ایک بچّے کے پاس دس جوڑی کپڑے ہوں۔ اور وُہ پاؤں سے بالکل ننگا ہو۔ اور اُس کے والدین اُس کو کپڑے دو جوڑی اور بنا دیں مگر جُوتی بنوا کر نہ دیں۔ تو کیا اُس بچّے کی ضرورت پُوری ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ جس چیز (جُوتی) کی ضرورت اور کمی تھی وُہ اُسے دی نہیں گئی اور جس شئے کی کمی نہ تھی بلکہ افراط تھی وُہ دے دی گئی۔ لہٰذا وُہ اُس کی ضرورت پُوری نہ ہُوئی۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص فاقہ زدہ گرسنگی سے لاچار ہو کر لب دریا بیٹھا ہُوا ہے۔ اِس حالت میں اگر کوئی ازراہِ رحم پانی کا گلاس اُسے لا کر دیوے تو کیا اُس کی ضرورت پُوری ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ پانی کی تو اُس کے پاس پہلے ہی قلّت نہیں بلکہ افراط ہے۔ اور روٹی جس کی

سخت حاجت تھی وُہ اُسے مِلی نہیں۔ اَور ضرُورت اُس شئے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ خُدا دُنیا کا باپ ہے وُہ بھی دُنیا کو ایسا ہی مذہب دیتا ہے جس کی دُنیا کو ضرُورت ہو۔ اِس وقت دُنیا میں نا اِتّفاقی۔ عداوت۔ خصُومت فساد تکبّر۔ خود غرضی۔ تیغ و تبر کی مُحبّت اَور سیاسی و تمدّنی تعصبوں کی کثرت ہے۔ اب اگر کوئی مذہب دُنیا کو یہی چیزیں دیوے تو ظاہر ہے کہ ان کی تو آگے ہی کیا کمی ہے۔ بلکہ اُن کی کثرت نے اہلِ دُنیا پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اب دیکھئے کہ دُنیا میں کمی کس شئے کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محبّت اَور میل مِلاپ کا اِس وقت قحط پڑا ہُوا ہے۔ لہٰذا خُدا کا عطا کردہ مذہب وہی ہوسکتا ہے جس میں میل مِلاپ اَور مُحبّت کی تلقین ہو۔ اَور دُشمنی۔ عداوت اَور شمشیر زنی کے خِلاف سخت اِمتناعی احکام ہوں۔ کیونکہ معاشرت و سیاست ہرگز مذہب کے جُز نہیں ہیں۔ اب مختلف مذاہب کی تعلیمات کو اِس معیار پر رکھ کر دیکھ لیجئے۔ کرشن بھگوان گیتا میں ارجن سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "اے ارجن جو تُو یُدھ میں لڑکر مریگا تو سُرگ کو جانے پراپت ہوگا۔ اَور جو جیتے گا تو راج کے بھوگ بھوگے گا۔ اِس کارن سے اُٹھ کر یُدھ کر۔ لابھ اَور ہان اَور سُکھ اَور دُکھ اَور جیت ہار کو سمان جان کر یُدھ کر۔" (بھگوت گیتا دوتیہ ادھیائے آیت ۳۷ و ۳۸) یہاں سُرگ اَور راج کے بھوگوں کی تحریص دِلا کر ارجن کو جنگ و جدل کے لئے اُبھارا جاتا ہے۔ حالانکہ شمشیر زنی اَور قتل و غارت کا انعام سُرگ نہیں ہو سکتا۔ محض سیاسی و دُنیوی اغراض کے حصُول کی خاطر سُرگ کا لالچ دیکر شمشیر زنی و خُون ریزی پر آمادہ و دلیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا گیتا نے دُنیا کو وُہ چیز دی جس کی دُنیا میں پہلے ہی کثرت تھی۔ اَور سیاست کو مذہب کے ساتھ مِلا دیا۔ اب قرآن شریف کی تعلیم پر غور فرمائیے جو گیتا کے مندرجہ بالا خیال کے

کے ساتھ ڈھونڈھو ملتی ہے۔ "جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو اُن کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب تم اُن میں خوب خون ریزی کر چکو تو اُن کی مشکیں باندھ لو۔ اس کے بعد یا تو احسان کرکے چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اُن کے اعمال وُہ ہرگز نہ کھوئے گا۔ اُنہیں ہدایت کرے گا اور اُن کا حال درست کرے گا۔ اور اُنہیں بہشت میں داخل کرے گا۔ جس کا بیان اُس نے اُن کے لئے کر دیا ہے۔" (سورۂ محمدؐ ۴۔ ۷ آیت و بقر ۱۸۶۔ ۱۸۹ و ۲۱۲) "جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں۔ اور جن لوگوں نے جگہ دی (نبی کو پناہ دی) اور اُس کی مدد کی وُہی ہیں مسلمان ٹھیک۔ اُن کو بخشش ہے اور روزی عزت کی۔" (سورۂ انفال آیت ۷۵) قرآن شریف نے بھی شمشیر زنی اور دُشمنی و خون ریزی کو مذہب کا جُز بنا دیا۔ اور جنگ و جدل کے ساتھ بہشتی خوشیوں کو مشروط ٹھہرایا۔ لہٰذا قرآن نے دُنیا کی ضرورت کو پُورا نہیں کیا۔ سکھ ازم اگرچہ ویدک دھرم کی ایک شاخ ہے۔ تاہم اُس کی تعلیم بھی اِس بارہ میں ہم پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ریہ راس۔ سکھ واک پادشاہی ۱۰:۔

"ہمرے دُشٹ[1] سبھی تم گھاوہ - آپ ہاتھ دے موہے بچاوہ
سُکھی بسے مورے پروارا - سیوک سِکھ سبھے کرتارا
مورا چھا نج کر دے کریئے - سب بیرن کو آج سنگھریئے
پُورن ہوئے ہماری آسا - تو ر بھجن کی رہے پیاسا
تمہیں چھاڈ کو اور نہ دھیاؤں - جو بر چاہوں سو تُم تے پاؤں
سیوک سکھ ہمارے تاریئے - چُن چُن شترو ہمارے ماریئے"
"دُشٹ جیتے اُٹھوت اُتپاتا - سگل ملیچھ کرو رن گھاتا

[1] دُشمن۔ حریف۔

اپنا جان مجھے پرت پیارے - چُن چُن سترو ہمارے مریئے
دیگ تیغ جگ میں دوؤ چلے - راکھ آپ ہُو ہے اور نہ دلے"

ناظرین خود غور کر کے دیکھ لیں کہ سکھ ازم کس حد تک دُنیا کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ تیغ و تبر کی ہدایات اور دُشمنوں کے حق میں بد دُعائیں مانگنے سے میل ملاپ اور باہمی محبّت ہرگز ترقّی نہیں کر سکتی۔ اب ہم انجیل مقدّس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ابتدا ہی میں نہایت عجز و انکسار سے گذارش کرتے ہیں کہ انجیل جلیل کے کُل ۲۷ صحیفوں میں باوجود گہری تحقیق و تدقیق کے ہمیں ایک بھی آیت ایسی نہیں ملی جو مندرجہ بالا تین کتابوں کی مذکورہ آیات و تعلیمات کے ساتھ کسی قسم کی مماثلت و مشابہت رکھتی ہو۔ اگر ایک بھی آیت ایسی مل جاتی تو ہم اُس کو ایمانداری سے پیش کر دیتے۔ اگر اور کوئی مسیحی یا غیر مسیحی صاحب انجیل مقدّس سے کوئی ایک بھی آیت جس میں عداوت، شمشیر زنی، خُون ریزی اور خود غرضی سکھائی گئی ہو پائیں تو راقم کو مطلع فرما کر مشکوری کا موقع دیں۔ اب ہم انجیل کی وُہ امتیازی تعلیم جو مسیحیت کو تمام دیگر مروجہ مذاہبِ عالم سے ممتاز کر دیتی ہے پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ذرا صدق دلی اور انصاف پسندی سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے ہم انجیل سے وُہ تعلیم پیش کریں گے جو شمشیر زنی و خُون ریزی کے خلاف ہے۔ جب خُداوند مسیح گرفتار کیا گیا تو آپ کے ایک حواری پطرس نے تلوار سے سردار کاہن کے نوکر ملخس کا کان اُڑا دیا۔ "یسُوع نے اُس سے کہا۔ اپنی تلوار میان میں کر لے۔ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وُہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے" (متی ۲۶: ۵۲ و مکاشفہ ۱۳: ۱۰) خُداوند مسیح نے مذہب کی مختصر سی تعریف اِس طرح پیش کی ہے۔ "خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبّت رکھ۔ بڑا

اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دُوسرا اُس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر
مُحبّت رکھ۔ اِن ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے۔"
(متّی ۲۲: ۳۷-۴۰) "خُدا مُحبّت ہے۔ اور جو مُحبّت میں قائم رہتا ہے وُہ خُدا میں قائم
رہتا ہے۔ اور خُدا اُس میں قائم رہتا ہے۔" (۱ یُوحنّا ۴: ۱۶) "اگر کوئی کہے کہ میں خُدا
سے مُحبّت رکھتا ہوں۔ اور وُہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جُھوٹا ہے۔ کیونکہ جو
اپنے بھائی سے جسے اُس نے دیکھا ہے مُحبّت نہیں رکھتا وُہ خُدا سے بھی جسے اُس نے
نہیں دیکھا مُحبّت نہیں رکھ سکتا۔" (۱ یُوحنّا ۴: ۲۰) اور یُوں اپنے ہم جنس
مخلُوقوں کی مُحبّت کو لازم و ملزُوم ٹھہرایا گیا ہے۔ "جو کوئی والد سے مُحبّت رکھتا ہے
وُہ اُس کی اولاد سے بھی مُحبّت رکھتا ہے۔" (۱ یُوحنّا ۵: ۱) قولِ المسیح "میں تُم سے یہ کہتا
ہُوں کہ اپنے دُشمنوں سے مُحبّت رکھو۔ اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو۔۔۔۔
اگر تُم اپنے مُحبّت رکھنے والوں ہی سے مُحبّت رکھو تو تُمہارے لئے کیا اجر ہے؟ کیا محصُول
لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے؟" (متّی ۵: ۴۴-۴۶) "اگر تیرا دُشمن بُھوکا ہو تو اُس کو کھانا
کھلا۔ اگر پیاسا ہو تو اُسے پانی پلا۔" (رُومی ۱۲: ۲۰) مُحبّت کی جامع تعریف ملاحظہ ہو۔
(۱-کرنتھیوں ۱۳) مُحبّت کا مُفصّل بیان دیکھئے۔ (قولِ خطُوط تمام)

ایک دفعہ ایک نئے تعلیم یافتہ غیرمسیحی شخص سے میری گُفتگو ہو رہی تھی۔
اور ہماری گُفتگو کا موضُوع "مذہب اور مُحبّت" تھا۔ جب میں نے مُحبّت کے
متعلق انجیلی تعلیم کو پیش کیا۔ تو وُہ فرمانے لگے کہ "بھئی وُہ کونسا مذہب ہے جو مُحبّت
کی تعلیم نہیں دیتا؟ اور کس مذہب میں شمشیر زنی و خُونریزی جائز ہے؟" میں نے
کہا کہ انجیل کے باہر تمام مذاہب میں! (یہاں سے یہ گفتگو مکالمہ کی صُورت میں چلی)

سائل۔ اگر میں اپنی مذہبی کتاب میں سے وُہ آیات پیش کر دُوں جن میں مُحبّت
کرنے کی تعلیم ہے تو پھر کیا کہو گے؟

راقم۔ آخر ایسی کتنی آیات پیش کرو گے؟

سائل۔ خواہ دو تین ہی ہوں۔ آخر خدا ہی کی دی ہوئی ہوں گی۔

راقم۔ ہاں سچ ہے کہ آپ کی کتاب میں دو تین سے زائد آیات محبت کی تعلیم نہیں دیتیں۔ پر اس سے آپ کا مذہب محبت پر مبنی ثابت نہ ہو جائیگا

سائل۔ کیوں نہیں؟ آخر وہ تین آیات بھی تو خدا کے الہام سے ہیں۔ (اُن کی منطق دیکھئے) آپ کے قائم کردہ معیار کے مطابق جس کتاب میں محبت کی تعلیم ہو وہ الہامی ہو سکتی ہے۔ میری کتاب کے اندر (نکبار) محبت کی تعلیم ہے۔ لہٰذا وہ خدا کی دی ہوئی کتاب اور دُنیا کا مذہب ہے۔

راقم۔ واہ صاحب! آپ کا فلسفیانہ استدلال خوب ہے۔ دیکھئے اگر کنکروں کے بڑے سے ڈھیر میں تین چار گندم کے دانے پڑے ہوں تو کیا وہ گندم کا ڈھیر کہلائے گا؟ ہرگز نہیں! اسی طرح جس کتاب میں معرکہ آرائیوں نبرد آزمائیوں اور جدال و قتال کی تعلیم کا حصہ غالب ہو اور محبت کی تعلیم محض تین چار آیات تک محدود ہو وہ ہرگز محبت کی تعلیم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ خدا کی عطا کردہ کتاب اور دُنیا کا رُوحانی دستور العمل ہونے کے قابل ہے۔ اب انجیل شریف میں متی سے لے کر مکاشفہ تک ۲۷ صحائف میں ایک بھی آیت تلوار۔ خون ریزی اور عداوت کی مؤید نہیں ہے۔ اور اُس کی تمام تعلیم میل ملاپ۔ محبت۔ برداشت و صبر۔ حلم و فروتنی۔ خود انکاری و ایثار۔ ہمدردی اور نیکی و پاکیزگی سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے مسیحیت ہی واحد عالمگیر الٰہی مذہب ہے۔

سائل۔ کیا دسویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک مسیحیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگیں کیں جن کو "صلیبی جنگ" کہا جاتا ہے، تو

آپ کس صورت میں اس داغ کو مسیحیت کے پاکیزہ دامن سے دھو سکتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی واقعات کا انکار اہلِ دانش سے بعید ہے۔

راقم۔ چونکہ مسلمانوں نے عمداً و قصداً مسیحیوں کے معابد مقدسہ اور مقامات متبرکہ پر قبضہ جما کر اور اُن کی زیارت و عبادت پر ناحق پابندیاں لگا کر مسیحیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ اور اُن کی امن پسندی، صبر پسندی اور شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اس لئے اگر مسیحی اپنے جائز مطالبات کے حصول کی خاطر لڑے تو محض اس لئے کہ مسلمانوں نے اپنی تحریصاتِ نفسانیہ اور اغراضِ جسمانیہ کے زیرِ اثر خود اُن کو اس قسم کا قدم اُٹھانے پر مجبور کیا۔

دوم۔ حروبِ صلیبیہ کی علّتِ غائی ملک گیری نہ تھی۔ اور نہ دولت و ثروت اور بیگانی عورتیں چھیننے یا بلاوجہ جہاد کرنے کی ہوس نے اُن کے جذبات کو جنگ کے لئے متحرک کیا۔ جیسا کہ مسیحیت کے باہر تمام دیگر اقوام میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے۔

سوم۔ ہندو اور مسلمان اقوام نے حق تلفی و تشدّد اور محاربہ و مکابرہ کر کے ہمیشہ اپنی مذہبی کتب کے قوانین کی تعمیل کی ہے۔ لیکن مسیحیوں نے صلیبی جنگوں کے ذریعے انجیل مقدس کی خلاف ورزی اور مخالفت کی۔ کیونکہ انجیل میں ایک بھی ایسا حکم نہیں جو حروبِ صلیبیہ کا محرّک و مؤید ہو۔ بلکہ صاف لکھا ہے۔ "تم جانتے ہو کہ غیر قوموں کے سردار اُن پر حکومت چلاتے اور امیر اُن پر اختیار جتاتے ہیں۔ تم میں ایسا نہ ہوگا بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہے وہ تمہارا خادم بنے۔ اور جو تم میں اوّل ہونا چاہے وہ تمہارا غلام بنے" (متی ۲۰: ۲۵-۲۷)۔ "کیونکہ ہم اگرچہ جسم میں زندگی گزارتے ہیں مگر جسم کے طور پر لڑتے نہیں۔ اس لئے

کیونکہ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی نہیں ہیں (۲-کرنتھی ۱۰: ۳-۴ و افسی ۶: ۱۰-۱۸)۔

چہارم- اگر کوئی شخص نسخہ استعمال نہ کرے اور مرض سے صحتیاب نہ ہو تو اس سے اُس کُتب حکمت کا نقص ثابت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسیحی لڑائی جھگڑے کرے تو اُس کی اِس کمزوری کی علت انجیل کی تعلیم کو قرار دینا محض کج فہمی اور ضد ہے۔

جنگی ہتھیاروں کی موجودگی محبت پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ نفرت اور زبردستی پر۔ اور خداوند مسیح نے فرمایا "جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار ہی سے مارے جائیں گے" (متی ۲۶: ۵۲) "میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے" (متی ۵: ۳۹) اگر اہل دنیا مسیح کے ان اقوال کی تعمیل کرنے لگ جائیں تو آج یہی خارستان (دُنیا) جنت کا نمونہ بن جائے۔

سائل- پُرانے عہدنامے میں یہودیوں نے مختلف قوموں کے ساتھ متعدد لڑائیاں لڑیں- اور توریت میں جنگ کے خلاف امتناعی احکام کا وجود نابود ہے۔

راقم- توریت کا مذہب مذہب الٰہی کی ناقص حیثیت تھا۔ خداوند مسیح عہدِ جدید کے بانی ہو کر اُسی کو کامل کرنے آئے تھے۔ ہر شے کا کمال یہ ثابت کرتا ہے، کہ وُہ کسی وقت ناقص اور ادھوری تھی۔ یہی مذہب توریت کے ناقص مذہب ہی کی کامل حالت ہے۔ اِس لیئے انجیلی کامل مذہب کے مقابلے میں توریت کے ناکامل مذہب کو رکھ کر اُس کے نقائص بیان کرنا تحصیل لا حاصل ہے۔ جس طرح ایک گنبد کو تعمیر کرنے کے لئے اُس کے نیچے اینٹوں کا عارضی سا سہارا لگایا جاتا ہے۔ اور جُونہی وُہ گنبد مکمل ہو جاتا ہے تو

اُس ماتحت قالب کو گرا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح عہدِ عتیق میں معاشرت و مذہب مخلوط صورت میں تھے۔ عہدِ جدید میں آکر مذہبِ الٰہی کمالیت کو پہنچا اور معاشرت کو اُس سے جُدا کیا گیا۔ جس طرح پھول اور پھل ایک خاص میعاد تک اکٹھے رہتے ہیں۔ اور جونہی پھل ترقی کرنے لگتا ہے پھول خود بخود جُدا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح عہدِ عتیق میں معاشرت و مذہب مخلوط صورت میں تھے۔ اور خداوند مسیح نے دونوں کو کیسر جُدا کر دیا۔ اِس لئے اِس قسم کا اعتراض کرنے سے پہلے انجیلِ مُقدس کی پوری واقفیت حاصل کر لینا ضروری ہے۔ یہ بھی غلط ہے کہ توریت میں خون ریزی کے خلاف حکم نہیں۔ لکھا ہے "تُو خون نہ کر"۔

دوم۔ ہم لوگ یہودی یا موسائی نہیں بلکہ مسیحی ہیں۔

سوم۔ یہ مانا کہ پُرانے عہد میں یہود کے قومی جنگوں کا ذکر موجود ہے مگر اُن جنگوں کی نوعیت قرآن اور ویدک محاربات سے غیر ہے۔ یہ ایک کھُلی حقیقت ہے کہ یہود نے کبھی بھی اپنے مذہب کی جبری اشاعت کی غرض سے دیگر اقوام سے جنگ نہیں کی۔ اگر مذہبی اشاعت اُن کی جنگوں کی علّتِ غائی تھی تو آپ بائبل مُقدس میں سے کوئی ایسا مقام پیش کر کے ثابت کریں۔ اور دُوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ کبھی اِن جنگوں کے عوض میں خدا نے اُنہیں بہشت کی خوشیاں عطا کرنے کا وعدہ نہیں کیا۔ جیسے کہ قرآن۔ وید اور گیتا میں نہایت کھُلے الفاظ میں ایسے انعامی اشتہار خُدا کی طرف سے موجود ہیں۔ یہودیوں نے صرف تمدنی و سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر غیر اقوام سے محاربے کئے۔ پس جس شے کی کمی ہو اُسی کی ضرورت ہُوا کرتی ہے۔ دُنیا میں محبّت کا سخت افلاس بلکہ قحط ہے۔ اور مسیحیت

صرف یہی شئے دُنیا کو بخشتی ہے۔ اِس واسطے وُہ دُنیا کی سب سے بڑی رُوحانی و اخلاقی ضرورت کو پُورا کرتی اور جنّت کے دروازے اُس کے لئے کھولتی ہے۔ اَے مُنکرانِ مذہب! مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو کر اطمینانِ قلبی اور سکُونِ باطنی کو جلد حاصل کریں۔ مذہب سے بیزاری کی وجُوہات بیان کر دی گئیں۔ اور اُن کا شافی اور بے خطا علاج بھی ہم نے لکھ دیا۔ اب یہ آپ کا اختیار ہے کہ اُس سے فایدہ اُٹھائیں یا نہ اُٹھائیں۔ ؎

لِکُلِّ شَیْءٍ اِذَا فَارَقْتَہٗ عِوَضٌ ۔ وَلَیْسَ لِلّٰہِ اِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضٍ

مطلب:۔ ہر اعلےٰ سے اعلےٰ چیز ہر عزیز سے عزیز ہستی جس سے تمہیں جُدا ہونا پڑے۔ اس دُنیا میں کبھی نہ کبھی شکل میں اُس کا عوض مِل سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو اگر اللہ سے جُدا ہو جاؤ گے تو اُس کا بدل کہیں نہیں پاؤ گے۔

مسیحیت کی مُخالفت

لوگ مسیحیت پر واہیات اعتراضات کی بوچھاڑ کر کے اُس کی شان کو گھٹانے کی ہمیشہ اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ:۔

اوّل۔ وُہ جانتے ہیں کہ مسیحیت کا معیار رُوحانی بہت بُلند ہے۔ جب وُہ اپنے مذہبی اصُولوں کو مسیحیت کی لاثانی تعلیمات کے مقابلہ میں کمزور اور حقیر دیکھتے ہیں تو اُن کو جھٹ یہی تجویز سُوجھتی ہے کہ چُونکہ ہمارے اصُول تو مسیحیت کی بُلندی تک پہنچنے سے قطعی قاصر ہیں۔ اس لئے کسی طرح انجیلی اصُولوں کی جا و بیجا تاویلیں کر کے اور اُن کو گھٹا کر اپنے برابر کر لیں۔ وُہ مسیحیت کے حجج قطعیہ اور براہین شافیہ کے بالمقابل مشک کا مند لائیل سے صنعت آراء ہیں۔ لیکن مسیحیت کے نُور کو پھُونکوں سے بجھانا محال ہے۔

دوم۔ وُہ مسیحیت کو ایک بدیشی مذہب سمجھتے ہُوئے بدیشی حکومت کی طرح

اُس سے بھی دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مذہب صرف حوائج رُوحانیہ و اخلاقیہ کی تسکین و آسودگی کا ذمّہ دار ہے۔ اَور حکومت محض جسمانی و نفسانی خواہشات کو پُورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس قدر رُوح جسم سے اعلیٰ ہے اُسی قدر مذہب کا نکتۂ نظر حکومت سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے۔
ایسے لوگوں کو خوب جان لینا چاہیئے کہ مسیحیت مغربی مذہب نہیں بلکہ ایشیائی ہے۔ یعنی اُس نے جنم ایشیا میں لیا تھا تاکہ کُل دُنیا کا دستور العمل ہوکر اپنی رُوحانی و اخلاقی برکات و حسنات کو من حیث الاجتماع تمام صفحۂ گیتی پر پھیلا دے۔ اَور تمام اقوامِ عالم کو واحد برادری بنا کر ذات پات اَور رنگ و نسل کے امتیازات کی جان کا فاتحہ پڑھ دے۔
سوم۔ لوگ مسیحیت کے اِس لئے بھی مخالف ہیں کہ مسیحی مذہب ادنے و اعلیٰ کے امتیازات کی نفی کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتا۔ اَور مسیحیت کا سب سے بڑا مُدعا یہی ہے کہ آقا و غلام اَور محمود و ایاز کو ایک ہی سلکِ اتحاد و اشتراک میں مُنسلک کر کے دُنیا کو ایک واحد برادری بنا دے ”تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا۔ نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی۔ نہ کوئی غلام نہ آزاد۔ نہ کوئی مرد نہ عورت۔ کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو“ (گلتی ۳: ۲۷-۲۸ و کلسی ۳: ۱۱) چونکہ اِس قسم کے مساوات کے قیام کا دُوسرا نام اعلیٰ اقوام کی امتیازی عظمت اَور بزرگی کی نفی ہے، اِس لئے لازمی امر ہے کہ جو مسیحیت کو پنپتی ہُوئی دیکھ کر کُلِ حکمت کی ہنڈیاں کی طرح اندر ہی اندر چرخ کھایا کریں۔ اِس کا مقاطعہ کریں۔ اَور اس کی جلا وطنی کی دُعائیں مانگا کریں۔ لیکن ”اگر دُعائے طفلاں مستجاب بودے یک معلّم در عالم زندہ نماندے“۔
چہارم۔ جب ایک ڈاکٹر مریض پر جراحی عمل کرتا ہے۔ تو شدّتِ درد کے باعث

مریض اکثر بے اختیار ہو کر ڈاکٹر کو کوستا ہے۔ اور ڈاکٹر کو اپنا دشمن سمجھتا ہے تاہم ڈاکٹر مریض کی بھلائی کی خاطر اس طعن و تشنیع کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ اسی طرح روحانی مریضوں کو مرضِ عصیاں اور عارضۂ جہالت سے آزاد کرنے کے لئے جو عمل مسیحیت کر رہی ہے وہ ہے تو ان کے لئے کثیر المنفعت لیکن عارضی طور پر وہ بلاوجہ مسیحیت کے خلاف شور مچا رہے ہیں۔ لیکن مسیحیت کروڑوں جانوں کی سلامتی اور بہتری کی امید پر اس تمام مخالفت و مخاصمت اور منافرت کی طرف سے آنکھیں بند کر چکی ہے۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ مخالفین مسیحیت معاونین مسیحیت ہیں۔ اگر وہ منفی ہیں تو مسیحیت مثبت۔ برق ہمیشہ منفی و مثبت کے اتصال ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس قدر مخالفت شدید اور اس کے خطرات عظیم ہوتے ہیں، اسی قدر خود حفاظتی اور مقابلہ کے سامان عظیم ہوتے ہیں۔ اگر مخالفت اور خطرہ نہ ہو تو مضبوطی اور استقلال کی نفی ہوگی۔ ہم مشکور ہیں ان مخالفین کے جو مسیحیت کے لئے وجۂ استحکام ہیں۔

معیارِ الہام

گذشتہ ابواب میں ہم مسئلۂ الہام پر روشنی ڈالتے ہوئے الہام کی اشد ضرورت کو ثابت کر چکے۔ اور دکھا چکے کہ حقائق و دقائقِ الٰہیہ اور رموز و اسرار لطیفہ روحانیہ کے ادراک و تفہیم کے لئے عقل مجرد کی رہنمائی کافی نہیں ہے۔ اور نہ ہی عقل کے حاصلات و نتائج میں مطابقت تام ہے۔ اس لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا قطعی ناممکن اور معلوماتِ عقلیہ پر اپنے ایمان و ایقان کی بنیاد رکھنا سراسر غیر معقول ہے۔

جس طرح دنیا میں سچ کی بہ نسبت جھوٹ کا دائرہ اثر وسیع ہے اُسی طرح دنیا میں سچے انبیاء کی بہ نسبت جھوٹے نبیوں کے دعویٔ نبوت کرنے کا زیادہ احتمال ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ ایسا ٹیس ۲۲: ۶-۲۸ میں جھوٹے نبیوں کا نقشہ موجود ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ اُن نبیوں کی باتیں نہ سنو۔ جو تم سے نبوت کرتے ہیں۔ وہ تم کو بطالت کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ اپنے دلوں کے الہام بیان کرتے ہیں۔ نہ کہ خداوند کے منہ کی باتیں۔ (یرمیاہ ۲۳: ۱۶ و ۲۱ و ۳۲ و ۲۷: ۱۴) اور خداوند مسیح نے فرمایا "جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں۔ مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیئے ہیں"۔ (متی ۷: ۱۵) اسی طرح صحائف مقدسہ میں باربار جھوٹے نبیوں سے محتاط رہنے اور اُن کے گمراہ کن خیالات و باطل تعلیمات سے خبردار رہنے کے متعلق تاکید پائی جاتی ہے۔ پس ہم کس طرح جانیں کہ جو بھی نبی دعویٔ نبوت کرے وہ سچا ہے یا جھوٹا۔ جس طرح کھرے اور کھوٹے سونے میں تمیز کرنے کے لئے ایک معیار یا کسوٹی ہوتی ہے، اُسی طرح کلامِ مقدس میں ہر دو قسم کے انبیاء کی جانچ کا معیار رکھا گیا ہے۔ اگر اُس معیار

پرکھے بغیر کسی نبی کی اندھا دُھند تقلید کی جائے تو راہِ حق سے گمراہ ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ چنانچہ میری ذاتی تحقیقات کے مطابق الہام اور نبوّت کی جانچ کا معیار ان پانچ اصُولوں پر مشتمل ہے۔ یعنی (۱) معجزہ۔ (۲) پیشینگوئی۔ (۳) نیک سیرتی (۴) مطابقت بہ الہام ماقبل۔ (۵) مسیح کا اقرار۔

معجزہ

الہامِ الٰہی فوق العادت امر ہے۔ جب کوئی فوق العادت ظہور منصۂ شہُود پر جلوہ گر ہوتا ہے تو انسانی عقل فطری طور پر اُس کی صحت کا ثبوت طلب کرتی؛ اور جب تک ثبوت نہ ملے مشکوک و مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ دُنیا ہی میں دیکھئے کہ جب کسی سلطنت کا سفیر کسی دُوسرے بادشاہ کے پاس کوئی شاہی پیغام لیکر جاتا ہے۔ تو اُس وقت تک اُس کو شاہی نمائندہ تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک وُہ اپنے ثبوتِ سفارت میں کوئی شاہی تصدیق نہ دکھائے جب وُہ بادشاہی مُہر دکھاتا ہے تو اُس کے دعویٔ سفارت کو حق سمجھا جاتا اور اُس کے الفاظ کو عین بادشاہ کے الفاظ سمجھا جاتا ہے جبکہ عقلِ انسانی دُنیوی معمُولی باتوں کی صحت و عدم صحت کے متعلق تصدیق اور یقینی ثبوت کا مطالبہ کرتی ہے، تو کس قدر فوق العادت امُور کے متعلق اُس سے زیادہ قوی ثبوتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ جب کوئی نبی من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اُس کو اپنے دعویٰ کا ثبوت معجزات کے ذریعے دینا ہوتا ہے۔ اور لازم ہے کہ وُہ فوق العادت پیغام کو فوق العادت نشانوں کے ساتھ اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر وُہ ایسا نہ کرے تو دُنیا کو حق حاصل ہے کہ اُس کے پیغام کو الٰہی پیغام نہ مانے۔ مُوسیٰ پر جب توریت نازل ہوئی تو اُس نے اپنے الہام اور دعویٔ نبوّت کو بڑے بڑے معجزات سے ثابت کیا (استثنا ۳۴: ۱۰-۱۲) اور جو نبی معجزات سے اپنی نبوّت کا ثبوت نہ دے بر سابقہ الہامی صحائف سے

اُس کا پیغام مُطابقت رکھتے تو وُہ پہلی کتابوں کا واعظ ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ اس
سے زیادہ۔ جب پُرانے عہد کا حدِ زوال اختتام پذیر ہُوا۔ تو نئے عہد کی بنیاد
خُداوند مسیح نے رکھی۔ اور وُہ ہزار مُعجزوں کا ایک مُعجزہ تھا۔ اُس کی تمام زندگی
فوق العادت حقائق و اظہارات کا ایک حسین و جمیل مُجسمہ تھی۔ اُس نے اپنے
پیغام کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں بے شمار معجزے دکھائے۔
اور فرمایا کہ "جو کام باپ نے مجھے پُورے کرنے کو دئے یعنی یہی کام جو میں کرتا ہوں
وُہ میرے گواہ ہیں کہ باپ نے مجھے بھیجا ہے" (یُوحنا ۵: ۳۶) اور آپ کے صعود
فرمانے کے بعد رسُول یہ گواہی دیتے ہیں "اے اسرائیلی مردو! یہ باتیں سُنو کہ
یسُوع ناصری ایک مرد تھا جس کا خُدا کی طرف سے ہونا تم پر ثابت ہُوا۔ اُن معجزات
اور عجیب کاموں اور نشانوں سے جو خُدا نے اُس کی معرفت تمہارے بیچ میں دکھائیں۔
جیسا تم آپ بھی جانتے ہو" (اعمال ۲: ۲۲) پھر مسیح کے رسُولوں نے اپنی رسالت
کو معجزات سے ثابت کیا۔ ملاحظہ ہو (اعمال ۳: ۱-۱۰ و ۱۰: ۳۶-۴۲ و ۱۴: ۹-۲۰
و ۱۶: ۱۶-۱۸ و ۲۰: ۹-۱۲) پس معجزات کسی نبی کے من جانب خُدا ہونے کا
واضح ثبوت ہیں۔ اور جو نبی پیغمبر یا رسُول معجزات نہ دکھائے۔ وُہ انبیاء و
مرسلین کی فہرست میں شامل کئے جانے کے ہرگز ہرگز لائق نہیں۔ ہاں البتہ
جلد باز اور ضعیف الاعتقاد لوگ ایسے دعویداران نبوت کی کورانہ تقلید پر کمر
بستہ ہو جاتے اور ضلالت و گمراہی کے لق و دق صحرا کی خاک چھانتے ہیں۔ اور
بعض مذہبی کُتب کے داعی دعاوی سے بڑھ کر دعوے کرتے۔ اور خواہ مخواہ بعض
لوگوں سے معجزات منسوب کرکے اُنہیں انبیاء صادق کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے
ہیں۔ حقیقت مُتصدقہ کو چھوڑ کر توہمات کو حقیقت کا لباس پہنانا عبث
ہے۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید ہر دو کی بُنیادیں معجزات پر رکھی گئی ہیں۔ اور انجیل

میں آکر الہام کامل ہوگیا۔ اور اُس کے وُسعتِ رواج کا زمانہ تا قیامت ہے اور انجیل نے کسی مزید الہامی کتاب کے نزول کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بلکہ کُل واقعات جو ابتدائے عیسویت سے تا قیامت اِنسان اور خدا کے درمیان ظہور میں آنے چاہئیں اُس میں بالتفصیل و تشریح قلمبند ہیں۔ اور معجزات بالخصوص اُس نبی کے لئے ضروری ہیں جو ایک نئی کتاب کا مُلہم اور کسی نئے دین کا بانی ہونے کا داعی ہو۔ موسیٰ عہدِ عتیق کا بانی تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنی نبوّت کو معجزات سے ثابت کیا۔ اُس کے بعد کے انبیاء کے لئے معجزات دکھانا لازمی شرط نہیں بلکہ معجزہ یا پیشین گوئی میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے اگرچہ وُہ یہ دونوں کام کریں۔ اِسی طرح عہدِ جدید کے بانی نے اِس نئی کتاب (انجیل مقدّس) اور نئے عہد کی بُنیاد معجزات پر رکھی۔ اب اگر کوئی مزید کتاب انجیل کے بعد آئے تو اُس کے مُلہم و منزل علیہ کے لئے معجزات دکھانا ضروری و لابدی ہے۔ لیکن انجیل نے کسی تیسری کتاب کے لئے بالکل گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اِس لئے مُقدّس پولُس رسُول فرماتا ہے۔ "اگر ہم یا آسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوشخبری کے سوا جو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوشخبری تمہیں سُنائے تو ملعون ہو" (گلتی ۱: ۸)۔

پیشینگوئی

"لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُس کو حکم نہیں دیا۔ یا اَور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تم اپنے دل میں کہو کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اُسے ہم کیونکر پہچانیں۔ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور اُس کے کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں۔ بلکہ اُس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے۔ تم اُس سے خوف نہ کرنا۔" استثنا ۱۸: ۲۰-۲۲

"وہ نبی جو سلامتی کی خبر دیتا ہے جب اُس نبی کا کلام پُورا ہو جائے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت خداوند نے اُسے بھیجا ہے۔" (یرمیاہ ۲۸: ۹) اِن حوالہ جات سے خُوب روشن ہے کہ نبوت کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کا معیار پیشینگوئی بھی ہے۔ اِتنی طاقت نہ تو قلم میں اور نہ ہی ذہن میں ہے کہ بائبل کے تمام انبیاء کی تمام پیشینگوئیوں کو حیطۂ تحریر میں لایا جائے۔ ناظرین خود تحقیق کر سکتے ہیں۔ ہم صرف خداوند مسیح کی چند پیشینگوئیوں کے پُورا ہونے کا ثبوت پیش کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ "جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے" (متی ۲۴: ۲۳-۲۴) چنانچہ:-

(۱) بعہد ٹراجان سنہ ۱۱۳ء میں ایک شخص اندریو نے مسیحائی کا دعویٰ کیا۔

(۲) ایڈریان کے عہد سنہ ۱۳۰ء میں بار کوکب کو مسیح سمجھا گیا۔ اور یہود پر اُس کے باعث بہت تباہی آئی۔ آخر تنگ آ کر یہود نے اُسے جھوٹا مسیح سمجھا۔

(۳) سنہ ۴۳۴ء میں جزیرہ کریٹ میں ایک جھوٹا نبی اُٹھا۔ اُس نے موسیٰ ہونے اور لوگوں کو سمندر سے پار کرنے کا دعویٰ کیا۔ آخر جھوٹا ثابت ہُوا۔

(۴) سنہ ۵۲۰ء میں عرب میں ایک ڈونان نامی جھوٹا مسیح اُٹھا۔ اور اپنے یہودی پیروکاروں کے ہمراہ نگرا شہر میں مسیحیوں پر حملہ کر دیا۔ آخر مارا گیا۔

(۵) سنہ ۵۲۹ء میں جولیان نامی ایک جھوٹے مسیح نے یہودیوں اور سامریوں سے بغاوت کرائی۔ اور بہتیرے ہلاک ہوئے۔ حضرت محمد صاحب کی بعثت کا بھی یہی زمانہ تھا۔ اور آپ نے فرمایا تھا کہ "مجھے پاتے ہیں لکھا ہُوا اپنے پاس توریت اور انجیل میں" (سورۂ اعراف ۱۵۸)۔

(۶) سنہ ۷۲۰ء میں ایک سُریانی مُدعیٔ مسیحائی برپا ہُوا اور جھوٹا ثابت ہُوا۔

(۷) سنہ ۱۱۳۷ء میں یہود نے فرانس میں کسی کو مسیح مان لیا اور مُلک بدر ہوئے۔

(۸) سنہ ۱۱۵۷ء میں یہود نے مُلک ہسپانیہ میں کسی بناوٹی مسیح کے زیر ہو کر بغاوت کی اور قریباً کُل تباہ ہوئے۔

(۹) ۱۱۲۷ء میں سلطنت فیز کے اندر یہود نے ایک جھوٹے مسیح سے دھوکا کھا کر بہت دکھ اُٹھایا۔ اسی صدی میں عرب میں بھی ایک مسیح اُٹھا۔ اور پھر اسی سن میں دریائے فرات کے پار ایک مسیح اُٹھا۔ اور دعویٰ کیا کہ میں کوڑھی ہو کر سو رہوں گا اور تندرست ہو کر اُٹھوں گا۔

(۱۰) ۱۲۲۲ء میں جرمنی میں یہود نے ایک شخص کو مسیح سمجھا اور اُسے ابنِ داؤد کہنے لگے۔ اسی برس وہ ایک عورت سے جو ورمس کی تھی مسیح کے پیدا ہونے کی اُمیدیں رکھتے تھے۔ لیکن اُس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ چودھویں صدی میں بھی اسی طرح ایک نقلی مسیح اُٹھا۔

(۱۱) ۱۵۰۲ء میں ربّی اسخر لیملا جرمنی میں مسیح کا پیشرو ہونے کا دعویٰ ہوا۔ اور یہودیوں میں اُس کی باتوں سے بہت گرمجوشی اور اُمید پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے روزوں اور نمازوں کے باضابطہ اوقات مقرر کر کے اُس کی انتظاری کی۔ مگر لاحاصل ثابت ہوئی۔

(۱۲) ۱۶۶۶ء میں وہ مشہور جھوٹا سبتائی زیوی اُٹھا۔ اور اپنی جان بچانے کی خاطر آخر محمدی ہو گیا۔

(منقول از کتاب "عدم تحریفِ قرآن" مصنفہ جی۔ ایل ٹھاکرداس)

اور اُنیسویں صدی میں مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی دعوئے مسیحائی کا شوشہ چھوڑا۔ اور ہزاروں بندگانِ خدا کو گمراہی میں ڈالا۔ آپ نے تحصیلِ جاہ میں اپنی سعیٔ گرانمایہ صرف فرمائی۔ تاہم آپ کا خیالی قصرِ ولایت کا دُنیا گنبدِ بے در بنا رہا۔ اسی طرح قیامت تک جھوٹے مسیح و نبی اُٹھتے اور خداوند مسیح کی پیشین گوئی پر مہرِ صداقت لگاتے رہیں گے۔

٭ مرزائیت کی مزید تفصیل ضروری ہے۔

پھر خداوند مسیح کی یوحنا ۲:۱۹ کی پیشین گوئی اعمال ۸:۱؛ ۹:۱-۲ کے
بعد ازاں زمانے میں پوری ہوتی رہی۔ ہیکل کی بربادی کی خبر جو متی ۲۴:۱-۲
میں ہے سنہ ۷۰ء میں پوری ہوئی۔ یہوداہ اسکریوتی کی بے وفائی اور غداری کی خبر
جلد ہی پوری ہو گئی۔ پطرس اور دیگر شاگردوں کی بے وفائی کی خبر جلد پوری ہوئی۔
اعمال ۱:۸ میں روح القدس کے نزول اور مسیحیت کی ہمہ رسی و ہمہ گیری کی خبر
آج تک پوری ہو رہی ہے۔ رسولوں کے معجزات کی خبر دی مرقس ۱۶:۱۷-۱۸۔
جو ہمیشہ پوری ہوتی رہی۔ اپنی صلیبی موت کی خبر دی وہ پوری ہوئی۔ زندہ
ہونے کی خبر دی وہ بھی پوری ہوئی۔ دوبارہ آنے کی خبر دی وہ بھی پوری ہونے
والی ہے۔ برخلاف اس کے مرزا قادیانی کی مردم آزار پیشین گوئیوں کا جو حشر ہوا
وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ڈپٹی عبداللہ آتھم مسیحی مناظر کی موت۔ محمدی بیگم کا
نکاح۔ سلطان احمد کی موت۔ اور پھر شیخ محمد حسین۔ جعفر زٹلی اور مولوی ابو الحسن
تبتی کی موت کی پیشین گوئیاں سراسر باطل اور بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ پس آپ
کے دعوئ روحانی و نبوت کے بطلان کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ نبی و رسول
کی ہر پیشینگوئی کا سچا ہونا اس کے دعوے کی صداقت کی دلیل ہے۔

نیک سیرتی

فرستادۂ خدا اور مدعی نبوت کا نیک سیرت ہونا ضروری
ہے۔ اور یہاں نیک سیرتی سے وہ نیکی و پاکیزگی مراد نہیں
جو خدا ہی کی ذات سے خاص ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ نبی و رسول کی زندگی بہ نسبت
عام الناس کے بہترین ہو۔ خداوند مسیح نے فرمایا "جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو۔
..... ان کے پھلوں (اعمال) سے تم ان کو پہچان لوگے۔ کیا جھاڑیوں سے انگور اور
اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے۔
اور برا درخت برا پھل لاتا ہے۔" (متی ۷:۱۵-۱۷) پولوس رسول فرماتا ہے۔ کیونکہ ایسے

لوگ جھوٹے رسُول اور دغابازی سے کام کرنے والے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مسیح کے رسُولوں کے ہم شکل بنا لیتے ہیں" (۲ کرنتھی ۱۱: ۱۳) پھر پطرس رسُول فرماتا ہے۔ "اور جس طرح اُس اُمت میں جھوٹے نبی بھی تھے۔ اُسی طرح تم میں بھی جھوٹے اُستاد ہوں گے ...... اور بہتیرے اُن کی شہوت پرستی کی پیروی کریں گے۔ جن کے سبب سے راہِ حق کی بدنامی ہوگی۔ اور وُہ لالچ سے باتیں بنا کر تم کو اپنے نفع کا سبب ٹھہرائیں گے" (۲ پطرس ۲: ۱-۳) مندرجہ بالا مقامات سے نبی کو اُس کی اخلاقی اور عملی زندگی کے نقطۂ نگاہ سے سچا یا جھوٹا کہنا ظاہر ہے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب نیک سیرت نبی ہوتے ہیں۔ سب نیک سیرت نبی نہیں پر سب نبی نیک سیرت ہوتے ہیں اور نیک سیرتی کے ساتھ معجزہ یا پیشینگوئی دونوں میں سے ایک قابلیت ضرور اُن میں ہونی چاہیئے محض نیک سیرتی نبی ہونے کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ وُہ تو غیر نبی میں بھی ہو سکتی ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کریں کہ اس معیار کے مطابق کون کون نبی صادق کہلانے کا حقدار ہے۔

۲۔ مطابقت بہ الہامِ ماقبل

جو نبی خدا کی طرف سے الہام لے کر مبعوث ہو اور نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو نہایت لازمی ہے کہ اُس کی تعلیم و تلقین اور مضامین و خیالات اپنے سے ماسبق نبیوں کے ساتھ مطابقت تام رکھیں۔ اور اگر برعکس اس کے اختلاف و تناقض دکھائیں تو وُہ نبی ہرگز خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا متناقض مکاشفے نہیں دے سکتا۔ اُس کے مکشوفات میں تعلیم کے لحاظ سے تدریجی ترقی و کمالیت تو لازمی ہے، مگر تردید و تنسیخ محال ہے۔ چنانچہ یہ معیار کسی مدعیٔ نبوت کی صداقت کی جانچ کو اُس کی تعلیمات و خیالات کی مطابقت بہ صحائف مُلہمہ سابقہ پر مبنی ٹھہراتا ہے۔ واضح ہو کہ عہدِ جدید کی دیوار عہدِ عتیق کی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے۔ اور اس نئے عہد کے قیام کی وجہ خود عہدِ عتیق میں یُوں مرقوم

"دیکھو وہ دن آتے ہیں خداوند فرماتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا" یرمیاہ ۳۱:۳۱۔ اور عہدِ عتیق کی آخری کتاب کے آخری باب میں یوں مرقوم ہے۔ "تم میرے بندے موسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض و احکام کو جو میں نے حورب پر تمام بنی اسرائیل کے لئے فرمائے یاد رکھو" ملاکی ۴:۴۔ اِس سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ عہدِ عتیق کے ابتدائی۔ وسطی اور اِنتہائی صحائف اپنے مضامین و تعالیم کے لحاظ سے ایک دُوسرے کے ساتھ مطابقت و موافقت تام رکھتے ہیں۔ یعنی وُہ شرائع و احکام جو عہدِ عتیق کی ابتدا (توریت) میں فرمائے گئے بالتواتر و تسلسل تمام صحائف مابعد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آخری صحائف میں توریت کی تنسیخ و تردید کی گئی ہو۔ بلکہ آخری کتاب بھی توریت ہی کی طرف رجوع کرواتی ہے۔ اب عہدِ جدید کی مطابقت عہدِ عتیق کے ساتھ ملاحظہ ہو۔ خداوند مسیح کا قول "یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵:۱۷، لوقا ۱۶:۱۶) اور ایک عالم شرع فریسی کو تمام توریت کا خلاصہ بتا کر فرمایا کہ "اِن ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۲۲:۴۰) عہدِ عتیق کی تقسیم ثلاثہ کی تائید فرمائی۔ اور اپنے حق میں اُن کی خبروں کا پُورا ہونا ثابت کیا "ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں" (لوقا ۲۴:۴۴) مُقدس پطرس رسول خداوند مسیح کو عہدِ عتیق کے تمام انبیاء کی نبوتوں کا نشانہ ٹھہراتا ہے "اِسی نجات کی بابت اُن نبیوں نے بڑی تلاش اور تحقیق کی، جنہوں نے اُس فضل کے بارے میں جو تم پر ہونے کو تھا نبوت کی" (۱-پطرس ۱:۱۰) "مگر جن باتوں کی خدا نے سب نبیوں کی زبانی پیشتر خبر دی تھی کہ اُس کا مسیح دُکھ اُٹھائے گا وہ اُس نے اِس طرح پُوری

کیں۔" (اعمال ۳: ۱۸، ۲۴ و ۷: ۵۲) پس خداوند مسیح کے اپنے اقوال اور اُس کے
رسولوں کی گواہیوں سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہوتی ہے کہ عہدِ جدید کی
بنیاد عہدِ عتیق پر رکھی گئی ہے۔ اِس لئے اِن دونوں میں مطابقت تام ہے
اگر مخالفت و مغائرت ہوتی تو توریت کے انبیاء کی نبوتوں کو عہدِ جدید کے
واقعات کے ثبوت میں پیش کرنا عبث ہوتا۔ ہم بزیرِ عنوان "عالمگیر مذہب"
اِس حقیقت کو بدلائل قاطع و براہین ساطع ثابت کر چکے ہیں۔ پس اگر دونوں
کتابوں میں مطابقت دیکھنی ہو تو اُس مضمون پر پھر سے غور فرمائیں۔ انجیل
کے بعد اگر اور کوئی نبی کوئی مزید الہامی کتاب لے کر نازل ہو تو اُس کتاب
کی تعلیمات و خیالات کی مطابقت انجیل کے ساتھ لازمی امر ہے۔ انجیل
تعلیم دیتی ہے کہ خدا مجسم ہوا۔ مسیح کا کفارہ حصولِ نجات کے لئے شرط ہے۔
مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ خدا کی واحد ذات میں تین اقانیم ہیں۔ مسیح مصلوب
ہوا۔ مر گیا۔ تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر صعود فرما گیا۔ وُہی دوبارہ آ
کر تمام دُنیا کی عدالت کریگا۔ اور عدالت انجیل کے مطابق ہوگی۔ ختنہ
کروانا اور قربانیاں چڑھانا غیر ضروری باتیں ہیں۔ اِن کو چھوڑ کر صرف مسیح
کی قربانی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ سوائے مسیح کے کوئی دُوسرا نجات دہندہ
نہیں ہے۔ یہ ہیں انجیل کی بنیادی تعلیمیں۔ اب اگر انجیل کے بعد کوئی اور نبی
برپا ہو اور اِن تعلیمات و اصولات کا قائل ہو اور انہیں کی تلقین کرے۔
تو ہم ہزار جان سے اُس پر نثار ہونے کو تیار ہیں۔ اور اگر اُس کی تعلیم اِس
کے خلاف ہو تو ہم اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر مجبور ہیں کہ اُسے نبی برحق نہ
مانیں بلکہ جھوٹا نبی سمجھیں۔ کیونکہ انجیل کی یہ تاکید ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ
ہر مدعی نبوت کے قائل ہو جائیں۔" اگر ہم یا آسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوشخبری

(انجیل) کے سوا جو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوشخبری تمہیں سُناتے تو ملعون ہو" (گلتی ۱: ۸)

مسیح کا اقرار

انبیاء عہدِ عتیق اس شرط کے ماتحت نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ مسیح کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے ہوئے ہیں۔ لیکن مسیح کے بعد جو بھی کوئی رسالت یا نبوت کا دعویدار ہو کر آئے، اس کی پہچان کا یہ حقیقی اور صحیح معیار ہے کہ وہ خداوند مسیح کا اقرار زبان اور دل دونوں سے کرے "اے عزیزو ہر ایک رُوح کا یقین نہ کرو۔ بلکہ رُوحوں کو آزماؤ کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی دُنیا میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کے رُوح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی رُوح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی رُوح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے نہیں۔ اور یہی مخالفِ مسیح کی رُوح ہے" (۱ یوحنا ۴: ۱-۳) "پس میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو کوئی خدا کی رُوح کی ہدایت سے بولتا ہے وہ نہیں کہتا کہ یسوع ملعون ہے۔ اور نہ ہی کوئی رُوح القدس کے بغیر کہہ سکتا ہے کہ یسوع خداوند ہے" (۱ کرنتھی ۱۲: ۳) مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی نے اپنی عمرِ عزیز مسیح کو ملعون ثابت کرنے کی کوشش میں ضائع کی، مگر ناکام ہی رہے۔ اور قنوطیت و یاسیت کی حالت میں اس عالمِ آب و گِل سے بصد حسرت چل دیئے۔ انجیل اُس پر اور اُس کے ہم خیالوں پر لعنت کا حکم لگاتی ہے۔ پس "اگر کوئی تمہارے پاس آئے اور یہ تعلیم نہ دے تو نہ اُسے گھر میں آنے دو اور نہ سلام کرو" (۲ یوحنا ۱: ۱۰) جس طرح عہدِ عتیق کے انبیاء اپنے الہامی پیغام کو ہمیشہ خدا سے منسوب کرتے ہیں، اُسی طرح عہدِ جدید کے رسول اپنے الہام و کلام کو خداوند مسیح سے منسوب کرتے ہیں۔ (گلتی ۱: ۱۱-۱۲ و افسی ۱: ۱ وغیرہ) اور انجیل کے بعد جو

بھی کوئی نبی اُٹھے ضروری ہے کہ وُہ مسیح کا اقرار کرے اور اپنے کلام کو مسیح سے منسوب کرے۔ ورنہ اُس کی نبوّت بے ثبوت۔ ناقابل قبُول و فضُول اور تمام ماقبل و ماسبق صحائف کے اِستغراقی اصُولوں کے خلاف ہوکر باطل ٹھہرے گی ؛

یہ امر مخفی نہ رہے کہ مندرجہ بالا پانچ شرائط کا ہر نبی میں موجُود ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض انبیاء میں دو۔ بعض میں چار۔ اور بعض میں پانچوں بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یوُنس رسُول نے معجزات دکھائے۔ پیشین گوئیاں کیں۔ نیک سیرت تھا۔ اُس کا کلام باقی تمام صحائف مُطہرہ سے مطابقت تام رکھتا ہے۔ اور اُس نے زبان اور عمل سے مسیح کا اقرار کیا۔ یاد رہے کہ تمام نیک سیرت نبی نہیں بلکہ تمام نبی نیک سیرت ہوتے ہیں۔ اور اِس نیک سیرتی سے مُراد معصُومیت تام نہیں۔ اور تمام جو مسیح کا اقرار کرتے ہیں رسُول نہیں پر تمام رسُول مسیح کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پانچویں و آخری شرط صرف مسیح کے رسُولوں کے لیئے لازمی ہے۔ عہدِ عتیق کے انبیاء اِس سے آزاد ہیں۔ اگر اب بھی کوئی بائبل کی صحت پر شک کرے اور ہمارے دعویٰ کی مزید تحقیق کرنا چاہے تو مسیحیوں کے کُتب خانے اور لائبریریاں اُن کی تسلّی کے لیئے ہر وقت کھُلی رہتی ہیں۔ اور مسیحی علماء نے صحت صحائف مُطہرہ کے باب میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مندرجہ ذیل مشہُور کتابیں اِس موضُوع پر زیادہ روشنی ڈالتی ہیں "ہماری بائبل و مُسلم عُلماء" "میزان الحق" "کلامِ حق" اور "تصحیف التحریف" وغیرہ ؛

تجسّمِ الٰہی

"کلام مجسّم ہُوا" (یُوحنّا ۱: ۱۴)

"عقل اور مذہب" کے زیرِ عنوان ہم نے یہ ثابت کیا کہ عقل طبعی خُدا کے صحیح اور یقینی علم کے حصُول میں قطعی قاصر ہے۔ اور موجُودات کے محدُود دائرہ میں ہزار ہا سال سے گردش کرنے کے بعد اُس کی تحقیق و تدقیق کے حاصلات و نتائج وُہمی ہیں۔ اور اُس کے بعد "الہام کی ضرورت" کے زیرِ عنوان یہ ثابت کیا گیا کہ جب محدُود و متزلزل عقل کے ذریعے خُدا کی ہستی کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکا تو خُدا نے الہام کے ذریعے یہ مقصد حل کروایا۔ اب یہاں پر ہم دلائل یقینیہ و براہینِ قطعیہ سے ثابت کریں گے کہ عقلِ محض اور الہام محض سے بھی خُدا کی ماہیّت و حقیقت کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وُہ آخری اور صحیح طریقہ پیش کریں گے جس سے یہ مطلب کُلّی طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔ اور سِلسِلہ وار تینوں مسائل پر مختصر طور پر بحث بھی کریں گے ۔

موجُودات اور خُدا کا علم

جب ہم موجُودات کی تمام اشیاء پر ایک تحقیقی اور ہمہ گیر نظر ڈالتے ہیں۔ تو پتہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصرِ فطرت کا ضرور کوئی معمار ہے۔ اور ہم بطور استدلال اِنّی معلُول سے علّت اور مصنُوع سے صانع کا تصور کر سکتے ہیں۔ "کیونکہ جو کچھ خُدا کی نسبت معلُوم ہو سکتا ہے وُہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔ اس لئے کہ خُدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ کیونکہ اُس کی اَن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قُدرت اور الُوہیّت دُنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہُوئی چیزوں کے ذریعے سے معلُوم ہو کر صاف نظر آتی

ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں۔" (رُومی ۱: ۱۹-۲۰) لیکن مشاہدۂ فطرت سے صرف اُس کی موجودگی ہی ثابت ہوتی ہے نہ کہ ماہیت اور حقیقت مثلاً کسی جنگل میں ہاتھی کے نقش پا دیکھ کر کوئی عقلمند یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس جنگل میں ہاتھی ضرور موجود ہے۔ لیکن اُس ہاتھی کے قد و قامت۔ قوت و ضعف اور رنگ اور تذکیر و تانیث اور دیگر کئی امور کے متعلق اُن آثار پا سے کچھ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ہاتھی کی موجودگی ہی ثابت ہو سکتی ہے۔ کسی عالیشان عمارت کے دیکھنے سے اُس کے بنانے والے معمار کی محض ہستی ہی ثابت ہوگی، مگر اُس کی شکل و شباہت۔ خد و خال۔ عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کا علم عمارت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہونا ناممکن و محال ہے۔ اسی طرح مشاہدۂ دُنیا و مافیہا سے من حیث الآثار صرف اِتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ خُدا موجود ضرور ہے۔ یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسا ہے؟ مصنوعات کے مشاہدہ سے اگر خالق کا یقینی اور قطعی تصوّر حاصل ہو سکتا تو دُنیا میں خُدا کی ہستی و ماہیت کے متعلق مختلف و متضاد عقائد وجود میں نہ آتے۔ جہاں تک اِنسان نے اپنی عقلِ ناقص و فکرِ محدود پر بھروسہ کر کے خُدا کی ماہیت و حقیقت کی تحقیق کی وہاں تک وہ ضلالت و گمراہی میں بہہ گیا۔ یعنی "اُن کے بے سمجھ دِلوں پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے آپ کو دانا جتا کر بے وقوف بن گئے" (رُومی ۱: ۲۱-۲۲) مشہور یونانی حکیم سینکا کا عقیدہ اِس عقلی گمراہی کے نتیجے کے طور پر یُوں ہے "ایک طرح پر فلاسفر کا مرتبہ خُدا سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ بجز اِس کے کہ وہ فانی ہے اور کسی حیثیت سے فلاسفر کا مرتبہ خُدا سے کم نہیں۔" پھر آرین کا عقیدہ اِنسانی عقل کی گمراہی کا یُوں آئینہ دار ہے "جہاں تک عقلی و اخلاقی زندگی کا تعلق ہے دانشمند شخص خُدا سے کم نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہُوا کہ عقلِ دور بین مشاہدہ

فطرت سے اُس ذاتِ الٰہی اور وجودِ لامتناہی کو جو فوق الفہم و العقل ہے جان نہیں سکتی۔

الہام اور خدا کا علم

"لیکن جب دُنیا نے اپنی حکمت سے خدا کو نہ جانا" (۱-کرنتھی ۱:۲۱) تو خدا نے بذریعۂ الہام اپنی ذات و صفات کو انسان پر ظاہر فرمایا۔ اور جو حقیقت عقل مشاہدۂ کائنات سے حل نہ کر سکی وہ الہام نے حل کر دیا۔ یعنی جس منزل پر پہنچ کر عقل دُور بین دنگ اور فہم تیز رَو لنگ ہو گئی اُس سے آگے مشعلِ الہام نے اُس کی رہبری و رہنمائی فرمائی یعنی "جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں۔ نہ کانوں نے سُنیں۔ نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خدا نے اپنے محبّت رکھنے والوں کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن ہم پر خدا نے اُن کو رُوح کے وسیلے (بذریعہ الہام) ظاہر کیا"۔ (۱-کرنتھی ۲:۹-۱۰) عقل کی روشنی میں تو انسان حقائقِ رُوحانیہ اور دقائقِ غیر مرئیہ کی تفہیم و تحقیق میں قاصر رہا۔ کیونکہ عقل کا دائرۂ تحقیق محسوسات و مرئیات تک ہی محدود ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے نادیدنی رُوحانی حقیقتیں بذریعہ الہام اِنسان پر ظاہر فرمائیں۔ اب الہام چونکہ حقائقِ الٰہی کا محض لفظی بیان ہے۔ اور الفاظ اِنسان کے وضع کئے ہوئے اور محدود ہیں۔ اِس لئے الہام سے بھی اُس کی ماہیت وکُنہ کا ثبوتی تصور اور یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ لفظ خدا سے خدا کے متعلق کچھ علم اِس کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا کہ لُغت کے واضع نے یہ لفظ آفرینندۂ کائنات کے لئے وضع کر دیا ہے۔ اگر کسی ایسے شخص کو جس نے کبھی شیر نہیں دیکھا ایک کاغذ پر لفظ شیر لکھ کر دکھائیں تو کیا اُس شہزورِ درندہ کا صحیح تصور اُس کو ہو جائے گا؟ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو کبھی کسی کو شیر دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی بلکہ اِن تین حرفوں میں بشکلِ اصلی نظر آجایا کرتا۔ اور بچّے جو جماعت اوّل

میں پڑھتے ہیں وہ خ د ا ۔ کے مرکّب سے خُدا کو جان لینے اور یُوں بے علم لوگوں کے سوا کوئی بھی دُنیا میں خُدا کا مُنکر نہ ہوتا ۔ جس طرح جُغرافیہ کی کتاب میں امریکہ ۔ جرمن ۔ آسٹریلیا ۔ انگلینڈ اور دیگر صدہا ممالک کے نقشے اور حالات موجود ہیں ۔ مگر باوجود اس کے جُغرافیہ کے مطالعہ سے ہم اُن ممالک کی بابت کماں علم حاصل نہیں کر سکتے ۔ اور نہ کتاب کے ذریعے اُن کی سیر ہی ہو سکتی ہے ۔ اور جیسے جُغرافیہ کے علم کے باوجود اِنسان میں یہ زبردست خواہش باقی رہتی ہے ، کہ کبھی بصورت اُن ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لُطف اُٹھائے ۔ اُن کی سیر و سیاحت سے بہرہ اندوز ہو ، اور اپنے جُغرافیائی علم میں اپنے تجرباتی علم کا اضافہ کرے ۔ اِسی طرح الہام محض سے عالم لاہوت اور خُدا کی ماہیت و کُنہ کا تجربی علم اِنسان کو حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اور اُس کے دل میں دیدار الٰہی کی زبردست خواہش بے قرار ہو کر کروٹیں لیا کرتی ہے ۔ الہام سے صرف وہ فیوض غیبی اور حقائق لاریبی نقلی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں ۔ جن کے جاننے میں عقلِ مجرّد معطّل ثابت ہوتی ہے ۔ پس ثابت ہُوا کہ خُدا کا یقینی اور صحیح تصوّر دلانے میں الہام بھی قاصر رہتا ہے ۔ اِنسانی فطرت ایک متشکّل و متشخّص وجود میں خُدا بینی کا تقاضا کرتی ہے ۔ اور نظریات سے آسُودہ نہیں ہو سکتی ۔

ایک سعیدہ خواہش

خُدائے حکیم و قدیر و قادر نے اِنسان کی ذات میں خواہش بھی پیدا کر دی ہے ۔ اور جتنی خواہشات اِنسان رکھتا ہے اُن کے پُورا کرنے کے لئے نیچر میں سامان بھی ویسے ہی پیدا کر دئے ہیں ۔ اگر کِسی کو علم کی خواہش ہے تو علم موجود ہے ۔ اگر کوئی سیم و زر چاہے تو وہ بھی موجود ہے ۔ اگر کُچھ سُننا چاہے تو کان بھی ہیں راگ اور اصوات بھی

ہیں۔ اگر اعلےٰ مراتب کی خواہش ہو تو وہ بھی موجود ہیں۔ غرضیکہ جیسی جیسی انسان کی خواہشیں ہیں ویسے ویسے ہی اُن کے جواب بھی فطرت کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ ایسی کوئی بھی خواہش نہیں کہ جس کا جواب نہ ہو۔ خواہش کا وجود اشیاء خواہیدہ کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اب انسان فطری و جبلّی طور پر یہ خواہش اپنے دل میں رکھتا ہے کہ وہ کسی صورت اپنے معبودِ حقیقی ابدی و ازلی کے دیدار فیض آثار سے اپنی تشنۂ دید آنکھوں کی ضیافت کرے۔ الہامی صحائف خدا کی چٹھیاں ہیں لیکن خطوط و مراسلات انسان کی تمنا ابھی دیدار یار دہی کی زبردست خواہش کی تسکین کا موجب نہیں ہو سکتے۔ یہ جذبہ معبود انسانی بہجہ کا وہ جبلّی خاصہ ہے جس کے معصوم و کیف آگیں اثرات سے مسحور ہو کر انسان اپنے پردہ نشین محبوب کے اشتیاقِ دیدار میں تڑپ جاتا۔ اور اُس کے تخیل و تصور کی معصوم و سحر آگیں تجلّی میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ اور اُس کے خیالی حُسن و جمال کے کیف ناتاشات اُس کے لطیف جذبات پر کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کے روحانی و جسمانی قویٰ کو سکیڑ کر ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے۔ اور جب انسان کبھی صورت اپنی اس عزیز ترین آرزو کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تو ناکام تمنا ہو کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا وہ پھٹ جائے گا۔ چنانچہ اسی پاکیزہ جذبہ کی ترجمانی موسیٰ چند الفاظ میں یوں کرتا ہے۔ "میں تیری منت کرتا ہوں مجھے اپنا جلال دکھا دے" (خروج ۳۳ : ۱۸) پھر داؤد نبی اپنی ہستی کو خدا کی محبت کی قربان گاہ پر نثار کر کے یوں بول اُٹھتا ہے "جیسے ہرن پانی کے نالوں کو ترستی ہے۔ ویسے ہی اے خدا! میری روح تیرے لئے ترستی ہے۔ میری روح خدا کی۔ زندہ خدا کی پیاسی ہے" (زبور ۴۲ : ۱-۲) "صبح کا انتظار کرنے والوں سے زیادہ۔ ہاں صبح کا انتظار کرنے والوں سے کہیں زیادہ۔

میری جان خُداوند کی متشوق ہے" (زبُور ۶۰:۳۰) پھر فلپُّس خُداوند مسیح سے یہی سوال کرتا ہے۔ "اے خُداوند باپ کو ہمیں دکھا یہی ہمیں کافی ہے"۔ (یُوحنا ۱۴:۸)
جبکہ اِنسان کی تمام جسمانی اور رُوحانی خواہشات کا جواب اُس قادر و کریم نے اِسی فطرت کے کارخانے ہیں دے دیا ہے، تو نہایت مُناسب اور ضروری ہے کہ وہ اِنسان کی اِس نیک ترین اور واجبی خواہش کا بھی کوئی تسلی بخش جواب دے۔

مظہر اور خُدا کا علم قبل ازیں ہم اچھی طرح سے ثابت کر آئے ہیں کہ موجُودات کے مشاہدہ سے صرف خُدا کے وجُود یا وجُود ہی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ "وہ ہے"۔ لیکن یہ معلُوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے۔ اور الہام سے صرف لفظی اور تمثیلی علم اُس کی حقیقت کا حاصل ہوتا ہے لہٰذا اِن دونوں صُورتوں میں وہ ایک نامظہر اور نامعلوم خُدا رہتا ہے۔
اِس لئے جو لوگ موجُودات کے مشاہدہ سے بطور استدلال اِنّی یا الہام محض سے لفظی و تمثیلی طور پر خُدا کا نام اور دُھندلا سا تصوّر لے کر اُس کی عبادت کرتے ہیں، وہ یقیناً ایک نامعلُوم خُدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اور نامعلُوم کی پرستش کسی حقیقت کی نہیں بلکہ ایک وہم کی پرستش ہے۔ جیسے مُقدّس پولُوس رسُول اتھینے والوں کو فرماتا ہے۔ "میں نے سیر کرتے اور تمہارے معبُودوں پر غور کرتے وقت ایک ایسی قُربان گاہ بھی پائی جس پر لکھا تھا کہ "نامعلُوم خُدا کے لئے"۔ پس جس کو تُم بغیر معلُوم کئے پُوجتے ہو۔ میں تمہیں اُسی کی خبر دیتا ہُوں" (اعمال ۱۷:۲۳) اور خُداوند مسیح نے سامری عورت کو فرمایا۔ "تُم جسے نہیں جانتے اُس کی پرستش کرتے ہو۔ ہم جسے جانتے ہیں اُس کی پرستش کرتے ہیں"۔ (یُوحنا ۴:۲۲)
پس لامحالہ اِنسان کی خُداطلبی اور خُدابینی کی فطری خواہش کا جواب دینے اور خُدا

کی ماہیت وحقیقت کے یقینی علم کے حصول کے لئے مظہر کی ضرورت ہے۔ تاکہ
ایک تو انسان اُس کے دیدارِ فیض آثار سے لطف اندوز ہو کر اپنی خواہش کا جواب
پائے، اور دُوسرے اس الطف واذق اور نادیدہ وجُود کی خصائص ذاتیہ اور
شمائل باطنیہ سے بحدِ امکان واقفیت حاصل کر سکے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسان
محدُود العلم اور ناقص العقل تو اپنے محدُود قویٰ سے اس بے حد و محیطِ کُل
وجُود کو جان نہیں سکتا۔ اِس لئے ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے آپ کو کسی بدنی
اور محدُود مظہر میں ظاہر فرمائے۔ اور وُہ مظہر انسان اور خُدا کے درمیان
برزخ کامل ہو کر رشتۂ حادث بالقدیم قائم کرے۔ چُنانچہ وُہ مظہر الٰہی خداوند
مسیح ہے۔ اُس نے فلپس کے جواب میں فرمایا۔ "اے فلپس میں اِتنی مُدّت سے
تمہارے ساتھ ہُوں کیا تُو مجھے نہیں جانتا؟ جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا
تُو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دِکھا؟ کیا تُو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہُوں اور
باپ مجھ میں ہے؟" (یُوحنّا ۱۴: ۹-۱۰) یُوحنّا رسُول فرماتا ہے کہ "خُدا کو کسی نے کبھی
نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا" (یُوحنّا ۱: ۱۸) بعض
حضرات کہا کرتے ہیں کہ تجسّم مُستلزم قبائح عقلیہ ہے۔ یعنی کہ خُدا جو بے حد
محیطِ کُل۔ ازلی۔ ابدی اور قدیم کیونکر حد و حدُوث میں آ سکتا ہے۔ یعنی لامحدُود
خُدا محدُود کیسے ہو سکتا ہے۔ اِس کے متعلق اِس قدر عرض ہے کہ اگر خدا کے وجود
کا کسی حد میں آجانا مُمتنع ہے، تو اِنسان محدُود کا بے حد ہو جانا اُس سے زیادہ
محال ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انسان اور خُدا کا مِلاپ محال ہے۔ محدُود
اِنسان اُس لامحدُود ہستی کے دیدار سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا، جب تک
وُہ کسی بدنی مظہر میں ظاہر ہو کر حد و حیز کی قیُود میں نہ آئے۔ مِلاپ کی اِن
دو صُورتوں میں سے ایک صُورت ہی مُمکن ہے۔ یعنی کہ یا تو محدُود بے حد ہو

جائے یا بے حد محدود ہو جائے۔ یہ تو بعین قرینِ عقل ہے کہ محدود و متناہی وجود تو کبھی بے حد ہو نہیں سکتا۔ اور ذاتِ بے حد کی قدرت و اختیار میں ہے کہ حد میں آجائے۔ دراصل حد اور بے حدی میں خصوص و عموم کی نسبت ہے۔ اور خصوصیت عمومیت کی ایک فرد ہے۔ خصوصیت ایک خاص کلی ہے اور عمومیت عام کلی ہے۔ حد میں خصوصیت ہے اور بے حدی میں عمومیت۔ ازیں جہت تمام حدود بے حدی کے حیطۂ لامتناہی میں شامل ہیں، اُس سے باہر نہیں۔ پس بے حد کا کسی حد میں آجانا محال نہ ٹھہرا۔

دوم۔ جب خدا کی ذات بے حد ہے تو ضرور اُس کی صفات بھی بے حد ہوں گی۔ اور اُس کی جملہ صفاتِ کاملہ میں سے ایک صفت قدرت ہے۔ اور اُس کی اِس بے حد ازلی صفت کا نتیجہ یہ محدود اور حادث کائنات ہے۔ جبکہ اُس کی بے حد صفات کے نتائج محدود و حادث ہو سکتے ہیں، تو اُس کی ذات کا حد و حدوث میں آجانا کیسے محال ہو سکتا ہے؟ اور اُس کا حد میں آنا اُن شرائط کے ماتحت ہو سکتا ہے جن سے اُس کی ذاتی خاصیت و طبیعت میں فرق نہ آئے۔ اور اگر بے حد کا حد میں آنا امرِ ممتنع ہے تو اِس سے اُس کا نقصِ قدرت لازم آئیگا۔ جبکہ محدثات و ممکنات اُس کی بے حد قدرت کے آثار ہیں، تو "مسیح خدا وند" اُس کے جلال کا پرتَو اور اُس کی ذات کا نقش ہے" (عبرانی ۱: ۳) جناب رفعت مآب خداوند مسیح کی رفیع القدر ذات کے ماسوا اور کوئی خدا تعالیٰ کا مظہرِ اکمل و افضل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو سکتا ہے تو ماہِ نخشب بھی ماہِ حقیقی ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو شیرِ قالین بھی شیرِ نیستان ہو سکتا ہے۔ آفتاب کی شعاعیں پتھر

لکڑی۔ مٹی اور دیگر تمام اجسام پر پڑتی ہیں۔ اور آئینہ پر بھی پڑتی ہیں۔ لیکن جس خوبی سے نورِ خورشید آئینہ میں ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے منعکس ہو کر مقابل کی اشیاء پر پڑتا اور اُنہیں محیطِ انوار اور بقعۂ تجلی بنا دیتا ہے۔ اُس حُسن و خوبی سے اُس کا ظہور اور کسی بھی شے میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا آئینہ ہی اپنی انتہائی آبداری و صفائی کے لحاظ سے سورج کا مظہرِ کامل ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح خداوند مسیح کی عدیم السہیم ہستی اور فقید المثال ذات اپنی انتہائی پاکیزگی اور خصوصیاتِ کاملۂ الٰہیہ کے باعث تمام دیگر افرادِ عالم سابقہ و موجودہ سے ممتاز اور اشمل و اکمل ہے۔ اور انوارِ اُلوہیت کو قبول کر کے اِس منصۂ شہود پر منعکس کرنے کی قابلیت و صلاحیت تام رکھتی ہے۔ لہٰذا خداوند مسیح ہی خدا کا مظہرِ جامع ہو سکتا ہے۔ اور اسی واسطے عقلِ سلیم اُس کے اِس دعوٰی کی حقانیت و صداقت کو بلا عذر قبول کرتی ہے کہ "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا۔ اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے۔ اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے۔ اور اُس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کیا چاہے" (متی ۱۱: ۲۷)۔ "میں باپ میں سے نکلا اور دنیا میں آیا ہوں۔ پھر دنیا سے رخصت ہو کر باپ کے پاس جاتا ہوں" (یوحنا ۱۶: ۲۸ و ۸: ۴۲)۔

ایک بدیہی مثال

خدائے تعالیٰ الطف و ادق اور غیر مرئی وجود ہے اور انسان کی طبعی کثیف آنکھیں اُس حقیقتِ لطیفہ مخفیہ اور وجودِ نا منظوری کو تجربۂ بصارت میں نہیں لا سکتیں۔ لیکن انبیاء و مرسلین و مقربین نے اُس کی آوازِ جانفزا کو ازمنہ سابقہ میں طرح بطرح سُنا۔ اور اُس کے پاک پیغام کو صحائفِ مطہرہ میں قلمبند فرمایا۔ چنانچہ اُس نامنظور و نادیدہ مگر متکلم وجود کی مثال گراموفون ہے۔ اس میں متکلم کی حرف

آواز سنائی دیتی ہے مگر صورت نظر نہیں آتی۔ اِس حقیقت کے اظہار کے لئے ایزدِ تعالےٰ نے فوٹوگرافر کی عقل کو روشن کیا کہ وُہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کی نادیدہ مگر متکلم حیثیت کی آئینہ داری کرے۔ چنانچہ عہدِ عتیق کا زمانہ خُدا کے محض تکلم کا زمانہ تھا نہ کہ ظہور کا۔ اگرچہ وُہ عارضی مظاہر میں کبھی کبھی ظاہر ہوتا رہا، پر وُہ ظاہر جامع اور مستقل نہ ہونے کے باعث اِنسان کی خُدا بینی و یزداں پژوہی کی فطری خواہش کو آسودہ نہ کر سکتے تھے۔

ٹاکیز فلم میں اداکاروں کی آواز، شکل اور حرکات و سکنات تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ خُدا کی حیثیت ظہوری (تجسم) کی مثال ٹاکیز فلم ہے۔ وُہی حقیقت نامظہوری بنوس مجاز میں کثیر معانی کے ساتھ بشریت میں بس گئی۔ وُہی لطیف ہستی مادّی ظاہری جسم میں سما گئی۔ اُسی غیرمرئی لطیف وجود نے "اِنسانی شکل اختیار کی" اور "اِنسانوں کے مشابہ ہو گیا" (فلپی ۲: ۸)۔ چنانچہ اِس حقیقت کے اظہار کے لئے اُس (خُدا) نے فلم کے موجد کے ذہن وعقل کو منوّر کیا کہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کے تجسم اور ظہور کی ایک واضح مثال قائم کر دے۔ چنانچہ گراموفون اور ٹاکیز فلم کے ذریعے ہم خُدا کے بطون وظہور کی حیثیات متشابہ کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ یہ مرئیات و محسوسات ہی کے ذریعے نادیدنی رُوحانی حقیقتوں کا ثبوتی تصور ہم حاصل کر سکتے ہیں "کیونکہ ہونے والی چیزوں کا سایہ ہیں" (کلسی ۲: ۱۷) پس مظہر کے ذریعے خُدا کی ذات وصفات کا ثبوتی تصور اور ماہیت وحقیقت کا یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے بذریعہ مظہر وُہ ایک "معلوم خُدا" ثابت ہوا۔ اور اُس کی عبادت "ایک معلوم خُدا کی عبادت" ہے۔ اور ذاتِ مظہر چونکہ مرآۃ الحق ہے۔ (یوحنا ۱۴: ۹ و کلسی ۱: ۱۵) اِس لئے خُدا کی صفاتِ کاملہ و بالغہ کا ظہور اُسی سے ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم خداوند مسیح کی الوہی صفات کو بھی مجملاً حیطۂ تحریر میں لاتے ہیں تاکہ ناظرین بخوبی سمجھ سکیں کہ کلمۃ اللہ (مسیح) کن معانی میں خدا کا مظہر جامع و کامل ہے۔

قدرت و اختیار خداوند مسیح نے اپنے اختیار و قدرت کو خدائی قدرت و اختیار سے ساتھ ملایا اور یہ دعویٰ کیا "کیونکہ جس طرح باپ مُردوں کو اُٹھاتا اور زندہ کرتا ہے۔ اُسی طرح بیٹا بھی جنہیں چاہتا ہے زندہ کرتا ہے" (یوحنا ۵: ۲۱) اور اُس نے اپنے اس دعویٰ کو عملی طور پر ثابت بھی کیا۔ یعنی اُس نے لعزر کو اپنی قدرت اور اختیار سے یوں زندہ کیا "اور یہ کہکر اُس نے بلند آواز سے پکارا کہ اے لعزر نکل آ" (یوحنا ۱۱: ۴۳) اور وہ چار دن کا مُردہ ایکدم قبر سے باہر نکل آیا۔ اور عبادتخانے کے سردار یائیر کی مُردہ لڑکی کو یہ الفاظ کہہ کر زندہ کیا "اے لڑکی میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ" (مرقس ۵: ۴۱) پھر نائین شہر کی ایک بیوہ عورت کے مُردہ بیٹے کو یہ کہہ کر زندہ کیا "اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ" (لوقا ۷: ۱۴) اور وہ لڑکا فوراً زندہ ہوگیا اور سبت کے روز کفرنحوم کے عبادتخانے میں ایک شخص میں سے بدروح کو یہ کہکر نکالا "چپ رہ اور اس میں سے نکل جا" (مرقس ۱: ۲۵) اور جب بدروح اُس میں سے نکل گئی تو لوگ حیران ہو کر بحث کرنے لگے "کہ یہ کیا ہے؟ یہ تو نئی تعلیم ہے! وہ ناپاک روحوں کو بھی اختیار کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ اور وہ اُس کا حکم مانتی ہیں" (لوقا ۱: ۲۷) اور بھی دیکھو "یہ کیسا کلام ہے؟ کیونکہ وہ اختیار اور قدرت سے ناپاک روحوں کو حکم دیتا اور وہ نکل جاتی ہیں" (لوقا ۴: ۳۶) نہ صرف وہ آپ ہی ایسا اختیار رکھتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی وہ اختیار دے سکتا اور دیتا تھا۔ ملاحظہ ہو "پھر اُس نے اپنے بارہ شاگردوں کو پاس بُلا کر انہیں ناپاک روحوں پر اختیار بخشا کہ اُن کو نکالیں۔ اور ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دُور کریں" (متی ۱۰: ۱) اور انہوں نے مسیح کے دیئے ہوئے اختیار کو ہمیشہ اُسی کی ذاتی قدرت سمجھ کر

استعمال کیا۔ اور اُسی کے نام سے معجزات کئے۔ چنانچہ پطرس اور یوحنا ایک جنم کے لنگڑے کو تندرست کرتے وقت یہ کہتے ہیں۔ "یسوع مسیح ناصری کے نام سے چل پھر" (اعمال ۳: ۶)۔ اور جب اس معجزہ کے باعث اُن کی مخالفت ہوئی، اور یہودی سردار فقیہہ اور کاہن اُن سے پوچھنے لگے کہ "تم نے یہ کام کس قدرت اور کس نام سے کیا؟" اُس وقت پطرس نے روح القدس سے معمور ہو کر اُن سے کہا۔ "...... تم سب اور اسرائیل کی ساری اُمت کو معلوم ہو کہ یسوع مسیح ناصری جس کو تم نے صلیب دی اور خدا نے مُردوں میں سے جلایا۔ اُسی کے نام سے یہ شخص تمہارے سامنے تندرست کھڑا ہے" (اعمال ۴: ۷-۱۰)۔ اور اس معجزہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ مخالفین مسیح بھی اُس کا انکار نہیں کر سکے۔ اور اُن کی گواہی یہ ہے "کہ ہم ان آدمیوں کے ساتھ کیا کریں؟ کیونکہ یروشلیم کے سب رہنے والوں پر روشن ہے کہ اُن سے ایک صریح معجزہ ظاہر ہوا۔ اور ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے" (اعمال ۴: ۱۶)
خداوند مسیح کے معجزات سے بھی کبھی کسی مخالف نے انکار نہ کیا تھا جب اُس نے لعزر کو قبر سے زندہ کیا تو عوام الناس متعجب ہو کر اُسے دیکھنے آئے "لیکن سردار کاہنوں نے مشورہ کیا کہ لعزر کو بھی مار ڈالیں۔ کیونکہ اُس کے باعث بہت سے یہودی چلے گئے اور یسوع پر ایمان لائے" (یوحنا ۱۲: ۱۰-۱۱)۔ "پس فریسیوں نے آپس میں کہا۔ سوچو تو کہ تم سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ دیکھو جہان اُس کا پیرو ہو چلا" (آیت ۱۹)۔ وہ اُس کے کلام کو انسانی طاقت سے بالا سمجھتے تھے۔ (یوحنا ۷: ۴۶) اگرچہ عتیق کے انبیاء نے معجزات کئے تو خدا کے نام سے لیکن مسیح نے اپنے ذاتی اختیار و قدرت سے اور مسیح کے شاگردوں نے مسیح کے نام سے۔ اور بھی بہت سی مثالیں اور نظیریں مسیح کے خداوندانہ اختیار و قدرت کے متعلق پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم اسی قدر بیان کو کافی سمجھ کر بند کرتے ہیں۔

محبت | "جو محبت نہیں رکھتا وہ خدا کو نہیں جانتا کیونکہ خدا محبت ہے" (۱-یوحنا ۴: ۸، ۱۶)

اور الٰہی محبت کا مظہر خداوند مسیح ہے۔ "کسی راستباز کی خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی
جان دے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جرأت
کرے لیکن خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح
ہماری خاطر مؤا۔" (رومی ۵: ۷، و یوحنا ۳: ۱۶) کلام کی گواہی یہی ہے کہ خدا اپنی
محبت کی خوبی کو ہم پر مسیح کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ اور محبت کی انتہا اور
کمال قربانی ہے۔ چنانچہ خداوند مسیح نے اپنی پاک قربانی کے ذریعے الٰہی محبت
کے کمال کی آئینہ داری کی۔ "ہم نے محبت کو اسی سے جانا ہے کہ اس نے ہمارے واسطے
اپنی جان دے دی" (۱-یوحنا ۳: ۱۶) خداوند مسیح نے اپنی زبان حقائق ترجمان سے
فرمایا "اچھا چرواہا میں ہوں۔ اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔" "اور میں
بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں" (یوحنا ۱۰: ۱۱ و ۱۵) "کیونکہ ابن آدم بھی اس لئے
نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے۔ اور اپنی جان بہتیروں کے بدلہ فدیہ میں دے۔"
(مرقس ۱۰: ۴۵ و متی ۲۰: ۲۸) "اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان
اپنے دوستوں کیلئے دیدے۔" (یوحنا ۱۵: ۱۳) اگر خداوند مسیح کی بے غرض، پاک اور
کامل قربانی خدا کی محبت کا ظہور ہے۔ تو تجسم "محبت کے خدا" کا ظہور ہے۔ اور قربانی
کے لئے تجسم ضروری ہے۔ خدا کی محبت یہی کیا کم ہے کہ وہ انسان کی خاطر جسم اختیار کرتا
ہے۔ قربانی دینے میں تو الٰہی ایثار کی حد ہے۔ مسیح کی محبت بے غرض تھی۔ پاک تھی۔ دائمی
تھی۔ دوست دشمن کے لئے مساوی تھی۔ راست و ناراست دونوں پر حاوی تھی۔ کامل تھی۔
اس سے بہتر محبت کا نمونہ عظیم سے عظیم شخصیت۔ نہ قدیم سے قدیم کتاب اور نہ کسی اور
موجود میں پایا گیا۔ جس طرح تمام ستاروں کی مجموعی روشنی خورشید خاور کے بالمقابل
ہیچ اور ماند ہے، اسی طرح تمام افرادِ عالم کی محبتوں کو مسیح کی لاثانی و غیر فانی محبت
کے سامنے کوئی قدر و وقعت نصیب نہیں۔

۲۔ مشہور کہاوت ہے کہ "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز"
یہ قدرت کا مسلمہ اصول ہے کہ محبوب اور محب کا ہم جنس و مساوی المرتبت

ہونا ضروری ہے۔ خُدا کی ذات سراپا لطیف اور وراء الوراء اور فہم و ادراک اِنسانی سے باہر ہے اور انسان خاکی ہے۔ یعنی ذاتِ الٰہی اور ذاتِ اِنسانی میں جنسی مغایرت ہے۔ اور یہی امر محبّت و مِلاپ کے مانع ہے۔ محبّت کے لئے ہم جنسی ضروری و لازمی ہے۔ بغیر ہم جنسی کے میل مِلاپ اور محبّت کا وجود محال ہے۔ بلکہ ہم جنسی کے ساتھ ہی ہم مرتبہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک شہریار کامگار کے ساتھ ایک درویش بوریہ نشیں کی دِلی محبّت اور دوستی ہو سکے، دِل ماننے کو تیار نہیں۔ خُدا اور اِنسان کے درمیان رشتۂ محبّت و مِلاپ قائم کرنے کے لئے خُداوند مسیح اپنی شانِ الٰہی کو چھوڑ کر "اِنسانوں کے مشابہ ہو گیا۔" اِنسانوں کا ہم جنس بن گیا۔ "ابنِ خُدا ہوتے ہوئے ابنِ آدم بن گیا۔" اِسی باعث "وہ اُنہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا۔" (عبرانی ۲: ۱۱) پھر وہ اِنسانی شکل اختیار کر کے کسی شاہانہ تجمّل اور دُنیوی شان و شوکت کے ساتھ نہیں آیا۔ بلکہ نہایت مُفلس گھرانے میں پیدا ہُوا۔ اُس کے سرپرست معاشرت و تمدن کے لحاظ سے مشہور نہ تھے۔ بلکہ لوگ حیرت سے کہتے تھے کہ "کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟" اُس کے سر دھرنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ اُس نے اپنی تمام زندگی فقیری حیثیت میں بسر کی۔ غُربا و مساکین اور رُوحانی و جسمانی دردمندوں کی ہمدردی اور خدمت کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنایا۔ اور بالآخر تمام جہان کے گناہوں کے عوض میں اپنی قیمتی جان کو عدل کے مذبح پر قربان کر کے الٰہی محبّت کے کمال کو بے نقاب کر دیا۔ "محبّت اِس میں نہیں کہ ہم نے خُدا سے محبّت کی بلکہ اِس میں ہے کہ اُس نے ہم سے محبّت کی۔ اور ہمارے گناہوں کے کفّارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا۔" (۱-یوحنا ۴: ۱۰)

قدّوسیّت یہ صفت خُدا کی تمام صفاتِ کاملہ بلیغہ کی دُرّۃ التاج ہے۔ اور

وُہ پاکیزگی جو خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے خُداوند مسیح میں جو "خُدا کی ذات کا نقش" ہے کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ جبرائیل فرشتے کی گواہی :۔ "اور فرشتے نے جواب میں اُس (مریم) سے کہا کہ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگا۔ اور خُدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔ اور اِس سبب سے وُہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے۔ خُدا کا بیٹا کہلائے گا۔" (لُوقا ۱: ۳۵) خُداوند مسیح کا اپنا اقرار "تم میں کون مجھ پر گُناہ ثابت کرتا ہے۔" (یُوحنّا ۸: ۴۶) پطرس رسُول کی گواہی "نہ اُس نے گناہ کیا۔ اور نہ اُس کے مُنہ سے کوئی مکر کی بات نِکلی۔" (۱۔پطرس ۲: ۲۲) پولوس رسُول کی گواہی "ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے۔ بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔ تاہم بے گُناہ رہا۔" (عبرانی ۴: ۱۵) رُومی گورنر پیلاطُوس کی گواہی "میں اِس راستباز کے خُون سے بَری ہُوں۔ تُم جانو۔" (متّی ۲۷: ۲۴) پیلاطُوس کی بیگم کی شہادت "اِس راستباز سے کُچھ کام نہ رکھ۔ کیونکہ مَیں نے آج خواب میں اِس کے سبب سے بہت دُکھ اُٹھایا ہے۔" (متّی ۲۷: ۱۹) پہرہ داروں اور رُومی صُوبہ دار کی گواہی "بہت ہی ڈرے اور بولے کہ بے شک یہ خُدا کا بیٹا تھا۔" (متّی ۲۷: ۵۴) بَدرُوح کی گواہی "مَیں تجھے جانتا ہُوں کہ تُو کون ہے۔ خُدا کا قدُّوس ہے۔" (مرقس ۱: ۲۴) "اَے یسُوع خُدا تعالیٰ کے بیٹے مجھے تجھ سے کیا کام؟" (مرقس ۵: ۷) نہ صرف آپ پاکیزگی اور تنزّہ تام میں خُدا کے ہمسر تھے، بلکہ گُناہوں کی معافی کا بھی اِختیار رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک گنہگار عورت حقیقی تائب دِل سے آپ کے پاک قدموں پر آکر گِری، تو آپ نے فرمایا۔ "تیرے گُناہ مُعاف ہُوئے۔" (لُوقا ۷: ۴۸) پھر ایک دفعہ چند آدمی ایک مفلُوج کو آپ کے پاس لائے۔ آپ نے اُن کا ایمان دیکھ کر اُس مفلُوج سے کہا۔ "اَے آدمی تیرے گُناہ مُعاف ہُوئے۔" لیکن شرع کے عُلماء اور فقہاء نے اِس حکم

کو کفر سے تعبیر کیا۔ اور کہا کہ سوا خدا کے کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اس پر خداوند نے اُن سے سوال کیا کہ "آسان کیا ہے؟ یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہ کہنا کہ اُٹھ اور چل پھر؟ لیکن اس لئے کہ تم جانو کہ ابنِ آدم کو زمین پر گناہوں کے مُعاف کرنے کا اختیار ہے (اُس مفلوج سے کہا) میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ! اور اپنا کھٹولا اُٹھا کر اپنے گھر جا" (متی ۹: ۲-۷) جب آپ نے اپنے فوق العادت فعل کے ذریعے اپنے پہلے قول کو ثابت کر دیا۔ تو "وہ سب بہت حیران ہوئے۔ اور خدا کی بڑائی کرنے لگے۔ اور بہت ڈر گئے۔ اور کہنے لگے کہ آج ہم نے عجیب باتیں دیکھیں" (آیت ۲۶) ابتدائے آفرینش سے از آدم تا ایندم کسی بھی ہستی نے سوائے خداوند مسیح کے یہ خداوندانہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس سے آپ کے الٰہی اختیار۔ قدرت اور قدوسیت کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ اسی واسطے آپ نے یہ فرمایا "میں راست بازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں" (متی ۹: ۱۳ و مرقس ۲: ۱۷) اور اسی واسطے مقدس یوحنا رسول کا قول آپ کی عدیم النظیر ذات کے متعلق کیا ہی موزوں تھا کہ "دیکھو یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اُٹھا لے جاتا ہے" (یوحنا ۱: ۲۹) پس ایزد تعالےٰ کی قدوسیت کے کمال کو بنی نوع انسان پر ظاہر کرنے کے لئے خداوند مسیح مظہر خدا اور ہے۔

ست "بمقابلہ دیگر مذاہب بیچ ہیں"
انجیل کی تعلیم کا سرمایۂ غرائب و نوادر

تمام انبیاء کرام پر فضیلت

دیگر دنیائے مذہب میں اس لئے ایک انوکھی شان اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی ہیرو وہ عدیم النظیر اور فقید المثال ہستی ہے، جس نے زینت افزائے کاشانہ گیتی ہو کر مذاقِ رُوحانیت کے لذت شناسوں اور حق بینی کے طالبوں کی سب سے عزیز خواہشات کا جواب دے کر اُن کے دلوں کو

گہوارۂ مسرت بنا دیا۔ اور خدا کے وصف یلے نصور کو اپنے ظہور پُر نور سے ایسے روشن کر دیا جس طرح پرانے مُبہم خطوطات پر قلم پھیر کر انہیں پھر سے روشن کیا جائے۔ حقائق و معارفِ رُوحانیہ اور شمائل و خصائل قدسیہ تامہ۔ حرکات و افعالِ پسندیدہ۔ خیالات و جذباتِ سعیدہ اور الوہیت کے تمام سربستہ اسرار و انوار اور ذاتِ حق تعالیٰ کا پاک ترین حُسن آپ کے نقابِ انسانیت میں سے رہ رہ کر چھنتا رہتا تھا۔ آپ کی پُر محبت اور وقفِ ایثار زندگی الٰہی محبت کا ایک حسین وجمیل مرقع تھی۔ آپ کی مقدس و پاک ترین اور معصوم رفتار و گفتار الٰہی حُسنِ تقدس کی ایک عُریاں تشبیہ تھی۔ اور حضرتِ انسان کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور معصومیت کا بے نقاب مجسمہ۔ آپ کے پیکرِ خاکی میں ملکوتی صفات کا عکس صاف نظر آتا تھا۔ اسی واسطے آپ کی جامع الصفات زندگی میں ایک ہمہ گیر جاذبیت تھی۔ وہ قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ جو صرف خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے آپ کی پُر حکمت و جلال جسمانی زندگی سے فوق العادت اظہارات کی صورت میں ایسے پھوٹ نکلا کرتی تھی جیسے سحابِ مشکیں میں سے برقِ خاطف کے نورانی ڈورے۔ وہ نور کا ستون جو ابرِ سیاہ کے نقاب میں ہو کر شب کے وقت بنی اسرائیل کی رہبری فرمایا کرتا تھا اُسی سرورِ کائنات اور سرچشمۂ اکرام و حسنات کے جامۂ انسانیت کو مشرف و مفتخر فرمانے کی ایک تشبیہ تھی۔ اور آپ نے اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے بارہا فرمایا "میں دُنیا کا نور ہوں۔ جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلیگا بلکہ زندگی کا نور پائے گا" یوحنا ۸: ۱۲۔ اُس کی نورانی و جلالی زندگی نے واقعی اِس عالمِ آب و گِل کو مہبطِ انوار بنا دیا۔ یہی الٰہی صفات ہیں جو آپ کو تمام انبیاء و مرسلین اور مقدسین و متالہین سے ممتاز

کردیتی ہیں۔ اگر ان صفات قدسیہ الٰہیہ اور خصائص ذاتیہ رُوحانیہ کو آپ
کی ذات پاک سے الگ کردیا جائے تو آپ صرف ایک نبی یا رسُول ہی رہ جاتے
ہیں۔ اور ہم رسُولوں اور نبیوں کو معصوم مطلق اور منزہ عن الخطا نہیں سمجھتے
اور نہ ہی ماننے کی کوئی وجہ ہے۔ کیونکہ اُن کے گناہوں اور توبہ و استغفار
کا بیان صحائف مطہرہ میں بالتصریح موجود ہے۔ البتہ وُہ اپنے اپنے زمانے
کے عام لوگوں کی بہ نسبت خدا ترسی اور نیکی کے لحاظ سے بہترین اشخاص تھے۔
اسی واسطے خُدا کی طرف سے اُنہیں نبوّت و رسالت کے فضائل و مدارج حاصل
ہُوئے۔ خُداوند مسیح نے اپنے آپ کو تمام انبیاء سے افضل اور قدیم ثابت کیا۔
اور اپنی پیش ہستی و قدامت کا یُوں دعویٰ کیا۔ "میں تم سے سچ سچ کہتا ہُوں۔ پیشتر اس
کے کہ ابراہیم پیدا ہُوا میں ہُوں۔" (یُوحنا ۸ : ۵۸) "اور اب اے باپ تُو اس جلال
سے جو میں دُنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنا دے"
(یُوحنا ۱۷ : ۵) مُوسیٰ پر فضیلت۔ "وُہ مُوسیٰ سے اِس قدر زیادہ عزت کے لائق سمجھا
گیا، جس قدر گھر کا بنانے والا گھر سے زیادہ عزت دار ہوتا ہے۔" "مُوسیٰ گھر کا خادم اور
مسیح گھر کا مختار" (عبرانی ۳ : ۳، ۵-۶) داؤد نبی پر فوقیت۔ (مرقس ۱۲ : ۳۵-۳۷)
سُلیمان نبی پر فضیلت۔ "یہاں وُہ ہے جو سُلیمان سے بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲ : ۴۲)
یُونس نبی پر فضیلت۔ "یہاں وُہ ہے جو یُونس سے بھی بڑا ہے۔" (متی ۱۲ : ۴۱)
یُوحنا اصطباغی کی گواہی۔ "میرے بعد وُہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور
ہے۔ میں اِس لائق نہیں کہ جُھک کر اُس کی جُوتیوں کا تسمہ کھولُوں۔ میں نے تو
تمہیں پانی سے بپتسمہ دیا۔ مگر وُہ تمہیں رُوح القدس سے بپتسمہ دے گا۔" (مرقس
۱ : ۷-۸) اور جب مسیح ظاہر ہُوا تو اسی یُوحنا نے اُس کی پیش ہستی کی گواہی دی
حالانکہ پیدائش جسمانی کے لحاظ سے یُوحنا مسیح سے چھ ماہ پہلے پیدا ہُوا تھا۔

تو بھی وُہ مسیح کو اپنے سے قدیم کہتا ہے۔ "یہ وُہی ہے جس کی بابت مَیں نے کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے۔ جو مُجھ سے مقدم ٹھہرا۔ کیونکہ وُہ مُجھ سے پہلے تھا۔" (یُوحنا ۱: ۳۰) یُوحنا رسُول کی گواہی۔ "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خُدا کے ساتھ تھا اور کلام خُدا تھا۔ یہی ابتدا میں خُدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہُوئیں ......" (یُوحنا ۱: ۱-۳) وُہ لاتبدیل ہے۔ "یسُوع مسیح کل اور آج بلکہ ابد تک یکساں ہے۔" (عبرانی ۱۳: ۸) یُوحنا اُس کو اوّل و آخر اور ابدالآباد زندہ رہنے والا۔ اور موت و عالمِ ارواح کی کُنجیوں کا مختار کہتا ہے۔ (مکاشفہ ۱: ۱۷-۱۸ و ۲: ۹) وُہ قدُّوس اور برحق ہے۔ (۳: ۷) "وُہ آمین اور سچا اور برحق گواہ اور خُدا کی خلقت کا مبداء ہے۔" (۳: ۱۴) وُہ اَن دیکھے خُدا کی صُورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولُود ہے۔ تمام آسمانی و زمینی مرئی و غیر مرئی چیزوں کا وُہی واحد خالق ہے۔ اور تمام چیزیں اُسی میں قائم رہتی اور تمام چیزوں کا میل خُدا کے ساتھ اُسی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ (کُلسی ۱: ۱۵-۲۰) وُہ خُدا کا بھید ہے۔ "اور خُدا کے بھید یعنی مسیح کو پہچانیں۔ جس میں حکمت و معرفت کے سارے خزانے چُھپے ہُوئے ہیں۔" (کُلسی ۲: ۲-۳) وُہ تمام نوعِ انسانی کو خُدا کے ساتھ ملانے کے لئے درمیانی ہے۔ (۱ تیمتھیس ۲: ۵) تمام دُنیا کی نجات صرف اُس ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اور بغیر اُس کے نجات محال ہے۔ (اعمال ۴: ۱۲) وُہ تمام دُنیا کی عدالت کرنے والا اکیلا منصف ہے۔ "باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا۔ بلکہ اُس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے۔" (یُوحنا ۵: ۲۲) خُدا کے ملاپ کے لئے مسیح ضروری وسیلہ ہے۔ "راہ اور حق اور زندگی مَیں ہُوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا۔" (یُوحنا ۱۴: ۶) جس طرح عہدِ عتیق کے زمانہ میں انبیاء پر خُدا کی طرف سے الہام ہوتا تھا، اُسی طرح سے

عہد کے رسولوں پر خداوند مسیح کی طرف سے الہام ہوتا ہے چنانچہ مقدس پولوس رسول فرماتا ہے۔" اے بھائیو میں تمہیں جتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری (انجیل) میں نے سنائی وہ اِنسان کی سی نہیں۔ کیونکہ وہ مجھے اِنسان کی طرف سے نہیں پہنچی۔ اور نہ مجھے سکھائی گئی بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اُس کا مکاشفہ ہوا۔" (گلتی ۱: ۱۱-۱۲) "پس ہم مسیح کے ایلچی ہیں۔" (۲-کرنتھی ۵: ۲۰) "پولوس کی طرف سے جو خدا کی مرضی سے مسیح یسوع کا رسول ہے۔" (۲-کرنتھی ۱: ۱ و ۱-کرنتھی ۱: ۱ و افسی ۱: ۱ و کلسی ۱: ۱ و ۱-تھسلنیکیوں ۱: ۱ و ۲ تھسلنیکیوں ۱: ۱ و ۱ پطرس ۱: ۱) پطرس رسول کی گواہی۔ "پطرس کی طرف سے جو یسوع مسیح کا رسول ہے۔" (۱-پطرس ۱: ۱ و ۲ پطرس ۱: ۱) خداوند مسیح کے اپنے الفاظ۔ "اے باپ وہ گھڑی آپہنچی۔ اپنے بیٹے کا جلال ظاہر کر۔ تاکہ بیٹا تیرا جلال ظاہر کرے۔ چنانچہ تو نے اُسے ہر بشر پر اختیار دیا ہے۔ تاکہ جنہیں تو نے اُسے بخشا ہے اُن سب کو وہ ہمیشہ کی زندگی دے۔ اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔" (یوحنا ۱۷: ۱-۳) "تاکہ سب لوگ بیٹے کی عزت کریں جس طرح باپ کی عزت کرتے ہیں جو بیٹے کی عزت نہیں کرتا وہ باپ کی جس نے اُسے بھیجا عزت نہیں کرتا۔" (یوحنا ۵: ۲۳) اور امثال ۸: ۲۲-۳۱ میں کلمۃ اللہ کی قدامت و ازلیت کا بیان خوب واضح الفاظ میں موجود ہے۔ وہاں پر لفظ دانائی مستعمل ہے اور یونانی لفظ لوگاس (کلمہ) کے معنی دانائی اور کلام کے ہیں۔ اور یہ مسیح کا خطاب ہے ناظرین مذکورہ بالا بیان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خداوند مسیح صرف نبی اور رسول ہی نہ تھے بلکہ نبیوں کو الہام دینے والے۔ دُنیا کے خالق و مالک۔ نجات دہندہ اور قابلِ پرستش۔ جب اِس قسم کے الٰہی القاب۔ الٰہی اقوال و افعال۔ الٰہی قدرت و اختیار۔ الٰہی صفات و حسنات اور پاکیزگی و قدوسیت تام اُس کی ذات مقدس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُسے مظہر خدا اور مرآۃ الحق تسلیم کر کے

سرِ نیاز اُس کے پاک و مُبارک قدموں پر نہ رکھ دیا جائے۔

عہدِ عتیق ایک کشفی سِلسلہ ہے، جس میں مکشُوفاتِ قُدسیہ الہیہ مُلہمین پر مُختلف طرح ظاہر ہُوئے۔ اور عہدِ جدید میں اُسی حقیقتِ کشفی کا زمانہ ظہوری کا ظہُور بجسم ظاہری اور تجسم بجسدِ عنصری موجُود ہے۔ اگرچہ خُداتعالےٰ اُس وقت بھی مُختلف عارضی مظاہرات میں ظاہر ہوتا رہا۔ لیکن وُہ خُدا بینی کے متوالے مندوں کی چشمِ اشتیاق کا خاطر خواہ جواب نہ تھے۔ کوئی مُستقل و جامع مظاہر نہ تھے۔ خُداوند مسیح وُہ مُستقل و جامع مظہر ہے جس میں حق تعالیٰ کی تمام صفاتِ قُدسیہ اور رموزِ رُوحانیہ بحدِ امکان ظہُور پذیر ہُوئیں۔ گویا حقیقت برنگِ مجاز منصۂ شہُود پر جلوہ فگن ہُوئی۔ اور انسان کے اِس جذبۂ سجدہ اور آرزُوئے پیشانی کا جواب دیا۔ کہ ؎

کبھی اَے حقیقتِ مُنتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

ہم کہاں تک اُس کے شمائلِ حسنہ و خصائلِ قُدسیہ کی آئینہ داری کریں۔ اُس سراپا نُور کی لاثانی اور بے مِثل زندگی کے چہرے کا ایک گوشہ بے نقاب کرنا بھی طاقتِ قلم سے باہر ہے۔ ہماری مندرجہ بالا تمام تحریر شاعرانہ حمد و سپاس نہیں ہے۔ بلکہ برخلاف اِس کے اِنجیل مُقدس کے بحرِ بے کنار کو کُوزے میں بند کرنے کی ایک ناکام سی کوشش ہے۔ کلام ہماری تحریر سے بدرجہا زیادہ اُس کے لئے وقفِ محامدت ہے۔ بلکہ کلام بھی یہ اعتراف کرتا ہے کہ خُداوند مسیح کی جامع الصفات زندگی اور رفیع القدر ذات کا پُورا بیان نہیں کر سکا۔ (یُوحنا ۲۰: ۳۰، ۲۱: ۲۵)۔

ایک اِعتراض کا جواب	اکثر کُند الطبع اور محجوب الفہم لوگ متلدان

آنخداوند کے ایمان و ایقان کی بنیاد کو جنبش دینے کی نیت سے آپ کی عصمت تامہ پر کمینے منصوبوں سے حملہ کرنا موجب حسنات کثیرہ سمجھتے ہیں۔ اور آفتاب کی طرف خاک ڈھیل اُڑانے یعنی مسیحیت کا مقابلہ کرنے کو اپنے عقائد کے استحکام کی وجہ تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ اور شیر قالین کو شیر نیستان کے بالمقابل کھڑا کر کے اصل کو نقل اور نقل کو اصل ثابت کرنے کی ناکام کوششوں پر فتحمندانہ نعرے لگاتے ہیں۔ ہم یہاں پر اُن کو جواب دینے میں اختصار سے کام لیں گے۔ کیونکہ اس کتاب کا اختصار جو ہمیں منظور ہے اجازت نہیں دیتا کہ مخالفین کے تمام اعتراضات کو رفع کریں۔ اور طول بیانی و تضیع اوقات کے علاوہ سر دردی مول لیں۔ مسیحی مصنفین نے اس امر میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ مخالفین خداوند مسیح کے اس بیان کی بنا پر اعتراض اُٹھایا کرتے ہیں کہ "یسوع نے اس سے کہا۔ تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ (مرقس ۱۰: ۱۸؛ لوقا ۱۸: ۱۹؛ متی ۱۹: ۱۶)۔

اوّل۔ اس مقام میں خداوند مسیح نے اپنی نیکی کا نہ تو اقرار کیا اور نہ انکار۔ کیونکہ خدا کے نیک ہونے اور انسان کے نیک ہونے میں بڑا فرق ہے۔ خدا اس معنی میں نیک نہیں کہ وہ بے گناہ ہے۔ بلکہ وہ قدوس اور بالذات پاک ہے اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ پس الٰہی نیکی کا اقرار انسانی نیکی کا انکار نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا کی نیکی اور مسیح کی نیکی کوئی دو باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ "مسیح خدا کی راست بازی ہے"۔ (۱-کرنتھی ۱: ۳۰) لہٰذا مسیح نے اپنے نیک ہونے کا انکار نہیں کیا۔

دوم۔ وہ سائل مسیح کو دیگر مذہبی اُستادوں اور عالموں کی طرح محض ایک اُستاد ہی مانتا تھا۔ اسی لئے وہ کہتا ہے "اے نیک اُستاد"۔ اور جیسے بعض

اُستادوں کے متعلق لوگ کہا کرتے ہیں کہ وُہ بڑا شریف النفس ہے۔ وُہ بہت نیک ہے
لیکن اُس نیکی سے مُراد معصومیت تام نہیں ہوتی بلکہ اُن میں بعض اوصاف عام مردوں
کی بہ نسبت اچھے ہوتے ہیں۔ جب کسی اُستاد یا ہادی کو نیک کہا جاتا ہے تو اِس سے یہ
مُراد نہیں ہوتی کہ وُہ نیکی میں خُدا کا ہمسر ہے۔ اور جب کسی اُستاد کو عالم فاضل کہا جاتا
ہے تو اُس سے یہ مُراد نہیں ہوتی کہ وُہ خُدا کی مانند علیم کُل یا ہمہ دان ہے۔ پس اِسی
طرح اُس سائل نے عام اُستادوں کی طرح نیک اُستاد کہا۔ اور آپ نے اِس ظاہری ناکامل
اور نام نہاد نیکی کو اپنی ذات کے متعلق قبول نہ کیا۔ کیونکہ آپکی بے نقص اور کامل نیکی کو انسان
کی ہی ناکامل اور ناقص نیکی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا بے انصافی ہے۔ کیونکہ انسان
کی ادھوری نیکی کے متعلق تو کلام یہ گواہی دیتا ہے "کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز انسان
نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے" (واعظ [illegible]) اس لئے مسیح نے اُسے کو بتایا کہ اگر تو
مجھے دیگر مذہبی اُستادوں کی طرح محض انسان سمجھ کر ہی نیک اُستاد کہتا ہے۔ تو کوئی
نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا" تاکہ سائل یہ غلط خیال اپنے ذہن سے نکال دے کہ
مذہبی اُستاد بھی نیکِ مطلق ہو سکتے ہیں۔ اور اُس کا اِس عام لقب سے مسیح کو
خطاب کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی حضور والا شان کو کہے "سلام [illegible] میاں جی"
[illegible]۔ متی ۱۹:۱۶ کو پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خداوند مسیح نے نہ تو
اپنی نیکی کا اقرار کیا اور نہ انکار۔ بلکہ صرف ایک طرح سے نیکی کے معنے بتائے۔
اور فرمایا کہ "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پُوچھتا ہے" یعنی کہ اعمال حسنہ جن کو تم سچی
اور "ہمیشہ کی زندگی" کی شرط سمجھے ہوئے ہو خُدا کی نظر میں پُورے نہیں۔ اور
ایسی ادھوری نیکیوں سے "ہمیشہ کی زندگی" کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ حقیقی
نیکی تو گناہ آلودہ طبیعت سے ہو ہی نہیں سکتی بلکہ سراپا نیک و پاک طبیعت سے
صادر ہُوا کرتی ہے۔ کیونکہ "کیا انجیر کے درخت میں زیتُون اور انگور میں انجیر پیدا ہو

سکتے ہیں ؟ اِسی طرح کھاری چشمے سے میٹھا پانی نہیں نکل سکتا " (یعقوب ۳ : ۱۲) اور اگر نیک بن جانا اپنی ذاتی کوشش سے ممکن ہے تو " کامل ہو جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے " (متی ۵ : ۴۸ ; افسی ۵ : ۱) ایسی کمالیت ہی " ہمیشہ کی زندگی " کے لائق انسان کو بنا سکتی ہے ۔ لیکن انسانی کوشش کا یہ حال ہے " میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے ۔ مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے " (رومیوں ۷ : ۱۸) اعلیٰ درجہ کی بے نقص نیکی کا تو کیا ذکر اُس سائل سے تو معمولی درجہ کی نیکی بھی نہ ہو سکی ۔ یعنی جب مسیح نے فرمایا کہ " جا اپنا سارا مال غربا کو بانٹ دے ۔ اور میرے پیچھے ہو لے " تو وہ جوان یہ بات سُن کر غمگین ہو کے چلا گیا کیونکہ بڑا مالدار تھا " (آیت ۲۱ و ۲۲) اُس کی اِس رَوِش سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بتائی ہوئی معمولی اور ممکن العمل نیکی کو ناممکن العمل سمجھا ۔ اور نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ وہ معمولی کاموں کو جن پہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی نیکیاں سمجھتا تھا ۔ اِسی نادیدہ نگاہ سے اُس نے آپ کو " اے نیک اُستاد " کہا ۔ اور آں خداوند نے اِس قسم کی ظاہری اور رسمی و رواجی نیکی کو اپنے اُوپر عائد ہونے نہ دیا ۔ اور اس نے " نیک اُستاد " کے الفاظ کو اپنے حق میں قبول نہ فرمایا ۔

چہارم ۔ اگر آپ اِس قسم کی ادنیٰ نیکی کا اطلاق اپنی ذات پر جائز ٹھہرا لیتے تو یہودی گندم نما جو فروش اُستادوں اور ربّیوں کو ملامت و تنبیہ نہ کر سکتے ۔ بقول " خود را فضیحت اوروں کو نصیحت " اوّل درجہ کی حماقت ہے ۔ کیونکہ " خفتہ را خفتہ کے کند بیدار " اور اسی واسطے آپ ایسے درس دے سکے کہ " کیا اندھے کو اندھا راہ دکھا سکتا ہے ؟ کیا دونوں گڑھے میں نہ گریں گے ؟ " (لوقا ۶ : ۳۹) اور " جس کی آنکھ میں شہتیر ہے وہ اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو نہیں نکال سکتا " (متی ۷ : ۱ - ۵) یہ باتیں آپ کی عصمت تامہ کی گارنٹی ہیں ۔

پنجم۔ اگر آپ کا دامن عصمت گناہ کے گرد وغبار سے ذرا بھی آلودہ ہوتا تو آپ دُوسروں کے گناہ مُعاف کرنے کا اختیار نہ رکھتے۔ آپ نے گنہگاروں کے گناہ بخشے (لُوقا ۵: ۲۰۔ ۲۴۔ ۷: ۴۸) اور گناہ سے تاجت توبہ کی لازم آتی ہے لہذا مخالفین اپنے اِس ردّی دعوی کے ثبوت میں آپ کی توبہ و استغفار کے متعلق کوئی مقام انجیل جلیل سے پیش کریں۔ ورنہ سُورج پر تھوکنے سے باز رہیں۔ وُہ اپنے ہی مُنہ پہ پڑے گا۔

ششم۔ قُرآن شریف اور احادیثِ معتبرہ آنخداوند کی عصمت تامہ پر زبردست گواہی دیتے ہیں۔ جو تحقیقات کا شائق ہو اسلامی لٹریچر کی ورق گردانی کر دیکھے اور مسیحی صحائف مُطہرہ کو بھی اچھی طرح مُطالعہ کرے۔ اگرچہ مسیح کی اُلوہیت و قدّوسیّت کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کی آراء منزور نہیں۔ کیونکہ انجیل مُقدّس کی تائید و تصدیق ہی کافی سے زائد ہے۔ اور محتاج نہیں کہ غیر مسیحی عُلماء کی تائید ہمارے دعوی کو تقویت دے۔ تو بھی ہم مصلحتاً اسلام کے ایک جید عالم کی رائے مسیح کے متعلق یہاں قلمبند کرتے ہیں۔ مولوی سیّد وحید الدین خان آزاد اپنی کتاب "اتحاد تحقیق بہ مشرب سُنی" کی فصل ۳ صفحہ ۴ میں اپنا شخصی اعتقاد خُداوند مسیح کے متعلق یوں قلمبند فرماتے ہیں "مختصراً اپنا اعتقاد ہم یہ لکھتے ہیں کہ کتاب بائبل یعنی مجموعۂ توریت و انجیل وغیرہ کا بہت حق ہے۔ اور سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصاً ذات حضرت مسیح علیہ السّلام کی ایسی ملکی صفات ہیں۔ کہ اگر ہم اُن کو خُدا نہ کہیں تو اُن کو مجرد آدمی بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ اُن کی صفات عام ظاہراً قوتِ بشری سے بہت زائد ہیں۔ اور سوائے اِس کے چارہ نہیں کہ اُن کو ہم ایک آدمی مع اللہ تسلیم کریں۔ اور قرآن شریف میں جو ذکر اُن کا بلفظ کلمتہ اللہ و رُوح اللہ کے ہے۔ سو اس سے زیادہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور توریت و زبور

وغیرہ میں پیشین گوئیاں نسبت اُنکی اِس کثرت سے ہیں کہ قوم یہود کو خود انتظار ایک مسیح کا ہے"۔

کیا تجسم خدا کی کسرِ شان ہے؟

"اُس نے اگرچہ خدا کی صورت پر تھا۔ خدا کے برابر ہونے کو قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا۔ بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا۔ اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا"۔ (فلپی ۲: ۶-۸)

مسیحیت کے عظیم الشان اور مایۂ ناز مسئلۂ تجسم کو غیر معقول ثابت کرنے کی غرض سے غیر مسیحی لوگ اس بہت سے بے جا و پوچ اعتراضات اُٹھایا کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ "تجسم خدا کی کسرِ شان ہے"۔ یہ اعتراض بہت دفعہ ہمارے سننے میں آتا ہے۔ لیکن ہم مخالفین کی اس دوہری ذہنیت پر حیران ہیں کہ اُنہوں نے:۔

(۱) طبقۂ جمادات میں پتھر کو خدا کا مظہر تسلیم کیا۔ اور پتھر کی مورتیوں کو مظہرِ خدا سمجھ کر اُن کی پرستش پر عمر فرسائی کی۔ اہلِ اسلام حجرِ اسود کو جو خانۂ کعبہ میں ہے چومتے ہیں۔ اور ہندوؤں کا تو ذکر ہی کیا۔ اُن کے سر بفلک سنگین صنم خانے تو کروڑہا پتھر کے بت اِس حقیقت پر شاہد ہیں۔ یہاں تک کہ عابدوں کی تعداد سے معبودوں کی تعداد بڑھی ہوئی ہے۔ بھلا پتھروں سے خدا کی ذات و صفات کا ظہور کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اصنامِ سنگین کو انسان کی نجات سے کیا واسطہ؟

(۲) طبقۂ نباتات میں خدا کے مظاہر مانتے۔ اور خاص خاص درختوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ کور اعتقادی تاحال زد و دل پر رہی ہے۔ حالانکہ درخت خدا کی صفاتِ کاملہ کے مظہر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی وہ انسان کا خدا کے ساتھ

ملاپ کروا سکتے ہیں۔ کہاں مظہر اور نجات انسانی اور کہاں نباتات!

(۳) طبقۂ حیوانات میں خدا کے مظاہر ماننے۔ گئو۔ بیل اور سانپ وغیرہ کی پرستش ہوتی ہے۔ اور مصری میںڈھے کے متبرک سانڈ کو پوجتے تھے ہند میں بھی متبرک سانڈ پوجے جاتے ہیں۔ کیا کوئی عقلمند آدمی مان سکتا ہے کہ حیوان خدا کی ذات کاملہ اور صفاتِ قدسیہ الٰہیہ کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ پھر اُن کو تعظیم الٰہی کی جگہ دینا کفر و شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

(۴) طبقۂ انسانی میں سینکڑوں مظاہر ماننے۔ راجاؤں۔ سورمیروں۔ بزرگوں۔ رشیوں۔ منیوں کو اوتار (مظہرِ خدا) تسلیم کیا۔ اور اُن کی پرستش مدتوں سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اُن کے سنگین مجسمے قریب قریب ہر شہر اور مندر میں موجود ہیں۔ اور کروڑوں کی تعداد میں خلقِ خدا اندھا دھند شبانہ روز اُن کی عبادت میں مصروف ہو کر موردِ عذابِ الٰہی ہو رہی ہے۔ جس طرح ہر ایک ہرن کی ناف میں کستوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک سیپی میں موتی نہیں ہوتا۔ ہر دھات سونا نہیں ہوتی۔ ہر شفاف شے آئینہ نہیں ہوتی۔ اُسی طرح ہر انسان خدا کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہی جس میں الٰہی صفات اور الٰہی طبیعت موجود ہو۔ دُنیادار۔ عیش پرست اور جنگجو لوگ خدا کے مظہر نہیں ہو سکتے۔ ذاتِ مظہر میں انسانی و الٰہی ہر دو طرح کی صفات کا وجود ضروری ہے۔ اُس کی ایک حیثیت خدا سے اور دوسری حیثیت انسان سے مقرون ہو۔ تاکہ ربطِ حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ مظہرِ خدا میں ان دو حیثیات کا اجتماع لابدی ہے اُس کا انسانِ کامل اور خدا کامل ہونا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ مجسم اختیار کرنا خدا کی کسرِ شان تب ہو اگر وہ جمادی، نباتاتی اور حیوانی طبقات میں مجسم ہو۔ انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور

مظہر خدا سے استفادہ بھی وُہی کر سکتا ہے۔ نجات کا اِنتظام بھی اُسی کے لئے کیا گیا ہے۔ خُدا کا مِلاپ بھی صرف طبقۂ اِنسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے تو اندریں صُورت اگر خُدا مجسّم ہو کر انسانی جامہ پہنے تو اِس میں خُدا کی شان نہیں گھٹتی بلکہ برعکس اس کے انسانیت کی شان بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ اگر اشرف وجُود ادنیٰ وجُود کے ساتھ مُتحد و مقرُون ہو جائے تو ادنیٰ کی قدر وقیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً رُوح کے ساتھ اتحاد رکھنے کے باعث ہمارے جسم کی اس قدر قدر وقیمت ہے۔ اگر رُوح جسم کو چھوڑ جائے تو اس کی ساری قدر ومنزلت یکسر جاتی رہے۔

(۱) اگر لعل یا جواہر کا ایک ننھا سا ذرہ پیتل کی انگوٹھی پر بطور نگینہ لگا یا جائے تو اُس انگوٹھی کی قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ ایک دُرِّ یتیم کی وجہ سے ایک صدف کی قدر وقیمت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وُہ دُرِّ بے بہا اُس میں سے نکال لیا جاتا ہے تو خالی سیپی کسی کام کی نہیں رہتی۔ اِسی طرح خُداوند مسیح جب مجسّم ہو کر انسانیّت سے مقرُون ہو گئے تو اِنسانیّت کا مرتبہ بڑھ گیا۔

(۲) پُرانے زمانے میں بعض بادشاہ فقیر اِنہ بھیس بدل کر رات کے وقت اپنی رعیّت کے پست و مظلُوم طبقہ کے دُکھ درد جاننے کی خاطر اِدھر اُدھر اُن کی جھونپڑیوں میں گشت لگایا کرتے تھے۔ اور اُن کی مظلُومیّت و مُصیبت کے مُوجبات کا سُراغ لگا کر اگلے روز تختِ عدالت پر بیٹھ کر اُن کا اِنصاف کر دیتے تھے۔ اگر بادشاہ شاہی شان وتجمّل میں اُن کے پاس جاتا تو وُہ حواس باختہ ہی ہو جاتے۔ اُن میں کب یہ حوصلہ رہتا کہ بادشاہ کو بلا خوف اُن مظالم و مصائب سے آگاہ کرتے جو زبردستوں کی طرف سے اُن پر روا رکھے جاتے تھے۔ اب

ظاہر ہے کہ فقیرانہ بھیس بدلنے سے بادشاہ کے اختیار و مرتبہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بے کس و مظلوم لوگوں کے حق میں اُس کا یہ ایثار کثیر المنفعت اور مصائب سے نجات دلانے کا موجب ہو جاتا تھا۔ اسی طرح مسیح کے جسم انسانی میں اس عالم آب و گل پر ظہور فرمانے سے ایزد تعالیٰ کا حد درجہ ایثار ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے دُنیا کے "تھکے ماندے اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں" کے لئے آرام و مسرت اور حقیقی آزادی کا دروازہ کھل گیا۔

(۲) ایک لعل و جواہر کے سوداگر (جوہری) کے پاس ایک نہایت خوبصورت ہنس تھا جس کو وُہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ بہت لوگوں نے اُسے خریدنے کی کوشش کی مگر اُس سوداگر نے ہمیشہ اُس کے بیچنے سے انکار کیا۔ اُس کے کئی دوست ناراض ہو کر چلے گئے۔ ایک روز اُس نے سوچا کہ اس ہنس کی وجہ سے میرے کئی دوست مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ میں نے اس کو اُن کے ہاتھ بیچنے سے انکار کیا۔ مناسب ہے کہ میں اس کی قیمت دو ہزار روپیہ ٹھہراؤں۔ نہ کوئی اتنے دام دے گا اور نہ ہنس لے جائے گا۔ بھلا دو ہزار روپیہ دے کر اس مشت پر کا کوئی کیا بنائے گا؟ ایک روز ایک جواہرات کا گاہک کوئی قیمتی جواہر خریدنے کے لئے اُس کی دوکان پر آیا۔ سوداگر اُس وقت دوکان کے اندرونی حصے میں کوئی کام کر رہا تھا۔ گاہک کے دیکھتے دیکھتے اُس ہنس نے ایک لاکھ روپیہ کا ایک قیمتی لعل نگل لیا۔ جب سوداگر باہر آیا تو اُس نے گاہک سے پوچھا کہ آپ کیا خریدیں گے؟ اُس نے کہا کہ "یہ ہنس"۔ سوداگر نے جو اصل حقیقت سے ناواقف تھا کہا کہ اس کی قیمت دو ہزار روپیہ ہے۔ گاہک نے فوراً دو ہزار روپیہ ڈھیری کر دیا۔ اور ہنس اُٹھا لیا۔ سوداگر بہت خوش تھا کہ اچھا بے وقوف ملا ہے۔ جو پانچ دس روپے کی چیز کے دو ہزار روپے دے کر چلا گیا

ہے۔چلو کیا خسارہ ہے۔ سراسر نفع ہی ہے۔ دیکھئے اُس لاکھ روپے کے لعل نے اِس جنس کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا۔ اگر اُس کے پیٹ کے اندر وُہ قیمتی لعل نہ ہوتا تو کون اُس کو اتنی گراں قیمت پر خریدتا؟ جنس کے پیٹ میں پڑنے سے لعل کی قیمت گھٹی نہیں، بلکہ قائم رہی۔ کلمتہ اللہ (مسیح) وُہ لعل بہشتی تھا۔ (امثال ۸: ۱۱؛ ۱۹؛ متی ۱۳: ۴۵ و ۴۶) جو مُقدسہ مریم کے بطن میں پڑا تو اُس کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ آج اُس نادار عورت کو کروڑوں لوگ مسیح کی ماں سمجھ کر نہایت عزت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ مریم کا اپنا اقرار ملاحظہ ہو۔ "میری جان خُداوند کی بڑائی کرتی ہے۔ اور میری رُوح میرے مُنجی خُدا سے خوش ہُوئی۔ کیونکہ اُس نے اپنی بندی کی پست حالی پر نظر کی۔ اور دیکھ اب سے ہر زمانے کے لوگ مجھ کو مبارک کہیں گے" (لوقا ۱: ۴۶-۴۸) وُہ جب اِس عالمِ سِفلی میں "انسانوں کے مشابہ" ہو کر آیا تو اُس وقت "جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا" (یُوحنا ۱: ۱۲) وُہ ابنِ آدم بن گیا تاکہ انسانوں کو خُدا کے بیٹے بنائے۔ وُہ خاکی بن گیا تاکہ ہم خاکیوں کو افلاکی بنائے۔ "وُہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے۔ ہماری پست حالی کے بدن کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صُورت پر بنائے گا" (فلپیوں ۳: ۲۱) وُہ صلیب پر چڑھا تو اُس لعنت کے نشان کو برکت کا نشان بنا کر اُس کی شان کو بڑھا گیا۔ اُس کو جب ماندہ لوگ قبول کریں تو اُن کی شان بڑھ جاتی ہے۔ "وُہ اگرچہ دولت مند تھا مگر تمہاری خاطر غریب بن گیا۔ تاکہ تم اُس کی غریبی کے سبب سے دولتمند ہو جاؤ" (۲-کرنتھی ۸: ۹) وُہ مر گیا تاکہ گناہ و موت ہمیشہ کے لئے نیست ہو جائیں۔ وُہ زندہ ہو گیا تاکہ ہم حیاتِ ابدی کو حاصل کریں۔

پس اَے ناظرین! تجسّم خُدا کی کسرِ شان نہیں ہے، بلکہ ہم عالمِ خاکی کے

باشندوں کی قدر وقیمت کو بڑھانے اور ہمیں خاکِ مذلت سے اُٹھا کر عرشِ بریں پر پہنچانے کے لئے خُدا تعالیٰ کی حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ خُداوند مسیح عرشِ بریں کو چھوڑ کر اس عالمِ سفلی میں آیا تاکہ اِس خارستان کو عرشستان بنادے۔ اور اِنسانیت سے متحد ہوگیا تاکہ ہم الوہیت (خُدا) سے متحد ہو کر حیاتِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کریں آمین!

مسیح کامل اِنسان

انجیل کی رُو سے اِنسانِ کامل وُہ ہے جس کی ذات ارثی۔ متعدی۔ کسبی۔ عملی اور خیالی ہر قسم کے گُناہ سے بکلی آزاد ہو۔ اور عمد و سہو کے گُناہ سے قطعی مبرا و منزہ ہو۔ گنہگاروں کی صُحبت میں رہے پر گُناہ اُس کی پاک طبیعت پر مطلق اثر انداز نہ ہو۔ اور خُداوند مسیح اِس معیار کے مطابق اِنسانِ کامل ہے۔ "کیونکہ ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمدرد نہ ہو سکے۔ بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔ تاہم بے گُناہ رہا۔" (عبرانی ۴: ۱۵) "اور اُس کی ذات میں گُناہ نہیں۔" (۱۔ یُوحنا ۳-۵) "اُس بیٹے کو مقرر کرتا ہے جو ہمیشہ کے لئے کامل کیا گیا۔" (عبرانی ۷: ۲۸)۔ اِسی واسطے ہر مسیحی ایماندار کو اُس کے قد کے اندازے تک پہنچنے کا حکم ہے۔ "جب تک ہم سب کے سب خُدا کے بیٹے کے ایمان اور اُس کی پہچان میں ایک نہ ہو جائیں۔ اور کامل انسان نہ بنیں۔ یعنی مسیح کے پُورے قد کے اندازے تک نہ پہنچ جائیں۔" (افسی ۴: ۱۳)۔

خُدا نے اِنسان کو اپنی صُورت پر پاک و راست پیدا کیا تھا۔ لیکن حضرت اِنسان نے گُناہ کی کالک سے اپنی وُہ فطری جلالی صُورت بگاڑ لی۔ اور الٰہی صُورت کے وُہ نُورانی خدوخال اور نقش و نگار گُناہ نے اُس کے حافظہ سے مٹا دیئے۔ اب دوبارہ وُہ خُدا کی صُورت کے ساتھ مشابہت

پیدا کرے تو کیونکر کرے؟ اور مشکل یہ ہے کہ جس کی صورت پر (مشابہ) وہ بنا تھا وہ نادیدہ ہے "وہ اُس نور میں رہتا ہے جس تک کسی کی گذر نہیں ہو سکتی۔ نہ اُسے کسی اِنسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے"۔ (۱۔تمتھیس ۶: ۱۶) پس جس حال کہ اُس شبیہ اللہ کا کوئی مرئی نمونہ ہی اِنسان کے سامنے نہیں تو نادیدہ کی صورت پر کیسے اپنی صورت کو بنائے؟ انسان کی اِس بھاری مشکل کو حل کرنے کے لئے کلمۃ اللہ نے ملبوسِ اِنسانی اختیار کیا۔ اور اُس کی کامل انسانیت میں اُس کھوئی ہوئی الہٰی صورت کا پورا پورا سراغ مِلتا ہے" کیونکہ الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے"۔ (کلسی ۲: ۹) "وہ اندیکھے خدا کی صورت ہے"۔ (کلسی ۱: ۱۵) لہٰذا وہ نادیدنی خدا کا دیدنی نمونہ ہے۔ اور اُس کی صورت پر بحال ہونا ہی خدا کی صورت پر بننا ہے۔ لازم ہے کہ ہم "اُس کے بیٹے کے ہم شکل ہوں"۔ (رومی ۸: ۲۹) وہ اُس گمشدہ الہٰی صورت کا نمونہ ہے جس کے مطابق اِنسان بنایا گیا تھا" اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے۔ اُسی طرح اُس آسمانی کی صورت پر بھی ہوں گے"۔ (۱۔کرنتھی ۱۵: ۴۹) +

علامہ جامی شرح فصوص الحکم میں ایک بہت ہی جامع معیار اِنسانِ کامل کا پیش کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ انسانِ کامل میں تین نشأتیں ہیں۔ اوّل نشأۃ روحانی۔ دوم نشأۃ عنصری۔ سوم نشأۃ مراتبی۔ (ماخوذ از انسانِ کامل یا مظہرِ خدا) چنانچہ اِس بیان کردہ معیار کے مطابق بھی خداوند مسیح کے سوا اور کوئی اِنسان کامل نہیں ہو سکتا۔ اور انجیل مقدس سے آنخداوند کے متعلق یہ دعویٰ پورے طور پر ثابت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اوّل۔نشأۃ روحیہ ۔ "مَیں اور باپ ایک ہیں"۔ (یوحنا ۱۰: ۳۰) "مَیں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں"۔ (یوحنا ۱۶: ۲۸ و ۸: ۴۲) "راہ حق اور زندگی

میں ہُوں"۔(یُوحنّا ۱۴: ۹) "اُلُوہیّت کی ساری معمُوری اُسی میں مجسّم ہوکر سکُونت کرتی ہے"۔ (کُلسّی ۲: ۹)۔

دوم۔ نشأۃ عنصریہ۔ "اب سے ابنِ آدم قادرِ مُطلق خُدا کی داہنی طرف بیٹھا رہے گا"۔ (لُوقا ۲۲: ۶۹؛ ۱۷: ۲۲؛ ۲۴؛ ۲۴: ۳۰)۔

سوم۔ نشأۃ مرأتیہ۔ "جس نے مُجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا"۔ (یُوحنّا ۱۴: ۹) "وُہ اَن دیکھے خُدا کی صُورت ہے"۔ (کُلسّی ۱: ۱۵)

خُداوند مسیح کی نشأۃ رُوحیہ و نشأۃ عنصریہ کا قرآن شریف بھی مُصدّق ہے۔ اَور اُسے "رُوح اللّٰہ" اَور "اِنسان" بھی کہتا ہے۔ پس خُداوند مسیح کے سوا اَور کوئی نبی رسُول۔ اَوتار۔ بھگت۔ گرُو۔ رِشی۔ مُنی اَور مہاتما وغیرہ انسان کامل نہیں ہُوا۔ اگر کوئی دعویٰ کرے بھی تو بلے ثبُوت ہو گا۔ لوگ اپنی مذہبی کتابوں کے دعوٰی سے بڑھ کر دعوے کر کے حق کو چھپاتے۔ خود گمراہ ہوتے اَور دُوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اَور یُونہی لفظی کھینچا تانی سے بانیانِ مذاہب کو اُن کے شخصی دُعاوی سے بڑھ کر دِکھانے کی فضُول کوششیں کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ اِس بیسویں صدی کے مسیحی خُداوند مسیح کی زمینی زندگی کے ایّام میں موجُود نہ تھے۔ اِس لئے وُہ اپنے نجات دہندہ کے چشم دید گواہ نہیں ہو سکتے۔ اِسی طرح اِس زمانہ کے تمام حامیانِ مذہب اَور مقلدانِ ادیان بھی اپنے اپنے بانیانِ مذہب کے ایّام زندگی میں موجُود نہ تھے۔ وُہ بھی اُن کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔ اِس لئے ہم سب کے دُعاوی کی بُنیاد مذہبی کُتب ہی ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا صِدق دِلی اَور اِنصاف پروری سے برائے انفصال اَور تحقیقِ صداقت اپنی اپنی کُتب کی ورق گردانی کریں، تو ثابت ہو جائے گا کہ آپ کے اپنے مذہبی بانیوں کے متعلق دُعاوی۔ خُوش فہمی و ہٹ دھرمی کے مبالغے اَور شاعرانہ محامد

سے زائد نہیں ہیں۔ ہم نے تو خداوند مسیح کا انسانِ کامل ہونا اپنے صحائف مطہرہ سے ثابت کر دیا ہے، اور آئندہ جو کچھ ثابت کریں گے اپنے معتقدات سے سند دے کر کریں گے۔

مسیح کن معانی میں خدا کا بیٹا ہے؟

وہ "پاکیزگی کی رُوح کے اعتبار سے مُردوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا۔" (رومیوں ۱: ۴) بیٹے کے بغیر باپ باپ نہیں کہلا سکتا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے بغیر باپ کا لفظ بے معنی ہے۔ اِس لفظ میں معنی ڈالنے کے لئے بیٹے کا وجود لازمی ہے۔ اِس صورت میں بیٹا گویا باپ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ بغیر بیٹے کے باپ کا تعارف لوگوں سے کروانا محال ہے پس خدا کو دُنیا پر باپ کی حیثیت میں ظاہر کرنے کے معنی میں بھی مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ "خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا۔" (یوحنا ۱: ۱۸) وُہ فرمانبرداری کے اعتبار سے خدا کا بیٹا ہے۔ "میں ہمیشہ وُہی کام کرتا ہُوں جو اُسے پسند آتے ہیں۔" (یوحنا ۸: ۲۹) "میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہُوں۔" (یوحنا ۵: ۳۰) "اِنسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا۔ اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی۔" (فلپیوں ۲: ۸)۔ اِسی واسطے باپ نے فرمایا کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہُوں۔" (متی ۳: ۱۷) وُہ اِلٰہی ذات ہونے کے سبب سے خدا کا بیٹا ہے۔ "اِبتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی اِبتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔" (یوحنا ۱: ۱-۲) "وُہ اندیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔" (کلسیوں ۱: ۱۵) "وُہ اُس کے جلال کا پرتو اور اُس کی ذات کا نقش ہے۔" (عبرانیوں ۱: ۳)

خدا سرچشمۂ کلام ہونے کی حیثیت سے "باپ" کہلاتا ہے۔ اور کلام (مسیح)

اُس سے صادر ہونے کی حیثیت سے "بیٹا" کہلاتا ہے۔ یہ رُوحانی اصطلاح ہے۔ اِس لئے باپ اور بیٹے کے اِس رشتہ کو رُوحانی طور پر پرکھنا چاہیئے۔ اور کلام جب تک متکلم کی ذات میں مخفی رہتے حکمت (لوگاس) کہلاتا ہے اور جب ظاہر ہو تو کلام۔ وُہ کلام نفسی (حکمت) ہو کر خُدا کی واحد ذات میں مخفی رہتا اور کلام لفظی ہو کر مظہرِ خُدا اور مخلُوقات کی پیدائش کی علّت ٹھہرتا ہے۔ باپ ازلی و ابدی حقیقتِ مخفیہ ہے۔ اور بیٹا اُسی کی حیثیتِ ظہُوری۔

بہُت سے کوتاہ نظر لوگ مسیح کو "خُدا کا بیٹا" کہتے ہیں خُدا کی جورُو کا وجُود لازمی سمجھتے ہیں۔ مُناسب معلُوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اُن کے اِس خیال کی غیر معقُولیت کو مبرہن کر کے مسیحی مسلّمات کے مطابق ابن اللہ کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ سب سے پہلے ہم یہ پُوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ اگر جورُو کے بغیر بیٹا ہونا ممتنع ہے تو حضرت ابو البشر (آدم) کی ماں کون تھی۔ باپ کون تھا؟ جیسے آدم کی ماں اور باپ نہ تھے۔ ویسے ہی مسیح کا باپ جسمانی طور پر کوئی نہ تھا، کیونکہ وُہ مریم باکرہ سے پیدا ہُوئے۔ دُوسری بات یہ ہے۔ کہ اگر "ابن اللہ" کہنے میں خدا کی "جورُو" کا وجُود لازمی ہے تو عربی محاورہ میں ابن السّبیل" (سڑک کا بیٹا) کہنے سے سڑک کی جورُو کا وجُود بھی ضرُوری ہے۔ چُونکہ مُسافر کو سڑک کے ساتھ خاص تعلق اور مناسبت ہوتی ہے، اِس لئے عربی محاورہ میں مجازی طور پر اُس کو ابن السّبیل کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ سڑک کی بھی کوئی جورُو ہے جس سے مسافر پیدا ہوتا ہے۔ اِسی طرح مسیح کو خُدا کا بیٹا کہنے میں خُدا کی جورُو کا وجُود ضرُوری نہیں۔ پھر یہ مسلّمات سے ہے کہ خُدا اور اِنسان کی صفات میں بجز مشارکت لفظی کے اور کوئی حقیقی اشتراک نہیں ہے۔ مثلاً خُدا سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ عقیل ہے۔ مُرید ہے۔ بادشاہ ہے۔ اور اِنسان بھی سامع۔ باصر۔

عاقل، صاحبِ ارادہ اور بادشاہ ہے۔ انسان کانوں سے سُنتا، آنکھوں سے دیکھتا، دماغ سے سوچتا، دل میں ارادہ کرتا اور تخت پر بیٹھ کر عدالت کرتا ہے۔ تو کیا خُدا بھی انسان کی سی کان، آنکھ، دماغ، دل اور جسم رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ خُدا کا سُننا، دیکھنا، سوچنا، ارادہ کرنا اور عدالت کرنا انسان سے بالکل مختلف ہے۔ اور انسان کے ساتھ وہ ان امور میں محض مشارکتِ لفظی رکھتا ہے۔ اِسی طرح "خُدا کا بیٹا" ہونے اور "اِنسان کا بیٹا" ہونے میں بہت فرق ہے۔ انسان کا بیٹا بغیر جورو کے نہیں ہو سکتا جس طرح بغیر آنکھوں کے انسان نہیں دیکھ سکتا "خُدا کا بیٹا" بغیر جورو کے ہو سکتا ہے۔ جیسے وہ بغیر اعضاء کے یہ سارے کام کرتا ہے۔

دراصل خُدا مصدر ہونے کے لحاظ سے باپ ہے۔ اور بیٹا صادر ہونے کے لحاظ سے بیٹا ہے۔ خُداوند مسیح کا قول ملاحظہ ہو "میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں۔" (یُوحنا ۱۶: ۲۸ و ۸: ۴۲) اور ابنُ اللہ مخلوق نہیں بلکہ مولود ہے۔ "وہ اندیکھے خُدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔" (کلسی ۱: ۱۵) اگر وہ محض ابنِ آدم ہی ہوتا تو لازم تھا کہ قانونِ ارثی کے مطابق اُس میں دُنیوی والدین کی سی عادات وخصائل پائی جاتیں۔ لیکن ہم خوب دکھا چکے کہ اُس کی زندگی بھر کے تمام افعال واقوال اور عادات وخصائل الہٰی زندگی، الہٰی خصلت اور الہٰی صفات کے عین مشابہ تھے۔ اِسی لئے وہ جبرائیل کی گواہی کے مطابق خُدا کا بیٹا تھا۔ "اِس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خُدا کا بیٹا کہلائے گا۔" (لُوقا ۱: ۳۵)۔

یُوحنا اصطباغی کی گواہی۔ "چُنانچہ میں نے دیکھا اور گواہی دی ہے کہ یہ خُدا کا بیٹا ہے۔" (یُوحنا ۱: ۳۴)

یُوحنا رسُول کی گواہی۔ "یسُوع ہی خُدا کا بیٹا مسیح ہے۔" (یُوحنا ۲۰: ۳۱)

نتن ایل کی گواہی۔ "اے ربی تو خُدا کا بیٹا۔ تُو اسرائیل کا بادشاہ ہے"۔ (یُوحنا ۱: ۴۹)
شاگردوں کی گواہی "انہوں نے اُسے سجدہ کر کے کہا۔ یقیناً تُو خُدا کا بیٹا ہے"۔
(متی ۱۴: ۳۳)

پطرس کی گواہی۔ "تُو زندہ خُدا کا بیٹا مسیح ہے"۔ (متی ۱۶: ۱۶)
رُومی صُوبہ دار کی گواہی۔ "یہ آدمی بے شک خُدا کا بیٹا تھا"۔ (مرقس ۱۵: ۳۹)
پولُوس رسُول کی گواہی "اور فوراً عبادت خانوں میں یسُوع کی مُنادی کرنے لگا کہ وُہ خُدا کا بیٹا ہے"۔ (اعمال ۹: ۲۰)
شیاطین کی گواہی۔ "اے یسُوع خُدا تعالیٰ کے بیٹے"۔ (مرقس ۵: ۷ و متی ۸: ۲۹ و لُوقا ۸: ۲۸)

مسیح کا اپنا اقرار۔ "میں خُدا کا بیٹا ہوں"۔ (یُوحنا ۱۰: ۳۶)۔
خُدا کی گواہی۔ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے مَیں خوش ہوں"۔ (متی ۱۷: ۵)

پس خُدا و مسیح ابن اللہ کی ابنیت کو جسمانی و انسانی طور پر قیاس کرنا کفر اور جہالت ہے۔ اگرچہ مسیحی ایماندار لوگ جنہوں نے نئی پیدائش حاصل کی ہو خُدا کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ مگر مجازی معنی میں۔ اور مجاز حقیقت کی فرع ہے۔ اِس جہت اگر خُدا کا کوئی حقیقی بیٹا نہ ہو تو مجازی کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقی بیٹا مسیح ہے جس کو اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔ اور الفاظ "اکلوتا بیٹا" ہی سے بخوبی ثابت ہے کہ جس معنی میں مسیح خُدا کا بیٹا ہے اُس معنی میں اور کوئی شریک نہیں۔ (یُوحنا ۱: ۱۴: ۱۸ و ۳: ۱۶) اور ایماندار لوگ تو مسیح پر ایمان لا کر اُس کی معرفت خُدا کے بیٹے کہلا سکتے ہیں۔ "لیکن جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا"۔ (یُوحنا ۱: ۱۲) اور مسیح کی معرفت ایماندار خُدا کے "لے پالک ہوکر پالے ہوئے فرزند بن جاتے ہیں نہ کہ حقیقی"۔ (گلتی ۴: ۵) اب

"جو کوئی بیٹے کا انکار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی نہیں۔ اور جو بیٹے کا اقرار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی ہے" (۱۔یُوحنّا ۲: ۲۳) "جو بیٹے پر ایمان لاتا ہے ہمیشہ کی زندگی اُس کی ہے۔ لیکن جو بیٹے کی نہیں مانتا زندگی کو نہ دیکھے گا۔ بلکہ اُس پر خُدا کا غضب رہتا ہے" (یُوحنّا ۳: ۳۶) یہ ہیں ابن اللہ کے صحیح معنی جو مسیحی لوگ مانتے ہیں۔ اور جو بد طینت لوگ خواہ مخواہ کی بھونڈی اور کفر آمیز تاویلیں اس مبارک مسئلہ کی کر کر کے اپنی اوچھی ذہنیت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ دراصل وُہ تُو ریکے منکر ہونے کے باعث ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ "نُور دُنیا میں آیا ہے۔ اور آدمیوں نے تاریکی کو نُور سے زیادہ پسند کیا۔ اس لئے کہ اُن کے کام بُرے تھے۔ کیونکہ جو کوئی بدی کرتا ہے وُہ نُور سے دُشمنی رکھتا ہے۔ اور نُور کے پاس نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو کہ اُس کے کاموں پر ملامت کی جائے" (یُوحنّا ۳: ۱۹۔ ۲۰)

مسیح اِنسان اَور خُدا کا برزخ کامل[1]۔

خُدائے واجب الوجود اور لامحدود و محیطِ کُل کا ممکنات و محدثات اور محدودات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا جب تک ایک واسطہ فی مابین الواجب و ممکن نہ ہو۔ اور واسطہ بھی وُہی ہو سکتا ہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہو کر ربط حادث بالقدیم قائم کرنے کی صلاحیت رکھے۔ اِس مسئلہ کے متعلق کہ آیا واجب و ممکن میں واسطہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تین فریق ہیں۔ اور سب کے خیالات میں اختلاف ہے۔

(۱) وحدۃ الوجود کے قائلین کے نزدیک تو واسطہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ وُہ دُوئی کے مطلق قائل نہیں۔ چُنانچہ جب دُوئی نہ ہُوئی تو واسطہ کی ضرورت نہ

---

[1] اس عقلی فلسفہ کے لئے ہم علامہ ایس۔ ایم پال صاحب کی تصنیف "اِنسان کامل یا مظہرِ خُدا" کے زیرِ احسان ہیں۔ اور اس کو نقل کرنے میں بعض جگہ معمولی سی لفظی تبدیلی اختصار کے لئے کی ہے۔ پُورا بیان اُن کی مذکورہ تصنیف میں ملیگا۔ (مُصنّف)

رہی۔

(۲) وُہ لوگ ہیں جو واسطہ کو تو ضروری مانتے ہیں۔ مگر اُن کا ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔ جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا۔ اور وُہ واسطہ کی تین صورتیں ملتے ہیں:۔

اوّل۔ واسطہ فی العرُوض۔ کسی صفت کے ساتھ حقیقتاً و بالذات واسطہ ہی مُتّصف ہو، اور ذی واسطہ میں وُہ صفت مُطلقاً نہ ہو۔ مگر چونکہ واسطہ و ذی واسطہ میں ایک طرح کا تعلق و تلبّس ہے، اِس بنا پر ذی واسطہ کی طرف بھی اُس صفت کی نسبت کر سکتے ہیں۔ مثلاً ریل گاڑی کے بیٹھنے والے حقیقت میں متحرک نہیں ہیں۔ بلکہ ریل گاڑی متحرک ہے۔ لیکن ایک خاص مناسبت کے لحاظ سے ہم ریل گاڑی کے بیٹھنے والوں کو بھی متحرک کہہ سکتے ہیں۔

دوم۔ واسطہ فی الاثبات۔ کوئی صفت ذی واسطہ میں موجُود ہو اور واسطہ میں اصلاً موجُود نہ ہو۔ بلکہ ذی واسطہ کے موصُوف کر دینے میں مفید محض ہو۔ مثلاً رنگریز واسطہ ہے۔ لیکن صفت رنگینی ذی واسطہ یعنی کپڑے میں پائی جاتی ہے۔ لیکن خود رنگریز میں یہ صفت موجُود نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وُہ خُود اپنے آپ کو کلاً یا جزءاً رنگین کر دے۔ مطلب یہ کہ جو صفت مُستقل طور سے ذی واسطہ یعنی کپڑے میں موجُود ہے وُہ بعینہٖ واسطہ یعنی رنگریز میں موجُود نہیں ہے۔

سوم۔ واسطہ فی الثبُوت۔ وُہ صفت واسطہ و ذی واسطہ دونوں میں حقیقتاً موجُود ہو۔ لیکن واسطہ میں بطورِ علّت اور ذی واسطہ میں بطور معلُول ہو۔ مثلاً لکھتے وقت قلم کی حرکت ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔

پس ہاتھ حرکت میں واسطہ اور قلم ذی واسطہ ہے۔ حرکت دونوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن ہاتھ کی حرکت علت اور قلم کی حرکت معلول ہے۔
وسائطِ ثلاثہ کی تشریح و تفصیل سے خوب روشن ہے کہ خدا کا واسطہ ہونا عالم کی ذات و صفات میں بمعنے فی العروض و فی الثبوت ممکن نہیں۔ اس لئے کہ واسطہ فی العروض سے لازم آتا ہے کہ جتنی صفات مخلوقات میں ہیں حقیقۃً خدا ہی کی صفات ہیں۔ اور مخلوقات کی طرف اُن کی نسبت محض مجازی ہے۔ اس کے ماننے میں یہ قباحت ہے، کہ مخلوقات میں اکثر صفاتِ ذمیمہ اور اوصاف دنیہ ایسی ہیں جن کی نسبت خدا کی ذات کی طرف کرنا سراسر کفر و گستاخی ہے۔
واسطہ فی الثبوت ہونا اس لئے غلط ہے کہ اوّل تو اس میں وہی قباحت باقی رہ جاتی ہے جس کی تردید ابھی کی جا چکی ہے۔ دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے، کہ چونکہ معلول کا تخلف علت سے محال ہے، اس لئے مخلوقات کی صفات قدیم ماننی پڑیں گی، اور یہ عقلی و نقلی طور پر باطل ہے۔ پس واسطہ فی الاثبات میں کسی قدر گنجائش ہے، یعنی کہ باری تعالیٰ جو صفات اپنی مخلوقات کو دیتا ہے خود اُن صفات سے مبرّہ ہے۔ اور خالق و مخلوق کی صفات میں بجز مشارکت لفظی کے اور کوئی مناسبت و مشابہت نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا واسطہ صرف خالق کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ جیسے مصنوع اپنے صانع اور مکتوب اپنے کاتب پر دلالت کرتا ہے، اس قسم کے واسطہ کو مظہر ناقص کہتے ہیں۔ اور یہ اس لئے مُفید مطلب نہیں کہ یہ ہم پہلے ہی مانتے ہیں۔ واسطہ تو ایسا چاہیئے جو حادث و قدیم اور ممکن و واجب دونوں کو ملائے۔

(۳) وہ فریق ہے۔ جو واجب اور ممکن کے درمیان ایک ایسے واسطہ کے قائل ہیں جس میں وجوب اور امکان دونوں صفتیں موجود ہوں۔ تاکہ

رابطہ حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ اور اس واسطہ کو وہ انسانِ کامل اور
مظہرِ جامع اور برزخِ کبریٰ کہتے ہیں۔

لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ "انسانِ کامل" مخلوق اور حادث ہے۔ اور واجب
و ممکن کے درمیان برزخ وہ ہو سکتا ہے جو وجوب و امکان ہر دو طرف کی
صفات سے متصف ہو۔ چنانچہ حکماء متفلسفین اور ماہرین طبعیات دورِ
حاضرہ نے تجربات کی بنا پر موجودات کے ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے ساتھ
رابطہ دینے کے لئے برزخ کے وجود کو لابدی قرار دیا ہے۔ مثلاً:۔

(۱) طبقۂ جمادات و نباتات کا برزخ مرجان (مونگا) کو مانا ہے۔ مونگا پتھر
ہونے کے لحاظ سے جمادی خاصیت رکھتا ہے۔ اور قوتِ نامیہ
رکھنے کے باعث نباتی خاصیت بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا جمادی و نباتی
خصوصیات کا اس میں اجتماع ہے۔ اس لئے وہی ان ہر دو طبقات کا
برزخ ہے۔

(۲) عالم نباتات میں بعض مغربی ممالک میں ایک گوشت خور درخت دریافت
ہوا ہے جو حیوانوں اور پرندوں کا گوشت ایسے ہی کھاتا ہے، جیسے
شکاری درندے۔ گوشت کھانا درندوں کی خاصیت ہے۔ پس یہ درخت
طبقۂ نباتات و حیوانات ہر دو کی خصائص رکھتا ہے۔ اس لئے یہی
ان ہر دو طبقات کا برزخ ہے۔

(۳) طبقۂ حیوانات اور طبقۂ انسانی کا برزخ بندر مانا گیا ہے۔ اس جانور
میں بعض ایسی صفات پائی جاتی ہیں جن کو خواہ مخواہ خصائص فوق
الحیوانات کہنا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی معمولی حیوانی خصوصیات
دیگر تمام حیوانات سے ملتی ہیں۔ اور دوسری طرف اس کی خاص اعلےٰ

صفات انسانی طبقہ کی ادنیٰ خاصیتوں کے مشابہ ہیں۔ اس لئے حیوانات و انسان کا برزخ بندر ہے۔ اس کی دو طرفہ مشابہت کو دیکھ کر ہی ڈاروِن صاحب نے بندر سے انسان کا ہونا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(۴) اب طبقاتِ انسانی و الٰہی کے درمیان "انسان کامل" کو برزخ مانا جاتا ہے ؛ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ انسان کامل کا وجوب و قدامت سے کوئی تعلق نہیں وہ محض ممکن اور حادث ہے۔ وہ اگرچہ بدرجہ انتہا کمالیت کو حاصل کرلے تو بھی وہ مخلوق اور حادث ہی رہے گا۔ اس صورت وہ گڑھا جو حدوث و قدامت اور وجوب و امکان کے درمیان حائل ہے کس طرح بھرا جا سکتا ہے؟ چنانچہ انسان و خدا کا برزخ وہی ہو سکتا ہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہو کر ربط حادث بالقدیم قائم کرنے کی کامل و اکمل صلاحیت رکھے۔ یعنی وہ کامل انسان اور کامل خدا ہو۔ پس کلمۃ اللہ جو تکوینِ کائنات کی علت ہے۔ اور بحیثیت تخلیق خدا اور کائنات کا درمیانی ہے، وہی جسم دھار کر انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ تاکہ وہ خدا کامل ہونے کے ساتھ انسان کامل بھی ہو سکے اور برزخیت کے فرض کو بطریق احسن انجام دے سکے۔ چنانچہ خداوند مسیح کے سوا اور کوئی انسان و خدا کا برزخ نہیں ہو سکتا۔

"کیونکہ خدا ایک ہے۔ اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع جو انسان ہے" (۱۔تمتھیس ۲: ۵)

بالفرض محال اگر انسان کامل بھی برزخ ہو سکتا ہے، تو پھر بھی خداوند مسیح کے سوا کسی انسان کامل کا وجود نابود ہے۔ جیسا ہم پیشتر نشأۃ ثلاثہ میں

علامہ جامی کا نظریہ دربارہ انسانِ کامل پیش کر کے ثابت کر چکے ہیں۔ اُس معیار کے مطابق سوائے مسیح کے کسی اَور کو انسانِ کامل ثابت کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ پس انجیل کا دعویٰ ہے کہ خُداوند مسیح کامل انسان اَور کامل خُدا ہیں، اَور خُدا اَور دُنیا کے حقیقی درمیانی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "راہ حق اَور زندگی میں ہُوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا"۔ (یُوحنّا ۱۴:۶)۔

یہ ایک کُھلی اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک کسی شخص کے ساتھ واقفیت نہ ہو، اُس سے مُحبّت کرنا ناممکن ہے۔ واقفیت اَور محبّت دونوں لازم و ملزُوم ہیں۔ ایک کے بغیر دُوسری کا وجُود محال ہے۔ جہاں واقفیت ہوگی وہاں مُحبّت ہو سکے گی اَور جہاں مُحبّت ہوگی وہاں ضرُور پہلے ہی سے واقفیت ہوگی۔ دُنیا میں سینکڑوں ایسے شہر ہیں جن کے مَیں نام سے بھی واقف نہیں ہُوں۔ اَور نہ اُن کے باشندوں کو جانتا ہُوں۔ اِس لئے مَیں اُن سے محبّت نہیں کر سکتا، جب تک کوئی شخص میرا جان پہچان نہ ہو۔ رُوشناس نہ ہو۔ میری اَور اُس کی کبھی مُلاقات ہی نہ ہوئی ہو، تو بھلا اُس صُورت میں اُس سے محبّت کر سکتا ہُوں؟ پس اِسی طرح اگر ہم خُدا سے واقف نہیں اَور اُس کو جانتے نہیں، تو اُس کی عبادت جو مُحبّت پر مبنی ہے کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو ایک "نامعلُوم خُدا" کی۔ اَور ایسی عبادت کسی حقیقت کی نہ ہوگی بلکہ وہم کی۔ ناواقف ہستی کی۔ نامعلُوم خیالی خُدا کی۔ پس خُدا سے مُحبّت کرنے اَور اُس کی عبادت کرنے کے لئے اُس سے واقفیت پیدا کرنا ضرُوری ہے۔ اَور اُس سے واقفیت نہ تو محض مشاہدۂ فِطرۃ سے ہو سکتی ہے، نہ عقلی دلائل اُس نادیدہ و پردہ نشین ہستی سے ہمارا تعارف کروا سکتی ہیں اَور نہ ہی الہام کے لفظی و تمثیلی بیانات اُس کا یقینی علم ہمیں حاصل کروا سکتے

میں اُس سے واقفیت حاصل کرنے اُس کی ماہیت اور صفات کا صحیح تصوّر کرنے کے لئے مظہرِ خُدا کی ضرورت ہے۔ اور بغیر مظہر کے خُدا کا صحیح اور یقینی تصوّر ہی محال ہے۔ اور وہ مظہر جیسا ہم پہلے یقینی دلائل سے ثابت کرچکے خُداوند مسیح ہے۔ جس نے فرمایا "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا"۔ پس جو کوئی خُداوند مسیح (مظہرِ خُدا) میں ہو کر خُدا کی عبادت کرتا ہے وہ یقیناً ایک "معلوم" اور "واقف" خُدا کی عبادت کرتا ہے۔

اب شاید کوئی یہ سوال کرے کہ خُداوند مسیح اگر نادیدہ خُدا کی ظاہری صورت ہے جس کو دیکھ کر ہم خُدا سے رُوشناس ہو سکتے ہیں، اور ہماری خُدا بینی کی خواہش کا جواب مل سکتا ہے۔ تو اب ہم لوگوں سے مسیح بھی نادیدہ ہے۔ وہ ظاہری مادّی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ دو ہزار برس قبل جب وہ مجسّم صورت میں موجود تھا اُس وقت لوگ اُس میں خُدا کو دیکھ سکتے تھے۔ مگر اِس زمانہ کے لوگوں کے لئے خُدا پھر "نامعلوم" ہے۔ اِس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل اُمور قابلِ غور ہیں:-

(۱) خرق العادت اُمور میں استمرار و دوام جائز نہیں۔ ورنہ وہ اپنے اعلےٰ مقاصد میں ناکام رہیں گے۔ اور فطرت کے عام معمولی واقعات میں شامل ہو کر خرق العادت نہ رہیں گے۔ اور لوگوں کو اُن سے حیرت و استعجاب بھی نہ ہوگا۔ مثلاً سُورج کا وجود اگرچہ سرمایۂ عجائب و نوادر ہے، لیکن چونکہ ہم اُسے روز دیکھتے ہیں، اِس لئے نہ تو اُس کے طلوع و غروب سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں، اور نہ ہی اُس سے حیران ہوتے ہیں۔ مظہرِ خُدا (مسیح) کا زینت افزائے کاشانۂ گیتی ہونا سب سے بڑا نادر اور خرق العادت واقعہ تھا۔ اگر وہ ہمیشہ ظاہری و بدنی صورت

میں قائم رہتا تو لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہ ہوتا۔ دُنیا نے آگے ہی اُس کی کیا قدر کی کہ وُہ اور اِس دُنیا میں رہتا۔ خُدا اپنے بیٹے کو ہمیشہ جسمانی صُورت میں اِس خرابستان میں رکھ کر اپنی بے قدری اور تحقیر گوارا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ "وُہ غیور خُدا ہے"۔

(۲) خلقت اور خُدا کے درمیان بہت سے واقعات کا ظہور اُس کے صعُود فرمانے کے ساتھ وابستہ اور مشروط ہے۔ اِس لئے اگر وُہ اِس مرئی عالم کو چھوڑ کر صعُود نہ فرماتا تو وُہ واقعات ظہور میں نہ آتے۔ علاوہ ازیں عہدِ عتیق و جدید میں اُس کے دوبارہ اِس دُنیا میں آنے کے متعلق پیشین گوئیاں موجود ہیں اُن کا پُورا ہونا بھی ضروری تھا۔

(۳) انجیلِ مُقدّس اُس کا مکمل فوٹو ہے۔ اُس کے مطالعہ سے اُس کا دیدار حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۴) خُدا کا مظہر مسیح اور مسیح کا مظہر اُس کی کلیسیا ہے۔ تا دیدن مسیح کی باطنی صُورت کیسی ہے۔

لیکن موجودہ کلیسیا مسیح کی ناقص حیثیت ہے۔ اِس لئے وُہ اُس کے نُورانی خدوخال کو زیادہ صفائی کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتی یعنی پُورے طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے مسیح کو دیکھا"۔ دُھندلے آئینے میں شکل صاف نظر نہیں آیا کرتی۔ اِسی طرح کلیسیا جو مسیح کا آئینہ ہے فی الحال بہت سی جسمانی آلائشوں اور نفسانی آلودگیوں کے باعث دُھندلے آئینہ کی طرح مسیح کی کامل مظہر نہیں ہے "اب ہم کو آئینے میں دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے"۔ اور جب کلیسیا اُس جلالی صُورت پر درجہ بدرجہ بدلتی اور ترقی کرتی جائے گی۔ تو ایک دن اُس کے چہرے سے مسیح کا جلال ایسے

مُنعکس ہوگا جیسے صاف آئینے میں۔ (۲۔کرنتھی ۳: ۱۸) ایک مُصوّر ایک تصویر کو جو قیمتی نکتۂ نگاہ سے نہایت اعلیٰ ہے سامنے رکھ کر اُس کی نقل ایک دُوسرے کاغذ پر بناتا ہے۔ اُس کا خاکہ کھینچتا ہے۔ گاہے مٹاتا اور گاہے پھر بناتا ہے۔ اگر اُس کی اُس نامکمّل تصویر کو دیکھ کر کوئی کہے، کہ یہ تصویر اچھی نہیں، بہُت بھدّی ہے، تو اس سے اصل تصویر کا نقص ثابت نہ ہوگا۔ اور عقلمند آدمی فوراً سوچ لے گا کہ یہ نقل ابھی نامکمّل ہے۔ کسی وقت یہ ہُوبہُو اصل کے مطابق بن جائے گی۔ اِسی طرح کلیسیا کا اصل نمُونہ مسیح ہے، جس کے سانچے میں وُہ ابھی ڈھل رہی ہے۔ اور تاحال ناقص حالت میں ہے۔ "لیکن جب کامل آئیگا تو ناقص جاتا رہیگا"۔ (۱۔کرنتھی ۱۳: ۱۰) پس کلیسیا مسیح کا مظہر ہے، اور درجہ بدرجہ اُس کی ہم شکل بن رہی ہے۔

خُداوند مسیح کی آمد نے خُدا کے وجُود باجُود کے متعلق پیدا شُدہ تمام توہمات فاسدہ اور ظنون باطلہ کو تارِ عنکبوت کی طرح تار تار کر کے رکھ دیا۔ اگر کوئی گوشۂ تنہائی میں یکسوئی قلب کے ساتھ بیٹھ کر اپنی فرصت کی قیمتی گھڑیوں میں اِس تعلیم سعادت تنظیم پر صفا باطنی اور منصف مزاجی سے غور و خوض کرے تو وُہ بغیر ضمیر سے جنگ کئے خُداوند مسیح کو مظہرِ خُدا اور برترِ کبریٰ تسلیم کرنے پر مجبُور ہو جائے گا۔ اِس طریق پہ ثواب اور مسئلہ لاجواب کو سمجھنے کے لئے دیدۂ بینا اور ذہنِ رسا چاہیئے۔ چُونکہ تعصب اور مسئلہ تجسّم باہم ضدین ہیں، اِس لئے ایک ہی وقت میں یہ دونوں اِکٹھے نہیں رہ سکتے۔ پس غرض ہے کہ تعصب کو چھوڑ کر اس پہ غور فرمایئے اور یُونہی کسی نااہل شخصیت کو کُرسئی برزخیت پر زبردستی بٹھانے کی سعی نہ فرمایئے۔

کلام مجسّم کی تین صُورتیں

کلام مجسّم کی تین صُورتیں ہیں۔ اور انہیں کو ہم نے اِس کتاب کے گویا اعضائے رئیسہ ٹھہرا کر اب تک بحث کی ہے۔ اب اِن کو اجمالی طور پر معرضِ تحریر میں لانا مُناسب اور گویا کتاب کے منتہائے مقصود کو خلاصۃً بیان کرنا ہوگا۔ وُہ تین صُورتیں یہ ہیں:۔

(۱) کائنات کلام مجسّم ہے۔ خُدا نے کہا اور وُہ موجُود ہو گئی۔ یعنی جو کلام اُس کے مُنہ سے صادر ہُوا اُس نے کائنات کی صُورت میں جسم اختیار کر لیا۔ اس کا مُفصّل بیان "عقل اور مذہب" کے زیرِ عنوان کیا جا چُکا ہے۔ اور "تجسّمِ الہٰی" کے بیان میں چھوٹی سُرخی "موجودات اور خُدا کا علم" کے ماتحت اجمالی طور پر اس پر بحث کی جا چُکی ہے۔

(۲) بائبل مُقدّس کلام مجسّم ہے۔ کلام نفسی جو ذاتِ الہٰی میں مخفی تھا کلام لفظی کی صُورت میں ظاہر ہو کر کتابی شکل میں مرتّب ہُوا۔ اِس کو الہام کہتے ہیں۔ "الہام کی ضرورت" کے زیرِ عنوان اِس کو بالتفصیل بیان کیا گیا۔ اور "تجسّمِ الہٰی" کے بیان میں چھوٹی سُرخی "الہام اور خُدا کا علم" کے ماتحت اجمالی طور پر اِس پر بحث ہو چُکی ہے۔

(۳) کلام مجسّم کے تیسرے معنے ہیں کہ ذاتِ الہٰی کے اقنومِ ثانی نے جسم اختیار کیا جس کو مظہرِ خُدا کہا جاتا ہے۔ یہ کلام مجسّم کی اِنتہائی کمالیّت ہے جس سے خُدا کی ذات و صفات کا ثبُوتی تصوّر اور یقینی علم حاصِل ہوتا ہے۔ چُنانچہ "تجسّمِ الہٰی" کے زیرِ عنوان اِس پر مفصّل بحث کی گئی ہے۔

تجسّم کے فوائد

(۱) خُدا کی ذات و صِفات کا یقینی اور صحیح علم حاصِل ہوتا ہے۔ اور وُہ ایک "معلُوم خُدا" ثابت ہوتا ہے۔

(۲) اِنسان فطرتی طور پر پیکرِ محسُوس کا خوگر ہے۔ اِس لئے اُس کی خُدا بینی کا

جواب مظہر دیتا ہے۔

(۳) جنسی مغایرت محبت کی مانع ہے۔ خدا اور انسان میں جنسی مغایرت مسلّم ہے۔ تجسّم کے ذریعے یہ دِقّت دُور ہوتی اور انسان صحیح معنوں میں خدا سے محبت کر سکتا ہے۔

(۴) تجسّم کے ذریعہ ذاتِ الٰہی کے اقانیم ثلاثہ کا سربستہ راز کھلتا ہے، جو بصُورتِ دیگر محال ہوتا۔

(۵) تجسّم کے ذریعہ انسان کی نجات کا انتظام ہوتا ہے۔ چونکہ بہ تقاضائے عدلِ الٰہی انسان کی جان کے عوض میں ایک عوضی قربانی کی ضرورت تھی، تاکہ انسان کی جان موت سے رہائی پائے۔ اور قربانی کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ پس اقنوم ثانی جسم میں ظاہر ہو، تاکہ انسان کی جان کا مبادلہ ٹھہرے۔

(۶) خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا تھا، لیکن انسان نے گناہ کی کالک سے وہ الوہیت نما صورت بگاڑ لی، اور ضرور ہے کہ وہ دوبارہ خدا کی صورت پر بنے۔ مگر جس کی صورت پر اُس کو بننا چاہیئے وہ نادیدہ ہے۔ اس لئے نادیدہ کی صورت پر کیسے بنے؟ ضرور ہے کہ الٰہی صورت کا کوئی ظاہری و دیدنی نمونہ اُس کے سامنے ہو۔ پس وہ نمونہ مظہرِ خدا (مسیح) میں ملتا ہے۔ اُس کی صورت پر بننا ہی خدا کی صورت پر بحال ہونا ہے۔

(۷) خدا لائے واجب الوجود اور انسان ممکن الوجود و محدود کے درمیان حدِ فاصل ہے، جو دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا رکھتی ہے۔ ان دونوں کے ملاپ کے لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ اور واسطہ وہی ہو سکتا ہے جو بوجہے حادث اور بوجہے قدیم ہو۔ تاکہ ربط حادث با قدیم قائم کر سکے۔ پس یہ مشکل بھی تجسّم کے ذریعے دُور ہوتی ہے۔ اور انسان

کا اُس کے ذریعے سے خُدا سے مِلاپ ہو جاتا ہے۔

(۸) تجسّم کے ذریعے اِنسان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ مظہر کے ایک معنی ہیں "اِنسانیت نما اُلوہیت" جس نے ایمانداروں کو "اُلوہیت نما اِنسان" بنا دیا۔ وُہ اِنسانوں کے مشابہ ہو گیا، جس سے ایماندار اِنسان خُدا کے مشابہ ہو گئے۔

اب دُنیا کی عقلیں گُناہ کی شِدّت سے اِس قدر فاسد اور تاریک ہو گئی ہیں کہ وُہ کسی صُورت اِس تعلیم سعادت تنظیم کو تسلیم نہیں کرتیں۔ اگر خُدا نادیدہ و پوشیدہ اور فوق الفہم و ادراک رہے تو لوگ اُس کو کسی دیدنی و ظاہری اور مُمکن الفہم صُورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وُہ کسی صُورت ظاہری میں ظاہر نہ ہو تو اُس کی ہستی کے متعلّق شکوک میں پڑ کر آخر اُس سے مُنکر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وُہ کسی دیدنی صُورت میں تجسّم اختیار کر کے مرئی و مجسّم اور مُمکن الفہم ہو جائے اور اُن کی خُدا بینی کی فطری خواہش کا جواب دے تو لوگ اُس کو محض ایک خُدا رسیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کر اُس کی اُلوہیت و خُدائی کا یکسر اِنکار کرتے ہیں۔ اب بتائیے اِن دو صُورتوں کے علاوہ اور کون سی تیسری صُورت مُمکن ہے جس سے خُدا اِنسان کی خُدا بینی کی خواہش کو پُورا کرے؟

"مَیں نے تیری خبر کان سے سُنی تھی۔ پر اب میری آنکھ تجھے دیکھتی ہے۔"

(ایُّوب ۴۲: ۵)

گناہ

ہر گناہ زنگیست بر مرآتِ دل ✧ دل شود زیں زنگہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی ✧ نفسِ دوں را بیش گردد خیرگی

آغازِ گناہ

تمام مذاہبِ عالم اور ادیانِ دیگر کسی نہ کسی صورت میں گناہ کے وجود کے قائل ہیں۔ اگرچہ گناہ کے آغاز کے متعلق سب کے خیالات اور آراء میں اتفاقِ کلی نہیں، بلکہ بعض خیالات اور فلسفے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ تاہم یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ گناہ دنیا میں ضرور موجود ہے۔ بعض اس کو اگیان، اودیا اور بھرم مانتے ہیں۔ بعض آدم کو عیبِ انسانی کا خاصہ ذاتی مانتے ہیں اور خدا کو نیکی و بدی ہر دو کا موجد تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ گناہ کا وجود مسلّم الثبوت ہے۔ اور کوئی صاحبِ بصیرت اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور بدی و نیکی ایسی دو متضاد اشیاء ہیں جن میں آخر کبھی اتحاد و مطابقت نہیں ہو سکتی۔ کافۂ انام پر کوئی ایسی زبان اور لغت یا کتاب نہیں، جس میں گناہ کے وجود کے ثبوت میں الفاظ "چاہیئے" "نہ چاہیئے" "واجب" "ناواجب" "جائز" "ناجائز" "روا" "ناروا" "مناسب" "نامناسب" "اچھا" اور "برا" وغیرہ نہ پائے جاتے ہوں۔ اور آج تک کوئی ایسی سوسائٹی معرضِ ظہور میں نہیں آئی جس نے ان الفاظ کے مفہوم کو وہم سے تعبیر کر کے ان کے زور کو کھو دیا ہو۔ ہر فردِ بشر اپنے وجدانیات میں امرِ حقیقتِ نفس الامری کو بخوبی محسوس کرتا اور ان کی تشخیص گواہی رکھتا ہے۔ ضعیف سے ضعیف ضمیر بھی جائز و ناجائز اور واجب و ناواجب کی کیفیت سے آگاہ

ہے۔ گناہ ایک ایسی حقیقت ہے جو گویا جبری طور پر انسان کو اپنے وجود کا قائل بناتی ہے۔ زبان سے کوئی اِس کا اِنکار کرے تو کرے لیکن دِل سے کوئی اِنکار نہیں کرسکتا۔ اب جس طرح یہ صحیح ہے کہ گناہ کے آغاز کے متعلق تمام مروجہ عقائد اور فلسفے باہمدگر متضاد و متبائن ہیں۔ اُسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ایک ہی وقت میں ہم اُن سب کو صحیح و درست نہیں سمجھ سکتے۔ اب اِس جگہ ہم تمام دیگر خیالات و نظریات کو چھوڑ کر صرف بائبل مُقدّس کی روشنی میں آغازِ گناہ کے خیال کو بدلائلِ عقلیہ اور براہینِ نقلیہ پیش کریں گے۔ جس سے گناہ کی پوری حقیقت ناظرین پر کھُل جائے گی۔

بائبل مُقدّس کا بیان ہے کہ خُدا تعالےٰ پاک و قدّوس ہے "بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو۔ کیونکہ میں جو خُداوند تمہارا خُدا ہُوں پاک ہُوں۔" (احبار ۱۹: ۲) "اور ایک (فرشتے) نے دُوسرے کو پکارا اور کہا قدّوس۔ قدّوس قدّوس ربّ الافواج ہے۔ ساری زمین اُس کے جلال سے معمُور ہے۔" (یسعیاہ ۶: ۳ و مکاشفہ ۴: ۸ و ۱۵: ۴) "خُداوند کا شکر کرو اِس لئے کہ وہ نیک ہے" (تواریخ ۱۶: ۳۴) خُدائے قدّوس و برحق جو تمام مصنوعاتِ مرئیہ و غیر مرئیہ اور مخلوقاتِ سفلیہ و عُلویہ کی علّتِ فاعلی ہے وہ اپنی طبیعت و فطرت کے خلاف کسی شئے کو ناپاک نہیں پیدا کرسکتا۔ کیونکہ پاک طبیعت کی علّت سے ناپاک طبیعت کے معلُول کا صدُور عقلاً اور نقلاً محال ہے۔ جب وہ خود پاک ہے تو اُس نے مخلوقات کو بھی پاک ہی پیدا کیا۔ چُنانچہ بائبل مُقدّس کا بیان ہے کہ جب خُدا نے سب کچھ پیدا کیا تو کہا کہ "اچھا ہے۔" (پیدائش ۱: ۱۰: ۱۲ و ۱۸) اور انسان کی پیدائش کے متعلق بائبل کا بیان ہے۔ کہ "پھر خُدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صُورت پر اپنی شبیہہ کی مانند بنائیں۔" (پیدائش ۱: ۲۶) "اور خُدا نے انسان

کو اپنی صورت پر پیدا کیا" (آیت ۲۷)؛ "خدا نے انسان کو راست بنایا" (واعظ ۷: ۲۹) یعنی خدا نے انسان کو پاک، راست، صاحبِ ارادہ اور فاعلِ مختار بنایا۔ خدا کی صورت پر پیدا کئے جانے سے یہی مراد ہے۔ اور خدا نے انسان کو تمام مخلوقات پر خلیفہ اور سردار مقرر کیا۔ (پیدائش ۱: ۲۶ و زبور ۸: ۵-۸) اور خدا کی حکومت دیگر ادنیٰ مخلوقات کے علاوہ انسان و فرشتگان پر بھی تھی، اور ہے۔ اور انسان بطور نائب خدا کے تمام دنیا پر حکمران ٹھہرایا گیا۔ اور خدا نے خالق و حاکم ہونے کی حیثیت سے آدم کو چند اوامر و نواہی بھی دئے کیونکہ اُس میں اخلاقی وجود و فاعلِ مختار ہونے کے باعث خدا کی مرضی کے مطابق یا مخالف عمل کرنے کی قوت فطرتاً موجود تھی۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل اُس نے کھایا اور خدا کے فرمان کی نافرمانی کی۔ شجرِ ممنوعہ کے بیان کو تمثیلی سمجھئے یا اور کوئی اُس کی تاویل کیجئے۔ تاہم یہ ضرور ثابت ہے کہ خدا کا حکم آدم و حوا نے عدول کیا۔ اور وہ خدا کی حضوری سے خارج کئے گئے۔ پس گناہ مخلوق کا مخلوق ہے۔ خدا کا مخلوق آدم اور آدم کا مخلوق گناہ۔ جس طرح پوتا اپنے دادا کا مولود نہیں ہوتا، بلکہ اُس کے مولود کا مولود ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ کی ابتدا انسان سے ہوئی نہ کہ خدا سے۔ جب انسان کی طبیعت گناہ کے باعث بگڑ کر ناپاک و فاسد ہو گئی تو خدا کی پاکیزہ طبیعت کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہی۔ اس واسطے تضاد و تفاوتِ طبائع کے باعث خدا اور انسان میں جدائی ہو گئی۔ کیونکہ دو متضاد طبائع کا اجتماع و اتحاد ناممکن ہے۔ یعنی اجتماع ضدین محال ہے۔ یہ ہے آغاز گناہ کے متعلق بائبل کی معقول فلاسفی۔

ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ نافہمی سے یہ سوال کیا کرتے

ہیں کہ جبکہ خُدا علام الغیب اور ہمہ دان ہے، تو ضرور اُس کو آدم کے گنہگار ہونے کا اُس کی تخلیق سے پہلے ہی علم ہو گا۔ اور جب یہ علم تھا تو اُس نے دیدہ و دانستہ اُس کو گُناہ میں گرنے ہی کیوں دیا؟ اگر آدم گُناہ میں نہ گرتا تو آج دُنیا کو گُناہ اور اُس کے نتائج دُکھ و موت کے تلخ تجربے اُٹھانے نہ پڑتے۔ اِس سوال کے جواب میں اِس قدر عرض ہے کہ خُدا عالم الغیب ہے اور ساتھ ہی اُس کا علم لاتبدیل بھی ہے۔ خُدا کی صفتِ عالم الغیب کے متعلق بائبل کا بیان ملاحظہ ہو۔ "میں خُدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں۔ جو ابتدا ہی سے انجام کی خبر دیتا ہوں۔ اور ایام قدیم سے وہ باتیں جواب تک وقوع میں نہیں آئیں بتاتا ہوں"۔ یسعیاہ ۴۶: ۹-۱۰ و زبور ۱۳۹: ۱۵-۱۶) خُدا کو پورا علم تھا کہ آدم گُناہ میں گرے گا۔ اب اگر وہ گُناہ میں نہ گرتا تو خُدا کا علم تبدیل پذیر ثابت ہوتا۔ یعنی اُس کے علم کے مطابق واقع نہ ہوتا۔ خُدا قدیم سے جانتا تھا کہ آدم پیدا ہو گا۔ میری نافرمانی کریگا اور دُکھ اور موت کی سزا اُٹھائے گا۔ چونکہ خُدا کا علم لاتبدیل ہے اِس لئے عین اُسی طرح تمام واقعات معرضِ ظہور میں آئے نہ کہ اُس کے علمِ قدیم کے خلاف۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ خُدا کو علم تو تھا کہ آدم گُناہ میں گرے گا لیکن اُس کی مرضی یہ نہ تھی کہ آدم گنہگار ہو جائے۔ علم اور مرضی میں بہت فرق ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کو علم ہے کہ یہ مریض نصف گھنٹے کے بعد مر جائے گا۔ لیکن تو بھی اُس کی مرضی نہیں کہ وہ مر جائے۔ اگر اس پر یہ سوال بڑھایا جائے کہ خُدا کی مرضی کیوں پوری نہ ہوئی؟ تو اِس کا جواب ہر ایک کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دُنیا خُدا کی مرضی کو پورا نہیں کر رہی۔ گُناہ کا وجود خُدا کی مرضی کی مخالفت کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات

اِنسان کی کامل فعل مختاری پر دلالت کرتی ہے۔ مرضی خُدا کی ہے کہ گُناہ نہ ہو۔ اور اِس الہٰی مرضی کو پُورا کرنا یا نہ کرنا اِنسان فاعل مختار کے ہاتھ میں ہے۔ خواہ پُورا کرے یا نہ کرے۔ اور اِسی تناسب سے سزا و جزا بھی اُس کے لئے موجود ہے۔ اگر خُدا جبری طور پر اپنی مرضی منوائے تو اِنسان کی فعل مختاری کہاں رہے گی؟ اور نیکی و بدی اور جزا و سزا وغیرہ مُہمل و بے معنی الفاظ ہونگے اور نیکی و بدی ایسے مفہُوم ہوں گے جن کا کوئی مصداق نہ ہو۔ قسری افعال نیک یا بد نہیں ہُوا کرتے بلکہ اختیاری افعال نیک یا بد کہلا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کتابت میں نقائص ہیں تو یہ قلم کا قصُور نہیں۔ اور خُوش خطی میں قلم کی نیکی نہیں۔ کیونکہ قلم فاعِل مُضطر ہے۔ کتابت کی اچھائی یا بُرائی کا ذمہ دار ہاتھ ہے جو کہ متحرک بالارادہ اور فاعل مختار ہے۔ ہم ایک مثال سے واضح کریں گے کہ حضرت اَبُوالبشر نے اپنی آزاد مرضی و اِختیار سے خُدا کے حُکم کو ٹھکرا دیا۔ فرض کرو کہ ایک مالک اپنے نوکر کو کُچھ دام دیتا ہے، اور حُکم دیتا ہے کہ باغ میں جاکر میرے لئے آم خرید لاؤ۔ اور ساتھ ہی یہ تاکید کرتا ہے کہ اگر تُم خرید کر لاؤ گے تو ہم خُوش ہوں گے۔ اور اگر چوری کر کے لاؤ گے تو ہم ناراض ہونگے، اور تُمہیں اپنے گھر سے نکال دیں گے۔ اب حُکم اُس کو مل چُکا اور وُہ خُوب جان گیا کہ تعمیل میں میری خیر اور عدُول حُکمی میں میرا نُقصان ہے۔ وُہ ایک باغ میں جاتا ہے اور باغبان سے آنکھ بچا کر چوری سے آم توڑتا اور مالک کے حضُور لاتا ہے۔ اب مالک اُس کی بد دیانتی کے باعث اگر اُسے اپنے گھر سے نکالدے تو مالک کس صُورت قابلِ الزام ہے؟ اور نوکر کس صُورت بے قصُور ہے؟ اگر اُس کو دام نہ دئے جاتے اور پھر اُس سے یہ توقع کی جاتی کہ وُہ آم لائے تو البتہ مالک کا قصُور ہوتا۔ مگر اُس کو آم خریدنے کی قابلیت مالک کی طرف

سے دی گئی تھی۔ لیکن وہ اُس قابلیت (دام) کو کام میں نہ لایا۔ اِسی طرح خدا تعالےٰ نے آدم میں قابلیت نیکی اور فرمانبرداری کی پیدا کر کے پھر اُس سے حکم کی تعمیل طلب کی۔ لیکن آدم نے اُسی نیک قابلیت کو غلط راہ پر استعمال کر کے خدا کی مرضی کو ٹھکرا دیا۔ جب حکم مِل چکا اور وہ توڑا گیا تو عدل پیدا ہو گیا۔ اور وُہی عدل قانون شکن کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ اِس واسطے ابوالبشر و امّ البشر کو عدلِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور گناہ کی سزا دُکھ و موت اُن کے حصّے میں آئی۔ اگر حکم نہ دیا گیا ہوتا تو عدول حکمی بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ "جہاں شریعت (حکم) نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں" (رومی ۴: ۱۵) اور دُوسری بات یہ ہے کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو نیکی و پاکیزگی کی قدر و قیمت اِنسان نہ جان سکتا۔ ضد کی حقیقت ضد ہی سے کھُلتی ہے۔

اگر اب بھی معترض کے پاس کوئی اعتراض ہے تو عرض ہے کہ اُس کو دُنیا میں کوئی امر ایسا نہ مِلے گا جس پر نکتہ چینی نہ ہو سکے۔ مثلاً اگر کوئی مسیح کے اِس قول پر غور کرے کہ "جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔ وُہ اپنے دِل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا۔" تو وُہ یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اگر آنکھ کے ذریعے بدنظری کا گناہ صادر ہوتا ہے تو خدا نے آنکھ کو بنایا ہی کیس لئے ؟ اور اگر ہاتھ سے تلوار پکڑ کر کسی کا خون کر دیا تو کہہ دیا کہ ہاتھ خدا نے کیوں بنا دیا جس سے خون ہو جاتا ہے۔ اِسی قسم کے یہ سوال ہیں کہ خدا نے شجرِ ممنوعہ کو اُگایا ہی کیوں۔ یا اگر آدم نے گرنا ہی تھا تو اُسے پیدا ہی کیوں کیا ؟

اگر ایک مکان کو جلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے مکین یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ اِس آتشزدگی کے اسباب و وجوہات کیا ہیں ؟ کیوں آگ لگی۔

کس نے لگائی - کس غرض سے لگائی - کب لگائی - کبھی پہلے کیوں نہ لگائی؟ تو کون ہے جو اُن کی نادانی پر نہ ہنسے - سب سے پہلے آگ کو بجھانے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنایا جائے - ورنہ اسباب و موجبات کی تلاش کرتے کرتے مکان جل کر خاک ہو جائے گا - ہم ناظرین سے گذارش کرتے ہیں کہ ایسے توہمات باطلہ میں پڑ کر حق سے رُوگردانی کریں - اِس کا نتیجہ پہلے گمراہی اور پھر ہلاکت ہے ۔

گُناہ کیا ہے؟

"آدمی کا ضمیر خُداوند کا چراغ ہے - جو اُس کے تمام اندرُونی حال کو دریافت کرتا ہے" (امثال ۲۰: ۲۷)

ایک تعریف گُناہ کی یُوں ہو سکتی ہے کہ جو کچھ اِنسان اپنے ضمیر کی روشنی میں بُرا سمجھتا ہے اُس پر عمل کرنا گُناہ ہے - ضمیر خُدا نے اِنسان کو ایک عجیب حِس بخشی ہے جو اُس کو فطرتاً جائز و ناجائز افعال میں اِمتیاز دکھاتی ہے - اور ساتھ ہی ناجائز افعال کے ارتکاب سے روکتی ہے - پھر بھی بعض کام ایسے ہیں جو بذاتہٖ بُرے نہیں اور جن کو اِنسان محض سوسائٹی کے زیرِ اثر بُرے سمجھنے لگتا ہے اُن پر بھی ضمیر ناجائز ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے - یہ اِس لئے ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اِنسان بچپن سے ایک ہی قسم کی سوسائٹی کے زیرِ اثر تربیت پاتے پاتے، ایک ہی قسم کی باتوں کو سُنتے سُنتے ایک ہی طریق پر چلتے چلتے اور سوسائٹی کے پوشیدہ مگر قوی اثرات کے ماتحت ایک ایسے مصنوعی طریق کا عادی ہو جاتا ہے کہ اُس کو وہ تمام باتیں جو اُس طریق کے برخلاف ہوں گُناہ معلوم ہوتی ہیں - مثلاً ایک بُت پرست اگر بُت پرستی کو ترک کرنا چاہے تو اُس کا ضمیر اُس کے اِس خیال کو ناجائز ٹھہراتا ہے - ایک سِکھ اگر اپنے کیس (بال) کٹوانے کا ارادہ کرے تو اُس کا ضمیر اُس کے اِس ارادہ پر ناجائز ہونے

کا فتویٰ لگائے گا۔ تاہم درحقیقت یہ دونوں باتیں گناہ نہیں ہیں۔ اِس لئے ہر وُہ فعل جس کو ضمیر ناجائز ٹھہراتا ہے گناہ نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ضمیر اپنے فرضِ منصبی کو دُرست طریق پر انجام نہیں دیتا؟ وجہ یہ ہے کہ گناہ نے اپنے زبردست عملِ تخریبیہ سے جہاں عقل۔ دِل اور دماغ کو بگاڑ دیا ہے، وہاں ضمیر پر بھی اثر انداز ہو کر اُس کی مقررہ رفتار میں فرق ڈال دیا ہے "عقل اور دِل دونوں گناہ آلودہ ہیں" (ططس ۱: ۱۵) "عقل بگڑی ہُوئی ہے" (۲۔ تمتھیُس ۳: ۸؛ ۱۔ تمتھیُس ۶: ۵) تو بھی ضمیر کو قطعی معطّل اور از کار رفتہ سمجھنا دُرست نہیں۔ اُس کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، پر ہمیشہ نہیں۔ گو ضمیر نقصان سے خالی نہیں تو بھی وُہ اپنے فرضِ منصبی کو بہت حد تک دُرستی سے انجام دیتا ہے۔ اصل مضمون کو چھوڑ کر ضمیر کی ماہیت پر بحث کرنا اِس وقت مناسب نہیں۔ ورنہ ہم اس کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے۔ پھر دُوسری تعریف گناہ کی یہ ہے کہ "جو کوئی گناہ کرتا ہے وُہ شرع کی مخالفت کرتا ہے۔ اور گناہ شرع کی مخالفت ہی ہے" (۱ یُوحنا ۳: ۴) جس طرح گناہ حضرت ابُوالبشر سے وراثتاً تمام نسلِ انسانی میں چلا آیا (رُومی ۵: ۱۲) اُسی طرح وُہ اخلاقی شرع جو خُدا نے اُس کو پیدائش کے وقت بخشی تھی کسی نہ کسی صُورت میں وراثتاً تمام بنی نوعِ انسان میں مُنتقل ہوتی آئی ہے۔ اور وُہ شریعت کسی تحریری صُورت میں نہ تھی، بلکہ آدم کے دِل پر مُرتسم کی گئی تھی۔ چُنانچہ اُس کا کُچھ نہ کُچھ بقیہ تمام اقوامِ عالم کے دِل میں فطرتی طور پر موجُود ہے۔ اور اِس ابتدائی باطنی شریعت کا بیان کلامِ مُقدّس میں یُوں ہے۔ "اِس لئے کہ جب وُہ قومیں جو شریعت (الہامی شریعت) نہیں رکھتیں اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں۔ تو باوجود شریعت (ظاہری الہامی شریعت) نہ رکھنے کے

وُہ اپنے لئے خُود ایک شریعت ہیں۔ چُنانچہ وُہ شریعت (باطنی شریعت) کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہُوئی دکھاتی ہیں"۔ (رُومی ۲: ۱۴ - ۱۵) الہامی شریعت اُس ابتدائی باطنی شریعت کا اعادہ ہے۔ پس شرع خواہ باطنی ہو یا ظاہری اُس کا ہر تجاوز گُناہ ہے۔ اور گُناہ کے چار اقسام ہیں :۔

(۱) **سیاسی گُناہ** ۔ یعنی جو حکومتِ وقت کے خلاف عمل میں آئے۔ جیسے کوئی شخص جعلی سکّے بنائے۔ اشیائے ممنُوعہ کی چھُپ کر تجارت کرے۔ اِن صُورتوں میں وُہ حکومت کا مُجرم ہے۔ اور سیاسی ملزم کا جب تک سُراغ نہ ملے وُہ سزا سے بچا رہتا ہے۔ مُجرم ثابت ہونے پر اُس کو سزا دی جاتی ہے۔

(۲) **سوسائٹی کا گُناہ** ۔ جو کسی سوسائٹی کے مقررہ قوانین وضوابط کے خلاف کیا جائے۔ جیسے کیس (لمبے بال) رکھنا سکھ سوسائٹی کا قانُون ہے اگر کوئی سکھ ہوتے ہُوئے بال کٹوا دے تو وُہ سوسائٹی کا مُجرم ہو گا۔ اور سوسائٹی سے خارج کیا جائے گا۔ مگر توبہ کرکے بحال ہو سکتا ہے۔

(۳) **فِطرۃ کا گُناہ** ۔ یعنی قوانین طبیعہ کی خلاف ورزی۔ جیسے کوئی شخص قانُون کششِ زمین کے خلاف عمل کرنے سے بلندی سے گر کر مر جائے۔ یا آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جل جائے۔ یہ قوانین اپنے تجاوز کے ساتھ ہی سزا دیتے ہیں۔ توبہ کرنے یا مُعافی مانگنے کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔

(۴) **خُدا کا گُناہ** ۔ یعنی خُدا کی طبیعت کے خلاف عمل کرنا۔ جیسے اُس کی ہستی سے مُنکر ہونا۔ بُت پرستی کرنا۔ کُفر و الحاد کا ارتکاب۔ الٰہی گُناہ باقی سب گُناہوں پر حاوی ہے۔ اور اُس کی سزا سب سے زیادہ ہولناک ہے۔ لیکن شرعِ الٰہی کے تجاوز کے نتائج فی الفور ظہُور میں نہیں آتے۔

کیونکہ خُدا رحیم و مہربان ہے، اَور ہر گُنہگار کو موقع دیتا ہے کہ وُہ اپنی بدکرداری سے تائب ہو۔ اِس لئے واعظ کہتا ہے کہ "چُونکہ بُرے کام پر سزا کا حُکم فوراً نہیں دیا جاتا۔ اِس لئے بنی آدم کا دِل اُن میں بدی پر بہ شدّت مائل ہے" (واعظ ۸: ۱۱) لیکن اِنسان اپنی کوتاہ اندیشی سے خُدا کے صبر و تحمّل سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر موردِ عتابِ الٰہی ٹھہرتا ہے۔ مندرجۂ بالا تین قِسم کے گُناہوں کی سزائیں جسمانی اَور اِین جہانی ہوتی ہیں۔ مگر خُدا کے خلاف گُناہ کرنے کی سزا ایک تو جسمانی و رُوحانی دونوں طرح کی ہوگی، دُوسرے اُس نے عدالت کا ایک خاص دِن ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ وُہ جسمانی طور پر بدکاروں کو اِس جہان میں بھی عارضی سزائیں دیتا ہے۔

مسیحیت محض عدمِ نیکی و عدمِ پاکیزگی کو گُناہ نہیں کہتی۔ جیسا کہ غیر اقوام سمجھتی ہیں، بلکہ از رُوئے انجیل گُناہ ایک امرِ وجُودی اَور نفس الامری حقیقت ہے، نہ کہ اعتباری محض و عدمی شے۔ محض نیکی کی نفی گُناہ نہیں ہے بلکہ نیکی کی نفی اَور گناہ کا اثبات دونوں باتیں مل کر گُناہ ہیں۔ گُناہ منفی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اثباتی۔ غیر مسیحی لوگ بھاری غلطی میں مُبتلا ہیں کہ وُہ محض عدمِ نیکی کو گُناہ سمجھے ہُوئے ہیں۔ اِس لئے وُہ چند ظاہری نیکیاں کر کے سمجھتے ہیں کہ اب ہم نیک ہیں۔ لیکن مسیحیت کا خیال یہ ہے کہ مُمکن ہے کہ ایک آدمی نیکی کرے مگر خُود نیک نہ ہو۔ نیکی کا فقدان گُناہ کے وجُود کی دلیل نہیں، بلکہ گُناہ کا وجُود سبب اَور عدمِ نیکی اُس کا نتیجہ ہے۔ گُناہ نے اِنسان کی فِطرت پر قبضہ جما کر نیکی کو اُس سے خارج کر دیا ہے۔ اب نیکی و پاکیزگی کا تسلّط اِس صُورت میں ممکن ہے کہ پہلے گُناہ فِطرتِ انسانی سے قطعی خارج کر دیا جائے، کیونکہ جب تک ایک بھرے ہُوئے برتن میں سے پہلی چیز نکال نہ دی جائے

تب تک دُوسری اُس میں سما نہیں سکتی۔

اِنسان کی اصلی فِطرت کے بگڑ جانے کا نام گُناہ ہے۔ خُدا نے اِنسان کو اِس لئے پیدا نہ کیا تھا کہ وُہ اُس سے برگشتہ ہو کر اُس کی مرضی کے خلاف کام کیا کرے، بلکہ اس لئے کہ وُہ خُدا کے ساتھ پُوری مطابقت و یگانگت رکھے، اور اُس کی مرضی کے مطابق چلے۔ چُونکہ اِس وقت اِنسان سراسر خُدا کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔ لہٰذا وُہ اپنی اصلی فِطرت پر قائم نہیں ہے، بس یہی گُناہ ہے۔ گُناہ وُہ ہے جو انسان کے تمام افعال و اقوال کو ملوّث کر دیتا ہے۔ اور بدافعال کا صدُور و ارتکاب اِنسان کے اعماقِ طبع میں ایک ایسے گندہ چشمے کا آئینہ دار ہے جس میں ڈُوب ڈُوب کر وُہ افعال صادر ہوتے ہیں۔ وُہ افعال اگر ظاہر نہ بھی ہوں تو بھی اُس گندے چشمہ کے وجُود کا اِنکار محال ہے۔ صرف ظاہری افعال جیسے خُون کرنا، چوری کرنا اور گالی بکنا وغیرہ ہی گُناہ نہیں ہیں، بلکہ یہ تو گُناہ کا عملی ظہُور ہیں۔ گُناہ اِنسان کی طبیعت کو عارض ہے۔ اگر یہ بدافعال ظہُور میں نہ بھی آئیں (گو محال ہے) تو بھی ہم کِسی اِنسان کو پاکِ مطلق نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر سانپ کسی کو نہ ڈسے تو بھی اُس کے زہریلا ہونے سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ ڈسے خواہ نہ ڈسے بہرحال زہر اُس کے اندر موجُود ہے۔ اِسی طرح اِنسان سے خواہ کسی فعلِ بد کا ارتکاب نہ بھی ہو تو بھی گُناہ اُس کی طبیعت میں موجُود ہوتا ہے۔ پس شرعِ الٰہی کا ہر چھوٹے سے چھوٹا تجاوز گُناہ ہے۔ اور شریعت اِنسان کو گُناہ سے آزاد نہیں کر سکتی، بلکہ وُہ تو صرف گُناہ کی پہچان ہی بخشتی ہے۔ "شریعت کے وسیلے تو گُناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے۔" (رومی ۳: ۲۰) جس طرح تھرمامیٹر صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ بُخار کتنے درجے کا ہے اور اُس بُخار کو دُور نہیں کر سکتا، اِسی طرح

شریعت گُناہ کے وجُود کا علم بخشتی ہے، اُس سے آزاد نہیں کر سکتی۔

بہت سے لوگ جن کی فطرت بالکل مسخ اور ضمیر مُردہ ہو چکا ہے گُناہ کے وجُود کا سرے سے اِنکار کرتے ہیں حالانکہ گُناہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو کہ لوگ مکانوں اور صندوقوں کو قُفل کیوں لگاتے ہیں؟ سرکاری خزانے پر دِن رات پہرے کیوں لگے رہتے ہیں؟ روپیہ بنکوں میں کس لئے جمع کیا جاتا ہے؟ اِس لئے کہ دُنیا میں چور موجُود ہیں۔ کیا چوری کرنا نیکی ہے؟ کیا پولیس کا اِنتظام۔ عدالتیں۔ ہتھکڑیاں۔ جیلیں۔ پھانسیاں اور شکنجے راست بازوں کو سزائیں دینے کے لئے بنائے گئے ہیں بلکہ صرف مُجرموں کے لئے۔ تمام ممالک و اقوام عالم میں حکومتوں اور تعزیری قوانین کا وجُود زبردست ثبوت اِس بات کا ہے کہ گُناہ دُنیا میں ہمہ گیر طور پر موجُود ہے۔ اور حکومت اُس کی روک تھام کا ایک جبری و ظاہری اِنتظام ہے تاکہ دُنیا میں اندھیر نہ مچ جائے اور دُنیا میں کوئی زبان۔ کتاب۔ اور کوئی لُغت ایسی نہ ملیگی کہ جس میں گُناہ کے مترادف الفاظ موجُود نہ ہوں۔ پس گُناہ ضمیر کی مخالفت ہے۔ شرعِ الٰہی کی مخالفت ہے۔ انسان کی خُودی پر ظُہور ہے۔ ایک نفس الامری حقیقت ہے۔ انسان کی اصلی فطرت کے بگاڑ کا نام ہے۔ انسان کی طبیعت کو عارض ہے۔ اور ایک رُوحانی مرض ہے۔ پس اب "اگر ہم کہیں کہ ہم بیگُناہ ہیں تو اپنے آپکو فریب دیتے ہیں۔ اور ہم میں سچائی نہیں" (۱ یُوحنا ۱: ۸)

گُناہ کی علّت جیسے پیشتر اس کے کہ پانی پیا جائے پیاس ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ مٹھائی کھائی جائے کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ اِسی طرح پیشتر اس کے کہ خُون کیا جائے قتل کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ چوری کی جائے چوری کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ زِنا کیا جائے زِنا کی خواہش

موجود ہوتی ہے۔ تو ثابت ہُوا کہ ہر فعل کے اِرتکاب سے پیشتر ہی اُس فعل کی خواہش اِنسان کے دِل میں موجود ہوتی ہے، اور خواہش ہر فعل پر مقدم ٹھہرتی ہے۔ لہٰذا خواہش عِلّت اور فعل یعنی خواہش کا عملی ظہور معلول ہے۔ پس گُناہ کی عِلّت بُری خواہش ہے۔ "تاکہ اُن کے وسیلے سے تُم اُس خرابی سے چھوٹ کر جو دُنیا میں بُری خواہش کے سبب سے ہے۔۔۔۔۔" وغیرہ۔ (۲۔پطرس ۱: ۴) "ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گُناہ کو جنتی ہے۔" (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵) اور یہی بُری خواہش ہے جو حضرت اَبُوالبشر سے وراثتاً اُس کی تمام نسل کو ملی ہے اِسی واسطے خُداوند مسیح نے گُناہ کی عِلّت (بُری خواہش) کو روکنے پر زور دیا اور صرف نیّت کی بُرائی کو ہی گُناہ ٹھہرایا۔ آپ نے فرمایا "مَیں تُم سے یہ کہتا ہُوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔ وُہ اپنے دِل میں اُس کے ساتھ زِنا کر چُکا۔" (متّی ۵: ۲۸) اور یہ بُری خواہش اِنسان کی فِطرۃ اوّلہ نہیں، بلکہ فِطرۃ ثانیہ ہے۔ اور اس کے اعماقِ قلب میں ایک گُناہ کا منبع ہے، جس میں سے افعالِ بد پھُوٹ پھُوٹ کر صادر ہوتے اور فضائے عالَم کو متعفّن کرتے ہیں۔ بد افعال کا ظہور گویا اعماقِ قلب کا اعلان ہے۔ اور خواہشِ بد کوئی اِکتسابی شے نہیں بلکہ طبعی موروثی ہے۔ اِسی واسطے اِنسانی تدابیر سے اِس کا اِزالہ محال ہے۔ مذہبی تعلیم۔ وعظ و نصیحت اور حکومت کی تعزیری تجاویز و عوامل صرف بُری خواہش کے معلولات (بد افعال) یعنی چوری۔ زِنا۔ حق تلفی۔ ظُلم۔ لڑائی فساد اور خُون ریزی وغیرہ کو عارضی طور پر روک سکتے ہیں، لیکن ان کی عِلّت (بُری خواہش) کے اندفاع و اِزالہ میں قطعی قاصر ہیں۔ جب تک اِنسان کی نیّت بد نہ ہو تب تک اِرادہ بُرا نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک اِرادہ

بُرا نہ ہو فعلِ بد کا صدُور محال ہے۔ اگر بدُون اِرادۂ بد کے افعالِ بد کا صدُور ممکن مانا جائے تو وُہ افعال اضطراری ٹھہریں گے نہ کہ اختیاری اَور یہ باطل ہے۔ پس فعلِ بد کے صدُور کی عِلّت بُرا ارادہ اَور بُرے ارادے کی عِلّت بُری خواہش ہے۔ اِنسان کی خواہش و اِرادہ گُناہ سے اِس قدر مانُوس ہو چُکے اَور طبیعت گُناہ کی طرف اِس درجہ مائل ہو چُکی ہے کہ جب تک اُس کی خواہش۔ مَیلانِ طبع اَور ارادہ کو کسی فوق العادت طریق سے تبدیل نہ کر دیا جائے حقیقی نیکی اُس سے صادر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی نیکی صادر بھی ہوگی تو وُہ گندی دھجی کی مانند ہوگی۔ (یسعیاہ ۶۴ : ۶) گُناہ اِنسان کی فطرت میں اِس قدر رَچ گیا ہے کہ یرمیاہ نبی اُسے انسان کی ایک فطرتی ناقابلیت سے تشبیہ دیتا ہے۔ (یرمیاہ ۱۳ : ۲۳) مخربانہ مَیلانات و مذمُوم رُحجانات گُناہ آلُودہ طبیعت کے لازمی نتائج ہیں۔

اکثر لوگ گُناہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وُہ گُناہ صرف اُس کو سمجھتے ہیں جو ظہُور میں آئے، لیکن نیّت کی سِفلیّت کو گُناہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ نیّت و خواہش کی بدی تمام جرائم و مآثم کا مرکز ہے۔ ذرا سوچئے کہ جب ایک آدمی دُوسرے آدمی کی نیّت کی بُرائی سے کسی صُورت آگاہ ہو جاتا ہے، تو باوجود اُس سے کوئی فعلِ بد سرزد نہ ہونے کے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ جِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نیّت کی بُرائی واقعی نفرت کا مُوجب ہے۔ اَور اگر انسان ایک دُوسرے کے باطنی خیالات کے جان لینے پر قادر ہوتا تو ضرُور ایک دُوسرے سے نفرت کرتا۔ اب دیکھئے کہ خُدا ہمارے باطن سے اِس قدر آگاہ ہے جس قدر ہمارے ظاہر سے۔ "مَیں تُمہارے دِل کے خیالات کو جانتا ہُوں"۔ (حزقی ایل ۱۱ : ۵ و ۱۔ کرنتھی ۴ : ۵) تو بتائیے کہ ہماری

بُری نیّت اَور بُری خواہش سے وُہ کیوں نفرت نہ کرے گا؟ اَور بُری خواہش (علّت گُناہ) کا مرکز دِل ہے۔ اِس لئے کلام میں آیا ہے کہ "دِل سب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز اَور لاعلاج ہے" (یرمیاہ ۱۷: ۹) "بنی آدم کا دِل بھی شرارت سے بھرا ہے" (واعظ ۹: ۳ و ۸: ۱۱) اَور خُداوند مسیح نے فرمایا "جو باتیں مُنہ سے نِکلتی ہیں، وُہ دِل سے نِکلتی ہیں۔ اَور وُہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے خیال۔ خُون ریزیاں زِناکاریاں حرام کاریاں۔ چوریاں۔ جھُوٹی گواہیاں۔ بدگوئیاں دِل ہی سے نِکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں" (متی ۱۵: ۱۸-۲۰) "اِنسان کے دِل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے" (پیدائش ۸: ۲۱) اِس لئے اِنسان کے لئے ہدایتِ الٰہی یہ ہے کہ "اپنے دِل کی خُوب حفاظت کر۔ کیونکہ زندگی کا سرچشمہ وُہی ہے" (امثال ۴: ۲۳) اَور داؤد نبی اِس گُناہ آلُودہ دِل کی تبدیلی کے لئے خُدا سے یُوں اِلتجا کرتا ہے "اَے خُدا میرے اندر پاک دِل پیدا کر۔ اَور میرے باطن میں از سرِ نَو مُستقیم رُوح ڈال" (زبور ۵۱: ۱۰) دیگر مذاہب صرف عملی گُناہ پر زور دیتے اَور بدخیالی و بداندیشی کو گُناہ نہیں سمجھتے۔ لیکن مسیحیت کی فضیلت و امتیاز اِسی سے ظاہر ہے کہ وُہ اِنسان کی نیّت کی بُرائی اَور خواہش و ارادہ کی نجاست و خباثت پر گُناہ ہونے کا فتویٰ دیتی اور بدخیالی و بداندیشی کو شرعِ الٰہی کا عدول ٹھہرا کر فعل سے زیادہ ارادۂ فعل کو معیُوب ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ خُدا باطن کی صفائی پسند کرتا ہے نہ کہ ظاہر کی۔ نادان لوگ عملی گُناہوں کے محض دُوسروں کی نظر سے بچکر پوشیدہ طور پر مُرتکب ہوتے اَور چند ظاہرداری کی نیکیاں کرکے خُود کو پاک و نیک سمجھنے لگتے ہیں، اَور دِل کو یُوں ہی تسلّی دے لیتے ہیں کہ ہم گنہگار نہیں ہیں۔ کلامِ مُقدّس ایسوں کے متعلق یُوں فرماتا ہے "ایک پُشت ایسی ہے جو اپنی نگاہ میں پاک ہے۔ لیکن اُس کی گندگی اُس سے دھوئی نہیں گئی" (امثال ۳۰: ۱۲)

"انسان کی ہر ایک روش اُس کی نظر میں راست ہے۔ پر خداوند دلوں کو جانچتا ہے"۔ (امثال ۲۱: ۲ و ۲۰: ۹۔ واعظ ۷: ۲۰) جب مصدر ہی ناپاک ہو تو اُس سے نیکی و پاکی کا صدور کیسے ممکن ہے؟ (یعقوب ۳: ۱۲) پس گناہ کی علت بُری خواہش ہے اور بغیر علت کی تبدیلی کے معلول کی تبدیلی محال ہے۔ جب تک انسان کی بُری خواہش و بُری طبیعت نئے سر سے نیک اور پاک نہ ہو جائے تب تک حقیقی نیکی اُس سے صادر ہی نہیں ہو سکتی۔ (متی ۷: ۱۸)۔

گناہ ہمہ گیر ہے

گناہ کی ہمہ گیری کے متعلق عقلی دلائل:۔

(۱) دُنیا میں کوئی ایسی کتاب۔ لُغت یا زبان نہیں ہے، جس میں گناہ کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ ہم اس مضمون کے آغاز ہی میں اس کا ذکر کر چکے ہیں، کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ بکثرت موجود ہیں جن سے گناہ کا ہمہ گیر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی لفظ تب تک ایجاد نہیں ہوتا جب تک خارج میں اُس کا کوئی مدلول نہ پایا جائے۔ واقعات پیش آمدہ کے مطابق اُن کے اظہار کے لئے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ عداوت کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر دُنیا میں عداوت اور دُشمنی نہ ہوتی۔ لفظ غم کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر غم کوئی شے یا کیفیت نہ ہوتی۔ اگر دُنیا میں کبھی کوئی بیماری ہی نہ ہوتی تو الفاظ بیماری۔ مرض۔ علالت اور حکیم و طبیب اور نسخہ و دوا وغیرہ ہرگز ایجاد نہ ہوتے۔ اور سرسام۔ برص۔ طاعون۔ ہیضہ۔ نمونیہ اور بخار وغیرہ الفاظ کا وجود نابود ہوتا۔ اسی طرح گناہ کے مترادفات یا اُس کی مختلف فروعات کے اظہار کے لئے دُنیا کی ہر زبان میں بکثرت الفاظ موجود ہیں۔ اگر گناہ کوئی ہمہ گیر شے نہ ہوتا تو اُس کے مفہوم کے اظہار کے لئے ہر مُلک کی زبان میں کثیر التعداد الفاظ ہرگز نہ ہوتے۔ لہٰذا گناہ ایک نفس الامری حقیقت

ہے اور ہمہ گیر ہے۔

(۲) ہر مُلک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی صورت میں حکومت اور تعزیری انتظام کا وجود گناہ کی ہمہ گیری کا زبردست ثبوت ہے۔ عدالتیں۔ حکومتیں اور تعزیرات گناہ کو قوتِ بازو سے روکنے کے لئے معرضِ وجود میں آئیں۔ چونکہ یہ انتظام ہمہ گیر ہے لہٰذا گناہ بھی ہمہ گیر ہے۔

(۳) گناہ ایک متوارث شے ہے۔ یعنی جس طرح صحت و سقم۔ ضُعف و قوّت۔ شکل و شباہت اور عادات و خصائل اور امزجہ و طبائع قانونِ ارث کے مطابق والدین سے بچوں میں منتقل ہوتے ہیں، اُسی طرح گناہ کی علّت (بُری خواہش) بھی ارثی طور پر اولاد میں منتقل ہوتی ہے۔ اور طبیعتِ موروثی کا ہمہ گیر ہونا مسلّم ہے، لہٰذا گناہ ہمہ گیر ہے۔

(۴) تجربۂ نوعی نے گناہ کی ہمہ گیری کو خوب ثابت کر دیا ہے۔ گناہ کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اور کوئی مُلک۔ کوئی قوم۔ کوئی جماعت۔ کوئی خاندان اور کوئی فردِ واحد بھی اِس سے آزاد نہیں۔ اِس حقیقت کا اِنکار محال ہے کیونکہ یہ واقعات و مشاہدات پر مبنی ہے۔

(۵) ہندوازم و اسلام جو اِس مُلک کے بڑے مذہب مانے جاتے ہیں اُن کے مسلّمات سے گناہ کی ہمہ گیری ثابت ہے۔ ہندو مذہب میں عقیدۂ تناسخ مسلّم ہے اور از رُوئے تناسخ تمام جیو بندھن میں آتے ہیں۔ اور اُن کا بندھن میں آنا کسی گذشتہ جُرم کے بغیر مُمکن نہیں۔ لہٰذا اُن کے مسلّمات کی رُو سے تمام جیو گنہگار ہیں۔

پھر اسلامی مسلّمات کی رُو سے بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلّم الثبوت ہے۔ قرآن کی سُورۂ نحل میں مرقوم ہے۔ کہ "اگر اللہ اِنسانوں سے اُن کے ظُلم کی بازپُرس کرے تو زمین پر ایک متحرک کو بھی نہ چھوڑے"۔ پھر حدیث صحیح

بخاری و صحیح مسلم میں بھی اسی مطلب کا مضمون ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تم میں سے کسی کا عمل اُس کو ہرگز جنت میں داخل نہ کرے گا۔ تو آپ کے ساتھیوں نے پوچھا کہ اے رسول اللہ کیا آپ کو بھی آپ کا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا؟ آنحضرت نے فرمایا۔ کہ مجھ کو بھی میرا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا۔ خدا کی رحمت و فضل کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پس اسلامی معتقدات سے بھی گناہ کی ہمہ گیری ثابت ہے۔

گناہ کی ہمہ گیری کے متعلق بائبل مقدس کی منقولی دلائل :-

(۶) بائبل سے گناہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ کلام میں آیا ہے کہ "گناہ کی مزدوری موت ہے" (رومی ۶ : ۲۳) چونکہ تمام انسان مرتے ہیں۔ لہٰذا سب گنہگار ہیں۔ گناہ سبب ہے اور موت اُس کا نتیجہ ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو موت بھی نہ ہوتی۔ جبکہ گناہ کا نتیجہ (موت) ہمہ گیر ہے، تو خود سبب گناہ، کیوں ہمہ گیر نہ ہوگا؟ اور کوئی نتیجہ بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔ گناہ کی ہمہ گیری کے ثبوت میں چند مقامات بائبل مقدس سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) جس طرح پانی میں چہرہ چہرے سے مشابہ ہے۔ اُسی طرح آدمی کا دل آدمی سے (امثال ۲۷ : ۱۹)

(۲) "انسان ہے کیا کہ وہ پاک ہو؟ اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے کہ صادق ہو" (ایوب ۱۵ : ۱۴)

(۳) "خداوند نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی۔ تاکہ دیکھے کہ کوئی دانشمند کوئی خدا کا طالب ہے یا نہیں۔ وہ سب کے سب گمراہ ہوئے۔ وہ باہم نجس ہو گئے کوئی نیکوکار نہیں۔ ایک بھی نہیں" (زبور ۱۴ : ۲-۳ ؛ ۵۳ : ۲-۳)

(۴) "اور اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا۔ کیونکہ تیری نظر میں کوئی آدمی راستباز

نہیں ٹھہر سکتا" (زبور ۱۴۳: ۲)۔

(۵) "کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنے دل کو صاف کر لیا ہے۔ اور میں اپنے گناہ سے پاک ہو گیا ہوں" (امثال ۲۰: ۹)

(۶) "کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز انسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے" (واعظ ۷: ۲۰)

(۷) قول المسیح- "کوئی نیک نہیں- مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸: ۱۹)

(۸) "اس لئے کہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہیں۔" (رومی ۳: ۲۳ و ۵: ۱۲)

(۹) "اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ اور ہم میں سچائی نہیں" (۱-یوحنا ۱: ۸)

ہم نے گناہ کی ہمہ گیری کو معقولات و منقولات سے پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی باطنی حالت کا امتحان کر لے۔ اور اپنے آپ کو خوب جانچ لے کہ واقعی وہ گنہگار ہے یا نہیں۔ اگر کوئی اب بھی اپنے آپ کو بالکل پاک و راستباز سمجھے تو وہ جان لے کہ گناہ کی غیر معمولی تیرگی نے اس کے ضمیر کو جو اس کے باطن کے لئے بمنزلہ ایک چراغ کے ہے۔ (امثال ۲۰: ۲۷) یہاں تک تاریک کر دیا ہے کہ وہ اپنے باطن کی گندہ آلودہ تاریک حالت کو جان نہیں سکتا۔ اور ایسا شخص قابل رحم ہے۔

کیا گناہ انسان کی اصلی فطرت ہے؟

اگرچہ ہم پیچھے کئی جگہ ثابت کر آئے ہیں کہ گناہ انسان کی جبلت کا خاصہ ذاتی نہیں ہے۔ پھر بھی ضرور ہے کہ کوئی اور زیادہ وضاحت سے اس امر کا ثبوت چاہے۔ لہٰذا ہم چند دلائل سے اس خیال کی کہ گناہ جزو انسانیت ہے تردید

سے ہمیشہ خوشی ہی ہوتی ہے اور پچھتاوا کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوری سے جو مال و دولت ہاتھ آتا ہے وُہ اُس کی طبیعت پر رنج و پچھتاوے کو غالب آنے نہیں دیتا۔ تو اس کے جواب میں اِس قدر عرض ہے کہ اگر خود چور کے گھر میں چوری ہو جائے تو کیا پھر بھی اُسے خوشی حاصل ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ اسکو ضرور رنج اور افسوس ہوگا۔ پس اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ اور گُناہ فطرتِ انسانی کا خاصہ نہیں بلکہ غیر شے ہے۔ لہٰذا اِس سے آزاد ہونا اصلی فطرت کا تقاضا ہے۔

(۳) گُناہ تمام افرادِ عالم میں یکساں نہیں ہے۔ اِس لئے طبیعتِ اولہٰ نہیں بلکہ ثانیہ ہے۔ کسی میں ایک گُناہ ہے اور دُوسرے میں وُہ نہیں کوئی اور ہے۔ ایک شخص خُونی تو ہے مگر غُرباء کے ساتھ بہت ہمدردی کرتا ہے۔ ایک آدمی زانی تو ہے مگر خُونی نہیں ہے۔ ایک آدمی لالچی تو ہے مگر سچ بولنے میں مشہور ہے۔ ایک آدمی بُت پرست تو ہے مگر جھُوٹ۔ فریب۔ خُون ریزی اور ظُلم وغیرہ سے نفرت کرتا ہے۔ جس طرح سانس لینا۔ سُننا۔ دیکھنا۔ سونا۔ جاگنا اور کھانا پینا وغیرہ ذاتی خصائص تمام افرادِ عالم میں یکساں ہیں، اُسی طرح اگر گُناہ اِنسان کی ذاتیات کا جُزو ہوتا تو تمام نوعِ انسانی میں یکساں ہوتا۔ یعنی اگر ایک شخص چوری کرتا تو تمام دُنیا چوری کرتی۔ اگر ایک شخص جھُوٹ بولتا تو ضرور تھا کہ دُنیا کے تمام لوگ جھُوٹ بولا کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا گُناہ جُزوِ انسانیت نہیں ہے۔

(۴) خُدائے قدُّوس سے ناپاک طبیعت کے معلُول کا صادر ہونا قطعی مُمتنع و محال ہے۔ کیونکہ قدُّوسیت اور ناپاکی باہم نقیضین ہیں۔

اور ایک نقیض دُوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا، جیسے آفتاب میں سے تاریکی کبھی صادر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا گُناہ اِنسان کی فطرت اوّلہ نہیں۔

(۵) گُناہ کو جُزو فطرتِ اِنسانی ماننے سے احکام و شرائع اور اوامر و نواہیٔ الٰہیہ کا بطلان لازم آئے گا۔ خُدا خُود گُناہ کو اِنسان کی طبیعت میں پیدا کرکے اُس کے خلاف احکام صادر نہیں کر سکتا۔

(۶) اگر گُناہ عرضِ ذاتی ہے تو خُدا تعالیٰ کسی کو سزا و جزا نہیں دے سکتا۔ اور عدالت و ابدی زندگی سے انکار لازم آئے گا۔

(۷) خُدا کے تمام اِنتظامات دربارہ ازالۂ گُناہ اور نجاتِ بنی نوع اِنسان باطل ٹھہریں گے۔ کیونکہ خاصۂ ذاتی کا انفکاک اپنی ذات سے محال ہے۔

(۸) گُناہ و بدی کے عامل ہونا خُدا کی عین فرماں برداری ہوگی۔ اور نیکی کے عامل ہونا خُدا سے سرکشی و مخالفت کرنا ہوگا۔

جبکہ گُناہ کو اِنسان کی اصلی فطرت ماننے سے مندرجہ بالا قباحتیں لازم آتی ہیں، تو یہ خیال خود باطل ہو کر محال ٹھہرا۔ اور ثابت ہُوا کہ گُناہ اِنسان کی طبیعت کا خاصۂ ذاتی نہیں۔ طبیعت اوّلہ نہیں بلکہ طبیعت ثانیہ یا عرض انضمامی ہے۔ یعنی خُدا نے تو اَبُوالبشر کو پاک و راست پیدا کیا تھا۔ لیکن وُہ خود الٰہی نافرمانی کرکے گنہگار ہو گیا۔ "دیکھ مَیں نے صرف اِتنا پایا کہ خُدا نے اِنسان کو راست بنایا۔ پر اُنہوں نے بہتیری بندشیں تجویز کیں۔" (واعظ ۷: ۲۹) اور اس گُناہ سے اِنسان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اور وُہ طبعی بگاڑ موروثاً آدم سے تمام نسلِ اِنسانی میں منتقل ہو گیا۔ (رومی ۵: ۱۲)

اِس دُنیا میں بے شمار جسمانی امراض پائے جاتے ہیں، اور وُہ امراض

یا تو موروثی ہوتے ہیں۔ یعنی آباؤ اجداد سے اولاد کو وراثتاً ملتے ہیں۔ جیسے تپ دق کے مریض والدین کے بچے بھی تپ دق میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ یا متعدی ہوتے ہیں۔ یعنی مریضوں کی صُحبت و سنگت سے لاحق ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی تندرُست آدمی کسی کوڑھی یا تپ دق کے مریض کی صُحبت میں رہنے سے خُود بھی اِس مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یا کسبی ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی غفلت و نادانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی گرم گرم چائے پی کر اُوپر سے فوراً برف کا ٹھنڈا پانی پی لے اور گرم سرد ہو کر بیمار ہو جائے۔ جس طرح یہ جسمانی بیماریاں جسم کے لئے مضرت رساں ہیں۔ اُسی طرح گُناہ ایک رُوحانی مرض ہے اور رُوح کی تخریب و تنزل کا موجب ہے۔ اور یہ رُوحانی مرض (گُناہ) بھی تین ہی طرح پر ہے :-

طبعی یا موروثی گُناہ

آدم اور حوّا کے گُناہ میں گرنے سے اُنکی طبیعت ناپاک اور گُناہ آلُودہ ہو گئی۔ اور اِس بُری طبیعت کا اثر وراثتاً اُن کی نسل میں منتقل ہوتا آیا۔ "دیکھ میں نے بدی میں صُورت پکڑی اور میں گُناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا" (زبور ۵۱:۵) "شریر پیدائش ہی سے کجروی اختیار کرتے ہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی جھُوٹ بول کر گمراہ ہو جاتے ہیں" (زبور ۵۸:۳) "میں جانتا تھا کہ تُو بالکل بے وفا ہے۔ اور رحم ہی سے خطاکار کہلایا" (یسعیاہ ۴۸:۸) "انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے" (پیدائش ۸:۲۱) "پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گُناہ دُنیا میں آیا۔ اور گُناہ کے سبب موت آئی۔ اور یُوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اِس لئے کہ سب نے گُناہ کیا" (رومی ۵:۱۲) گُناہ کو موروثی کہنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اولاد اپنے والدین کے گُناہوں کی سزا میں بھی مُبتلا ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ بدی کا میلان وراثتاً والدین

سے اولاد میں منتقل ہوتا ہے نہ کہ سزا بھی۔ "گناہ تو کردی و پدرت بہ قتل گاہ
رسید" والا معاملہ نہیں۔ اِس کے متعلق کلامِ الٰہی کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔ "اُن
ایّام میں پھر یوں نہ کہیں گے کہ باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت
کھٹے ہو گئے۔ کیونکہ ہر ایک اپنی ہی بدکرداری کے سبب سے مریگا۔ ہر ایک جو کچے انگور
کھاتا ہے اُسی کے دانت کھٹے ہوں گے۔" (یرمیاہ ۳۱: ۲۹-۳۰ و حزقی ایل باب
تمام) "پس ہر ایک ہم میں سے خُدا کو اپنا اپنا حساب دے گا۔" (رومی ۱۴: ۱۲ و گلتی ۶:
۵) اگر کوئی ہمارے اِس دعوے کی تردید میں خروج ۲۰: ۵ کو پیش کر کے یہ ثابت
کرنا چاہے کہ اولاد اپنے آباؤ اجداد کی سزا میں مبتلا ہوتی ہے تو اُس کے
متعلق عرض ہے۔ کہ سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی سزائے نظامت اور
سزائے عدالت۔ خُدا اِس دُنیا میں کبھی کسی کو عدالتی سزا نہیں دیتا۔ بلکہ اُس
کے لئے ایک خاص دن مقرر ہے۔ لیکن سزائے نظامت جسمانی اور ایسی
جہانی ہوتی ہے۔ اُس میں بے شک بچے بھی والدین کے ساتھ سزا پاتے ہیں
جیسے طوفانِ نوح میں بدکرداروں کے ساتھ اُن کی اولاد بھی ہلاک ہوئی لیکن
اِس سے اُن کا کوئی رُوحانی نقصان نہیں ہوا۔ رُوحیں سزائے عدالت کے لئے
باقی رکھے گئے ہیں۔ جب بدی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو خُدا بدکاروں
کو اُن کی نسل سمیت مٹا دیتا ہے جیسے ایک مصوّر اپنی تصویر کو جس میں
نقص پیدا ہو جائیں ربڑ سے مٹا دیتا ہے۔ جو سزائیں حاکموں کی طرف سے
بدکاروں کی اصلاح کے لئے دی جاتی ہیں وہ بھی خُدا کی انتظامی سزا میں شامل
ہیں۔ سزائے نظامت توبہ کر لینے سے ٹل بھی جاتی ہے۔ جیسے نینوا کے لوگوں
نے جب اپنی بدکرداری سے توبہ کی اور خُدا کے حضور خاکساری اختیار کی
تو اُن کی سزا ٹل گئی۔ (یوناہ ۳: ۵-۱۰) لیکن سزائے عدالت رُوحانی سزا ہے

اور اٹل ہے۔ اُس سے کوئی بدکار بچ نہیں سکتا۔

متعدی گُناہ یعنی بدکرداروں کی قُربت و صحبت سے بھی انسان کی طبیعت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اِس لئے کلام میں آیا ہے کہ "فریب نہ کھاؤ۔ بُری صحبتیں اچھی عادتوں کو بگاڑ دیتی ہیں"۔ (۱-کرنتھیوں ۱۵: ۳۳) اور زبور ۱: ۱ میں اُس آدمی کو مُبارک کہا گیا ہے جو شریروں کی صحبت سے پرہیز کرتا ہے۔ (امثال ۱۳: ۲۰ و ۲۲: ۲۴ و ۲۴: ۱)

کسبی گُناہ "ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گُناہ کو جنتی ہے"۔ یعقوب ۱: ۱۴-۱۵ و ۲-پطرس ۲: ۱۴

گُناہ نے فطرتِ انسانی پر اثرانداز ہو کر زندگی کے شیریں چشمہ کو زہریلا بنا دیا ہے۔ جس کے سبب اِس دُنیا میں انسان ہر قسم کے مصائبِ جسمانی و آلامِ رُوحانی میں مُبتلا نظر آتا ہے۔ اور زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ معلُوم ہوتی ہے۔ ریاضتِ بدنی اور تزکیۂ نفس وغیرہ کے ہمہ گیر خیالات گُناہ کے وجُود اور اُس کے باعث انسان کی رُوحانی بےچینی اور قلبی اضطراب کے مظہر ہیں۔ بلکہ اِن جسمانی و رُوحانی آلام و مصائب سے تنگ آ کر انسان نے خودکشی کو ذریعۂ نجات سمجھا۔ یُونانی حکماء کا یہ خیال ہے کہ "طبعی موت خود انسان کے پاس آتی ہے۔ اور خودکشی انسان کو موت کے پاس لے جاتی ہے"۔ فیثاغورث، افلاطُون اور ارسطُو خودکشی کے بظاہر مخالف ہیں۔ اور افلاطُون خودکشی کی مخالفت کے باوجود اپنی زبان سے یہ کہتا ہے کہ "شدّتِ افلاس و مصائب سے جب زندگی ناقابلِ برداشت ہو جائے تو خودکشی جائز ہے"۔ مارکس اُریلیس کہیں خودکشی کا مخالف اور کہیں حامی ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ "ہر شخص کو اپنی جان پر کامل اختیار حاصل ہے"۔ حکیم اپی کیورس کا یہ عندیہ ہے کہ "خُوب غور کر لو،

موت کا تمہارے پاس آنا بہتر ہے، یا تمہارا موت کے پاس جانا۔" اس کی
تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ اُس کے پانچ شاگرد خودکشی کے مرتکب ہوئے۔ پلینی
بڑے فخر سے کہتا ہے کہ "موت کے بارے میں عبد کو معبود پر فضیلت حاصل
ہے، کہ وہ اپنی حسب مرضی زندگی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اور یہ فطرت کی فیاضی
کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ دُنیا میں ایسی جڑی بُوٹیاں پیدا کر دی گئی ہیں،
جن کی مدد سے انسان اپنے مصائب کا آسانی سے خاتمہ کر سکتا ہے۔" ہیجیسی
ایک مشہور فاضل گذرا ہے، جسے "خطیبِ مرگ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے
یہ شخص ایک طرف تو حصولِ لذت کو انسانی حیات کی غرض و غایت ٹھہراتا ہے
اور دوسری طرف موت کو بہترین نعمت قرار دیتا ہے۔ یہ بڑا سحر بیان خطیب
اور عظیم آتش نوا مقرر تھا۔ اس کی خطابت کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمیوں
نے خودکشی کرنا شروع کر دی۔ روزانہ خودکشی کے واقعات ظہور پذیر ہونے
لگے۔ ان اموات کا ملک کی آبادی پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اس لئے حکومت نے
ہیجیسی کو سکندریہ سے جلا وطن کر دیا۔ رُوم کے شعرا متاخرین میں سیلیس
اٹالیکس کو بڑا درجہ حاصل تھا۔ وہ بھی خودکشی سے مرا۔ رُوم کا مشہور جرنیل
اگنیشس زہر کھا کر ہلاک ہو گیا۔ اس نے اِس فعل کو ایثار۔ اور وطن دوستی سے
تعبیر کیا گیا۔ کلیمی یومی گرنس جب زندگی سے اُکتا گیا، تو اُس نے خودکشی کے
وقت بہت سے دوستوں کو دعوت دی۔ اور اُن کی موجودگی میں آگ میں کود
کر ہلاک ہو گیا۔

اپے کٹیٹس کہتا ہے۔" یہ خوب یاد رکھو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بچوں
سے زیادہ تر بزدل نہ ہو۔ جس طرح جب بچے کھیل کود سے اُکتا جاتے ہیں
تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب نہ کھیلیں گے۔ اِسی طرح جب زندگی سے عاجز

آجاؤ تو فوراً زندگی ترک کردو۔"

حکیم سنیکا کے خطبہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"اگر موت نہ ہوتی تو یہ زندگی کیسا ناقابلِ برداشت عذاب ہوتی۔ (موت پر میرے موذی سے موذی دشمن کا بھی دست رس نہیں۔ درحقیقت موت ایسی شے ہے جو تمام مصائب کے لئے سپر ہے۔" "تم تکالیف سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو اس کے لئے جس طرف نظر اٹھاؤ تمہیں وسائل و ذرائع بہ افراط ملیں گے۔ پہاڑ اور چٹان کی بلندی۔ دریا۔ کنوئیں اور سمندر کی تہ۔ جہاں چاہو ذریعۂ نجات موجود ہے۔ (یعنی جس طریقہ سے چاہو خودکشی کر سکتے ہو۔") جب مجھے طریقۂ موت میں انتخاب کرنا ہے۔ تو کیوں نہ میں آسان موت کو تکلیف دہ موت پر ترجیح دے کر اختیار کروں؟ جس طرح مجھے اپنے رہنے کے لئے مکان کے انتخاب کا اور سفر کے لئے جہاز کے انتخاب کا حق حاصل ہے، اسی طرح طریقۂ موت کے انتخاب کا بھی حق حاصل ہے۔ جس طریقہ پر تمہیں اچھا معلوم ہو زندگی کو خیرباد کہو۔ خواہ تلوار کی کاٹ سے۔ خواہ رسی کے پھندے سے۔ خواہ زہر کے گھونٹ سے۔ بہرحال اپنی مشکل آسان کرو۔"

"طریقِ زندگی میں تم دوسروں کی خوشی و مرضی کی پرواہ کرتے ہو۔ لیکن طریقِ موت بالکل تمہاری ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔ جب تک تمہاری خوشی ہے زندہ رہو۔ جب دیکھو کہ زندگی ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے، تو پھر بھی اسے جھیلتے رہنا خود تمہارا قصور ہے۔ جہاں سے تم آئے ہو وہاں واپس چلے جانا بالکل تمہارے قدرت و اختیار میں ہے۔ اور اس حق سے فائدہ اٹھانے سے تمہیں کون روک سکتا ہے؟" (تاریخ اخلاقِ یورپ)

خودکشی کے متعلق اس قدر لمبے چوڑے اقتباسات پیش کرنے سے غرض،

صرف یہ ہے کہ ناظرین کو گُناہ کے ہولناک نتائج کی تصویر کھینچ کر دکھائی جائے۔ کلام میں آیا ہے کہ "گُناہ کی مزدُوری موت ہے" اور گُناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے"۔ پس موت خواہ طبعی ہو خواہ غیر طبعی اور چاہے جسمانی ہو یا رُوحانی وُہ ضرور گُناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب مرضِ گُناہ عام ہو گیا تو مریضانِ گُناہ نیم حکیموں (یُونانی فلاسفروں) کی ستم ظریفیوں کا تختۂ مشق بنے۔ اور بمصداق "نیم حکیم خطرۂ جان" اُن کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ یعنی فلاسفروں نے جہاں اِس زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے کئی غلط طریقے بتائے وہاں خودکشی کو بھی ذریعۂ نجات قرار دیا؛ اور بنی آدم کو قعرِ ضلالت میں گرا دیا۔

خارجی دُنیا کی طبعی اشیاء اور جاندار مخلُوق جن پر خُدا نے اِنسان کو حکمران ٹھہرایا تھا، اب حضرتِ اِنسان کے مخالف نظر آتی ہیں۔ اور اِس مخالفت کی اصلی وجہ بھی گُناہ ہے۔ اور اِنسان اور نیچر کی اشیاء کے مابین ناموافقت کی دو وجُوہات ہیں:۔

(۱) اِنسان کا طبعی بگاڑ: ایک شخص جب بُخار میں مُبتلا ہوتا ہے تو بُخار سے اُس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ اور عدمِ صحتِ طبع کے باعث اُسے پانی، روٹی اور دیگر خوردنی اشیاء کڑوی معلُوم ہوتی ہیں۔ اور ہوا و روشنی سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ روٹی، پانی، ہوا اور روشنی میں کوئی بگاڑ نہیں ہوتا۔ وُہ اصلی حالت میں ہوتے ہیں۔ صرف علالتِ طبع کے باعث مریض کو وُہ چیزیں بدمزہ اور خلافِ طبع معلُوم ہوتی ہیں۔ اِسی طرح اِنسان کی طبیعت گُناہ کے مرض سے بگڑ گئی ہے، اور وُہ رُوحانی طور پر مریض ہے۔ اِس لئے فطرت کی وُہ عام چیزیں جو کسی وقت اُس سے موافقت رکھتی تھیں اب خلافِ طبع معلُوم ہوتی ہیں۔

مثلاً سانپ اُس کو ڈسنا چاہتا ہے۔ شیر اُس کے خون کا پیاسا ہے۔ اسی طرح چیتا۔ بھیڑیا۔ بچھو۔ تتیاں وغیرہ سب اُس کو اپنے مخالف نظر آتے ہیں۔ پردر اصل یہ تمام چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ بگاڑ صرف انسان کی اپنی طبیعت میں ہے۔ اگر گناہ کا مرض اُس کی طبیعت سے خارج ہو جائے تو کوئی شے اُس کی مخالف نہ رہے۔ اور ایک وقت آنے والا ہے جس میں ایسا ہی ہوگا یعنی انسان مرض گناہ سے آزاد ہو کر اپنی اصلی ابتدائی پاکیزہ فطرت پر بحال کیا جائے گا۔ اور اُس وقت "بھیڑیا برّے کے ساتھ رہیگا اور چیتا بکری کے بچے کے ساتھ بیٹھے گا۔ اور بچھڑا اور شیر بچہ اور پلا ہوا بیل مل جل کر رہیں گے۔ اور ننھا بچہ اُن کی پیش روی کرے گا۔ گائے اور ریچھنی مل کر چریں گی۔ اُن کے بچے اکٹھے بیٹھیں گے۔ اور شیر ببر بیل کی طرح بھوسہ کھائے گا۔ اور دودھ پیتا بچہ سانپ کے بل کے پاس کھیلے گا۔ اور وہ لڑکا جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو افعی کے بل میں ہاتھ ڈالے گا۔ وہ میرے کوہِ مقدس پر نہ ضرر پہنچائیں گے نہ ہلاک کریں گے"۔ (یسعیاہ ۱۱: ۶–۹)

(۲) **انسان کا اصل مرتبہ سے تنزل۔** انسان اور اشیائے نیچر کے مابین ناموافقت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان نے خدا کا گناہ کر کے اپنا اصل مرتبہ کھو دیا۔ خدا نے اُسے پاک و راست پیدا کر کے تمام موجودات پر حکمران ٹھہرایا تھا۔ (زبور ۸: ۵–۸) لیکن اُس نے گناہ کر کے اپنی طبیعت کو خدا کی طبیعت کا مخالف بنا لیا۔ اور حکم عدولی سے اپنا وہ تمام اختیار و اقتدار کھو دیا اور اپنے عہدہ سے معزول ہو گیا۔ اس لئے اب نیچر کی اشیاء اُس متنزل و معزول شدہ حاکم کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتیں۔ کیونکہ اگر کوئی گورنر شہنشاہ کے برخلاف سر اُٹھانے کے باعث اپنے عہدہ سے معزول کر دیا جائے تو حیثیت

اُس کے رُعب و اختیار کو خاطر میں نہ لائے گی اور نہ ڈرے گی - یہی حال خلیفۂ خُدا حضرت اِنسان کا ہُوا - اُس نے خُدا سے بغاوت کی اِس لئے نیچر کی ادنیٰ مخلوق پُورے طور پر اُسکے تابع نہیں رہی - درندے اُس کو پھاڑنا چاہتے ہیں - سانپ اُس کو ڈسنا چاہتے ہیں - دریا اُس کو ڈبو دینا چاہتا ہے - جراثیم اُس کے خُون کے پیاسے ہیں - اگر یہ مخلوق کبھی اُس سے خوف بھی کھاتی ہے تو یہ اُس کی شوکتِ گذشتہ اور جلالتِ رفتہ کا اثر ہے - اب اگر وُہ کسی طرح پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر سابقہ منصب پر بحال نہ کیا جائے تو اُس کا اختیار پُورے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ؛

گُناہ کے نتائج

اب تک ہم نے گُناہ کے جسمانی نتائج کا جائزہ ذکر کیا ہے - منجملہ اِن تمام جسمانی نتائج کے گُناہ کے تین نہایت ہولناک رُوحانی نتائج ہیں - جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :-

(۱) طبعی بگاڑ - خُدا نے اِنسان کو پاک و راست پیدا کیا تھا - یہ اِنسان کی اصلی فطرت تھی - لیکن گُناہ نے اُس کی پاکیزہ فطرت پر اثر انداز ہو کر اُسے پاک سے ناپاک بنا دیا - لہٰذا وُہ اصلی فطرت پر قائم نہ رہا - پاکیزگی کے کھنڈرات پر گُناہ نے اپنی عمارتیں اُٹھائیں - اور زندگی کے شیریں چشمہ کو زہریلا بنا دیا - پس گُناہ کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے اِنسان کی طبیعت کو بگاڑ دیا -

(۲) خُدا تعالیٰ پاک و قدوس ہے (استثنا ۳۲ : ۴) اور اِنسان ناپاک اور گنہگار ہو گیا - اور خُدا اور اِنسان کی طبائع باہم دِگر متضاد ہو گئیں - اور ضدین کا اجتماع محال ہے - لہٰذا خُدا و اِنسان میں جُدائی واقع ہو گئی - کیونکہ راست بازی اور بے دینی میں کیا میل جول ؟ یا روشنی اور تاریکی

میں کیا شراکت ؟" (۲۔ کرنتھی ۶: ۱۴) اور اِس جُدائی سے مُراد بُعدِ مکانی نہیں۔ کیوں کہ "ہر چند کہ وُہ ہم میں کسی سے دُور نہیں۔ کیونکہ اُسی میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں۔" (اعمال ۲۷: ۲۷-۲۸) بلکہ یہاں جُدائی سے مُراد طبعی ناموافقت ہے۔ (زبُور ۵: ۴ و یسعیاہ ۵۹: ۲) اور خُدا سے جُدائی کا نتیجہ اِنسان کے لئے سب سے زیادہ ہولناک ہے۔

(۳) سزائے عدالت۔ خُدا العادل ہے اور انسان اُس کی عدولِ حکمی کر کے اُس کا مجرم ٹھہرا۔ خُدا کی شریعت کا عدُول کرنا ہی گُناہ ہے۔ (۱۔ یُوحنا ۳: ۴) اب وُہی شریعتِ الٰہی جس کو حضرت اِنسان نے توڑا اُس کو مُجرم ٹھہرا کر اُس پر سزا کا حکم لگاتی ہے۔ اِس لئے کلام فرماتا ہے کہ "شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے" (رومی ۴: ۱۵) اِس لئے گُنہگار ابدی ہلاکت کا سزاوار ہے۔ "اور گُناہ کی مزدُوری موت ہے" (رومی ۶: ۲۳) "اور گُناہ جب بڑھ چُکا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقُوب ۱: ۱۵) اور وُہ موت جو گُناہ کی مزدُوری ہے صرف جسمانی اور طبعی موت نہیں، کیونکہ:-

(۱) اِس صُورت میں جسمانی موت گُناہ کی مزدُوری یا سزا نہیں بلکہ جزا ٹھہرے گی۔ کیونکہ سزا تو موتِ طبعی پر ہی ختم ہو جائے گی۔ اور موت کے بعد ہر نیک و راست و ناراست جنّت کا وارث ٹھہرے گا اور جسمانی موت بہشت میں داخل ہونے کا دروازہ ٹھہرے گی۔

(۲) بہشت میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہو گا کہ گُناہ کریں، تاکہ طبعی موت آئے، اور بہشت میں پہنچا دے، اور نیک کردار لوگ بدنصیب ٹھہریں گے کیونکہ نیکی کرنے سے موت نہ آئے گی اور اُنہیں جنّت کی بجائے اِس دُنیا کے آلام و مصائب میں رہنا پڑے گا۔

(۳) خُدا کی بخشش کوئی چیز نہ ٹھہرے گی۔ اور راست و ناراست ہر دو کو ایک دفعہ موت کے مُنہ میں جانا پڑے گا۔ اور ساری دُنیا کے لئے مرنا ضروری ہے۔ تو اس حالت میں خُدا کی بخشش کیا فائدہ رکھے گی۔ ہر ایک کے لئے ضرور ہے کہ مرے۔ خُدا کی رحمت کسی کا بھلا نہ کرے گی۔

(۴) بچوں کا خورد سالی میں مرنا یہ ثابت کرے گا کہ وہ بالغوں کی بہ نسبت زیادہ گنہگار ہیں۔ کیونکہ اُن کی موت جلد اور قبل از وقت واقع ہوتی ہے۔ جیسے قاتل جو سب سے بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے وہ چور کی بہ نسبت جو چھوٹا مجرم ہے جلد مارا جاتا ہے۔ یعنی اُسے قبل از مرگ پھانسی دی جاتی ہے۔

(۵) پھر بڑے بڑے گنہگاروں کا عرصۂ دراز تک زندہ رہنا یہ ثابت کریگا کہ گناہ کی زیادتی عمر کی درازی کا موجب ٹھہری۔ اور بچوں کا صغر سنی میں مرنا یہ ثابت کرے گا کہ گناہ کی کمی عمر کی کوتاہی کا باعث ہوئی۔

پس ثابت ہُوا کہ گناہ کی مزدوری (موت) جسمانی اور طبعی موت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ رُوحانی موت ہے جس کو انجیل مقدس میں دوسری موت کہا گیا ہے۔ "یہ دوسری موت ہے" (مکاشفہ ۲۰: ۱۴، ۲۱: ۸)۔ خُداوند مسیح نے بھی اس رُوحانی موت (گناہ) کا بیان صاف لفظوں میں کیا ہے۔ "جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرسکتے اُن سے نہ ڈرو۔ بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کرسکتا ہے" (متی ۱۰: ۲۸)۔ جس طرح فطرت کے اسباب خارجیہ کے ساتھ جسم کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہنے سے جسمانی اور طبعی موت آتی ہے، اور قوانین طبعیہ کی مخالفت سے جسمانی موت بطور نتیجہ کے لازمی ٹھہرتی ہے، اسی طرح قوانین رُوحانیہ و اخلاقیہ (احکام و شرائع الٰہیہ)

کی عدولی اور خلاف ورزی رُوحانی موت کا مُوجب ٹھہرتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اشرف وجُود کے فساد سے ادنیٰ وجُود کا فساد لازم آتا ہے۔ اِس لئے رُوح کے فساد سے جسم کا فساد بطور لازم و ملزوم کے ضرُوری ٹھہرا۔ پس جسمانی موت نتیجہ ہے رُوحانی موت کا۔ رُوحانی موت کی علّت گُناہ اور جسمانی موت کی عِلّت رُوحانی موت ہے*۔ اور یہ رُوحانی اِصطلاح ہے۔ خُدا کی زندگی سے خارج ہو کر انسان میں بقا کی تاثیر قائم نہ رہی۔ جیسے ایک برقی تار کا تعلّق پاور ہاؤس سے مُنقطع ہو جاتا ہے۔ پھر اُس میں برقی قُوّت مفقُود ہو جاتی ہے۔ "کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہو گئی ہے۔ اور وُہ اُس نادانی کے سبب جو اُن میں ہے اور اپنے دِلوں کی سختی کے باعث خُدا کی زندگی سے خارج ہیں" (افسی ۴: ۱۸) ایک مچھلی سمندر سے جُدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ گو اُس کے مرنے میں کُچھ عرصہ بھی لگ جائے، تو بھی موت کے قبضہ میں وُہ اُسی وقت سے آجاتی ہے جب سمندر سے جُدا ہو جاتی ہے۔ موت اُس پر آہستہ آہستہ اثر کر کے آخر اُسے فنا کر دیتی ہے۔ اِسی طرح اِنسان جب خُدا سے گُناہ کے باعث جُدا ہو گیا تو اُس کی رُوحانی موت اُسی وقت سے شرُوع ہو گئی، اور اگر کسی صُورت اُس کا خُدا سے ٹُوٹا ہُوا تعلّق پھر سے جوڑا نہ جائے وُہ موت کے یقینی راستہ پر ہے۔ اور ایک وقت ضرُور فنا ہو جائے گا۔ ادنیٰ وجُود ہمیشہ اشرف وجُود کے ساتھ متعلّق رہ کر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس سے جُدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے اُسی طرح رُوح خُدا کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ رُوح سے جُدا ہو کر جسم فنا ہو جاتا ہے، اور خُدا سے جُدا ہو کر رُوح کا فنا ہونا ضرُوری ہے۔ پس رُوحانی موت کے یہی معنی ہیں۔ اب ہم رُوحانی مُردگی کے متعلّق کلامِ مُقدّس کی سُن بھی لیں۔

* روحانی موت سے مُراد رُوح کی فنا یا نیستی نہیں ہے بلکہ خُدا سے جُدا ہونا رُوحانی موت ہے۔

کرتے ہیں، تاکہ ناظرین ہمارے اِس بیان کو محض ذہنی فلسفہ ہی نہ سمجھیں۔ بلکہ جان لیں کہ اِس حقیقت کی بنیاد کلامِ مقدس پر ہے۔ "اور اُس (خدا) نے تمہیں بھی زندہ کیا جب اپنے قصوروں اور گناہوں کے سبب مُردہ تھے" (افسی ۲: ۱) "جب قصوروں کے سبب مُردہ ہی تھے تو ہم کو مسیح کے ساتھ زندہ کیا" (افسی ۲: ۵ و ۶) "اور اُس نے تمہیں بھی جو اپنے قصوروں اور جسم کی نامختونی کے سبب سے مُردہ تھے اُس کے ساتھ زندہ کیا" (کلسی ۲: ۱۳) "پس جب تم مسیح کے ساتھ جلائے گئے" (کلسی ۳: ۱ اور رومیوں ۶: ۵) اور وہ کام جو انسان رُوحانی مُردگی کی حالت میں کرتا ہے کلام اُنہیں "مُردہ کام" کہتا ہے۔ "پس آؤ مسیح کی تعلیم کی ابتدائی باتیں چھوڑ کر کمال کی طرف قدم بڑھائیں۔ اور مُردہ کاموں سے توبہ کرنے اور خدا پر ایمان لانے کی ..... وغیرہ" (عبرانی ۶: ۱) "مسیح کا خون جس نے اپنے آپ کو ازلی رُوح کے وسیلے خدا کے سامنے بے عیب قربان کر دیا تمہارے دِلوں کو مُردہ کاموں سے کیوں نہ پاک کرے گا۔" (عبرانی ۹: ۱۴)۔

اَے ناظرین! ہم نے گُناہ کی حقیقت و ماہیت کی تحقیق و تدقیق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بلکہ نہایت وضاحت سے اُس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ جب تک کسی مرض کی نوعیت و ماہیت کی صحیح تشخیص نہ کی جائے اُس کا علاج محال ہوتا ہے۔ مسیحیت کے باہر تمام فلسفوں نے گُناہ کی ماہیت کے سمجھنے میں غلطی کھائی، اور اُس کے اسباب و موجبات اور نتائج کا صحیح سُراغ لگانے میں قطعی قاصر رہے۔ اِسی واسطے اُن کے نجات کے طریقے ادھورے اور نادرست ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے طریقۂ نجات اور دیگر تمام مذاہب کے طریقِ نجات میں بُعد المشرقین ہے۔ پس اپنے دِل و دماغ کو تعصب سے خالی

کر کے مسیحی طریقۂ نجات پر جو آئندہ صفحوں میں مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے، غور فرمایئے۔

نجات

جس طرح گناہ کے وجود کو تمام مذاہب اور تمام فلسفے کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں، اُسی طرح اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت کے بھی سب بزور قائل ہیں، اور سب مانتے ہیں کہ گناہ سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت پر بحال ہونا لابدی ہے۔ جو شخص صدق دلی سے گناہ کے مسئلہ پر جو ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کیا غور و توغل کرے گا وہ اس حقیقت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب کہ واقعی انسان کی ایسی ابتر حالت ہے تو اُس سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت کا واجبی تقاضا ہے، اور اگر کسی صورت اس ہلاکت آفرین حالت سے آزادی حاصل نہ کی جائے، تو ہلاکت لازمی ہے۔ اور گناہ سے آزاد اور اصلی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر تقربِ الٰہی کو حاصل کرنا ہی نجات ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غیر فطری (گناہ آلودہ) حالت سے کس طرح آزادی حاصل کی جائے۔ اور مقاربتِ الٰہی و مواصلتِ وجودِ لامتناہی کے مشکل سوال کا کیا حل ہے؟
دُنیا کے تمام رائج الوقت مذاہب اور فلسفے اس سوال کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ یعنی حصولِ نجات کے متعلق سب مذاہب کے طریقے باہم متضاد و متباین ہیں، اور اُن میں بُعد المشرقین ہے۔ ان کثیر التعداد عقائد کو دیکھ کر متلاشئ نجات کے دل میں جو دوسرا سوال قدرتی طور پر اُٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ سب عقائد صحیح ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟ اگر سب صحیح ہیں تو ایک شخص

آنِ واحد میں اِن سب متضاد خیالات و عقائد کا کیسے حامی ہو سکتا ہے؟ یہ بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی شخص فی نفسہٖ اِن تمام عقائد کو ایک ہی وقت میں درست تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ یہ سراسر محال ہے۔ اور اگر صرف ایک عقیدہ ہی درست ہے تو وہ کونسا ہے؟ یہ قدرتی سوالات ہیں جو ایک متلاشیٔ حق کے دِل کو بے چین کر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مختصر طور پر یہاں نجات کے متعلق چند مروّجہ عقائد کی تحقیق کریں۔ اور سب سے اوّل دو بدیہی اور مشہور طریقے جو تمام اہلِ دُنیا مشترک طور پر ازالۂ گناہ اور حصُولِ نجات کے لئے قدیم سے عمل میں لاتے رہے ہیں پیش کریں گے۔ ایک اُن میں سے اختیاری اور دُوسرا جبری طریقہ ہے۔

اِختیاری طریقہ

جب سے دُنیا میں گُناہ کا احساس ہُوا ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہُت سے ریفارمر ہر قوم میں پیدا ہوتے آئے جن کا نصب العین یہ رہا کہ اپنی اپنی قوم کو تہدید و تلقین کریں۔ بدی سے روکیں نیکی کی ترغیب دلائیں۔ چوری حق تلفی۔ جھُوٹ فریب۔ زِنا۔ خُون ریزی۔ بدخواہی۔ بداندیشی۔ بے انصافی اور ظُلم وستم وغیرہ گناہوں کو مِٹانے کے لئے مصلحانِ قوم۔ ہادیانِ دین اور مقننانِ زمن نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اپنی جانیں چھڑک دیں۔ اِن عیُوب و ذُنُوب کی مدافعت کے لئے کروڑہا من کتابیں لکھی گئیں۔ ہر زمانے میں تقاریر کی گئیں۔ سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ قومی و مذہبی مجالس وجُود میں لائی گئیں۔ ہر مذہب نے امصار و دیار میں مبلّغ و مبشّر بھیجے۔ مدارس قائم کر کے تعلیم کو تمام کافۂ انام پر پھیلا دیا گیا۔ تہذیب کو ترقّی کی اعلےٰ منازل پر پہنچایا گیا۔ خُدا ترس لوگوں نے بدی کے تخم کو مِٹانے اور نیکی کے

پودے دُنیا میں لگانے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقفِ ایثار کر دیا۔ روزے رکھے گئے۔ نمازیں پڑھی گئیں۔ تہوار منائے گئے۔ متبرک مقامات کی زیارتیں کی گئیں۔ مذہبی رہنماؤں کی سرگرم تقریریں اور دل ہلا دینے والے وعظ و نصیحت ہر زمانے کے لوگوں کے کانوں پر دستک دیتے رہے۔ یہ سب کچھ کس لئے ہوا؟ صرف اِس لئے کہ نوعِ انسان گُناہ کی آہنی زنجیروں سے آزاد ہو کر نیکی اور راست بازی کی جستجو کرے اور حقیقی اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن ذرا انصاف سے کہئے کہ ان سرگرم کوششوں۔ اَنتھک محنتوں اور جگر کاویوں نے کون سے خوشگوار نتائج اب تک پیدا کئے؟ کیا یہ مخلصانہ وسائل گُناہ کے استیصال میں کامیاب ہوئے؟ اور کیا گُناہ کے سیاہ داغوں سے دُنیا کا دامن صاف ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔ گُناہ بیش از بیش موجود ہے بقول "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی"۔

جبری طریقہ

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دُنیا میں راعی و رعیت کا سلسلہ بہت قدیم سے چلا آیا ہے۔ اور بادشاہ کا ہمیشہ یہ کام رہا ہے کہ وہ زورِ بازو سے بدی کو اپنی سلطنت میں سے مٹائے۔ چُنانچہ اِسی مقصد کے ماتحت ہر زمانہ میں بادشاہوں نے تعزیری قوانین بنائے۔ پولیسیں قائم کیں۔ فوجیں تیار کیں۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنائیں۔ پھانسیاں اور شکنجے تیار کئے۔ جیلیں وجود میں لائے۔ خونیوں اور قاتلوں کو پھانسیاں دیں۔ چوروں اور غداروں سے جیلوں کو بھر دیا۔ ڈاکوؤں کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ غرضیکہ شجرِ گُناہ کے استیصال اور جرائم کے اِنسداد کے لئے جبر و تشدد اور رُعب و داب کو بحدِ امکان استعمال کیا گیا۔ مگر چوروں نے قیدخانہ سے نِکل کر پھر چوری پر کمر باندھی۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ڈاکوؤں کو نہایت عبرتناک

طریقوں سے شکنجوں میں کھینچا گیا تو بھی دیکھنے والوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ بلکہ وُہ تمام جرائم و ذمائم اُسی صُورت میں بلکہ اُس سے بھی زیادہ اِس وقت بھی موجُود ہیں۔ کیا جبر اور قوتِ بازُو سے گناہ مِٹ گیا؟ ہرگز نہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جرائم کے تعزیری و اصلاحی طریقِ علاج یقیناً ناقص ہیں۔ کیونکہ وُہ گُناہ کے اصل منبع و مخرج تک نفوذ نہیں کرتے بلکہ اُس کے مظاہر پر مواخذہ کرتے ہیں۔ جس حال کہ انسانی کوشش کے بازُو صدیوں آزمائے گئے، تو اب آیندہ کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ انسانی طاقت گُناہ کی طاقت پر ہرگز غالب نہیں آسکتی۔ اِس لئے کلام فرماتا ہے۔

"ہرچند تُو اپنے کو سجّی سے دھوئے اور بہت سا صابون استعمال کرے۔ تو بھی خُداوند فرماتا ہے۔ تیری شرارت کا داغ میرے حضُور عیاں ہے" (یرمیاہ ۲۔ ۲۲ و ۱۳ : ۲۳)۔

تناسخ ہم ہندوؤں کے ختم نہ ہونے والے مسئلۂ تناسخ کے سلسلہ کی تفصیل سے ناظرین کے صبر و سکُون کا امتحان لینا نہیں چاہتے۔ اِس لئے چند مُختصر مگر معقول دلائل سے یہ ثابت کریں گے کہ عقیدۂ آواگون (تناسخ) کے مطابق گُناہ کی طبیعت سے رہائی اور حقیقی نجات کا حصُول محال ہے۔ یہ محض ایک ذہنی فلسفہ ہے جو عالم اسباب کی ناہمواری اور غیر یکسانیت کو دیکھ کر گھڑا گیا ہے۔ اور جس پر یقین کرنے سے انسان کی رُوحانی پریشانی۔ ذہنی اضطراب اور قلبی بے قراری بدستور قائم رہتی ہے۔ اور وُہ حقیقی اطمینانِ رُوحانی اور تسکینِ قلبی سے قطعی محرُوم رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اِس وہمی مسئلہ کی غیر معقولیت مبرہن ہوتی ہے۔

(۱) اگر تمام موجُودات کا تجزیہ کیا جائے تو دو اجزاء حاصل ہوتے ہیں یعنی

رُوح اور مادہ - اور حامیان تناسخ کا عقیدہ ہے کہ خُدا اِن دونوں چیزوں کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ وُہ دونوں خُدا کے ساتھ قدیم ہیں۔ اِس صُورت میں رُوح و مادہ خُدا کے مُحتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی ہستی کی از خود علّت ہو کر خُدا کے دائرۂ حکومت سے خارج ہیں۔ اِس کے دُوسرے معنی یہ ہُوئے کہ خُدا اِس دُنیا کا خالق نہیں بلکہ صرف ترتیب دہندہ ہے۔ اور جب خُدا اِن (رُوح و مادہ) پر حقِ خالقیت نہیں رکھتا تو اُس کا کیا حق ہے کہ آزاد رُوحوں کے متعلق سزا و جزا کے احکام صادر فرما کر اُنہیں تناسخ کے لامتناہی چکر میں تا ابد گھُماتا رہے؟ اور نہ وُہ کبھی سے استحقاقِ عبادت رکھتا ہے۔

(۲) اگر بالفرضِ محال یہ مان لیا جائے کہ خُدا کو سزا و جزا دینے کا حق حاصل ہے تو اِس صُورت میں اندھوں۔ لنگڑوں۔ مُحتاجوں اور اپاہجوں پر رحم کرنا اور اُن سے ہمدردی کرنا خُدا سے مخالفت و بغاوت کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ خُدا تو اُن کو اُن کے سابقہ اعمالِ بد کے باعث دُکھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور اِنسان ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اور اُن کے دُکھوں کو کم کر کے عدلِ الٰہی کا مخالف اور خُدا کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اِس صُورت میں رحم۔ ہمدردی اور محبّت کے مواقع ہی نہ رہیں گے۔ اور نیکی کا وجُود ہی دُنیا سے نابُود ہو جائے گا۔ کیونکہ نیکی کے مفہُوم میں جتنی باتیں شامل ہیں اُن کا غالب حصّہ مظلُوموں لاچاروں اور بے کسوں ہی سے متعلق ہے۔ پس خُدا کے قیدیوں کو آرام دینا اور اُن کی امداد و معاونت کرنا خُدا کی مخالفت ٹھہرے گی، اور اعمالِ حسنہ (نیک کرم) جن پر تناسخ کی نجات کا مدار ہے ملیامیٹ

ہو جائیں گے۔

(۳) جیو کی طبیعت کو اُس کے متعلقہ جنم کے مطابق بنا دینا کوئی سزا نہیں۔ کیونکہ وُہ تو اُس کی طبعی حالت ہوگی، اور یہ ظاہر ہے کہ طبیعت ہرگز سزا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک غریب مزدُور کو مجُرم ہونے پر یہ سزا دی جائے کہ وُہ سڑک پر پتھر کُوٹا کرے تو یہ اُس کے لئے سزا نہ ہوگی کیونکہ یہ کام وُہ پہلے بھی کیا کرتا ہے، یا کِسی مجُرم کو یہ سزا دی جائے کہ تمُ رات بھر سویا کرو، یہ بھی طبعی بات ہے، اور اِس سے سزا کا مقصد پُورا نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ایک گورنر کو اُس کے جرُم کی پاداش میں سڑک پر پتھر کُوٹنے پر لگا دیا جائے تو اُس کے لئے یہ ضرُور سزا ہوگی۔ کیونکہ اُس کی اپنی شاہانہ طبیعت اور سزا کی نوعیت میں بہُت اختلاف ہے، اور اِس صُورت میں اُس کے نفس کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ مگر سزا کو طبیعت بنا دینے سے نہ تو وُہ سزا ہی رہے گی اور نہ اُس سے کسی اصلاح کی اُمید ہو سکتی ہے۔ تمام حیوانات اپنی حیوانی حالت میں خوُش ہیں۔ اگر کِسی کُتّے یا کِسی اور جانور کو قتل کرنا چاہو تو وُہ اپنے بچاؤ کے لئے فوراً بھاگتا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس جسم (قید) میں وُہ ہے اُس سے آزاد ہونا نہیں چاہتا، بلکہ اُسی میں خوُش ہے۔ جس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وُہ اپنی اُس حالت کو قید۔ بند یا سزا نہیں سمجھتا، بلکہ طبعی حالت۔ پس طبیعت سزا نہیں ہو سکتی، اور اِس طریقہ سے تہذیب النفس اور ارتقاء رُوحانی و اخلاقی کا امکان ہی محال ہے۔

(۴) کسی مجُرم کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگانے اور قید میں بند رکھنے سے دو[۲]

مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو سزا دینا جس سے اُس کی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اور دُوسرے اُس کی آیندہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگا کر اُسے اور جرائم کے ارتکاب سے کچھ عرصہ کے لئے روکنا۔ تاکہ اُس کی مجرمانہ عادت جاتی رہے وُہ پچھلے جرائم کی سزا بھگتتا اور آیندہ جرائم کے ارتکاب کا راستہ اُس پر کچھ عرصہ کے لئے بند کیا جاتا ہے، اور وُہ قید کی حالت میں واقعی کسی اور جُرم کا ارتکاب کرنے کے ناقابل ہوتا ہے، اور کسی دُوسرے کی حق تلفی نہیں کر سکتا۔ یہ اِنسانی حکومتوں کا اِنتظام ہے۔ مگر خُدا کے قیدیوں کا حال دیکھئے کہ وہ قید میں رہ کر بھی دُوسروں کا نقصان کر سکتے ہیں بلکہ اِنصافِ خُداوندی اور اِنتظامِ الٰہی ملاحظہ فرمایئے کہ جرائم کے ارتکاب میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے اُن کی قوّت کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شیر اگر اِس قدر شہزور نہ ہو تو اپنی زندگی میں ہزاروں جانوں کو ہلاک نہ کر سکے۔ اگر شیر کی جُون فی الحقیقت جیو کے لئے کوئی قید ہوتی، تو لازم تھا کہ ایک تو شیر کی قُوّت بہت کم ہوتی، اور دُوسرے اُس میں کسی دُوسرے کو ہلاک کرنے کی قابلیت نہ ہوتی۔ اِس لحاظ سے اِنسانی عدالت و اِنتظام کو الٰہی اِنتظام میں معدلت پر فضیلت حاصل ہے۔ چُونکہ عقیدۂ تناسخ کی رُو سے خُدا کے اِنتظام میں نقص ثابت ہوتا ہے اِس لئے یہ عقیدہ خود سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔

(۵) کسی مُصیبت زدہ اِنسان یا کسی بھی حیوان کو یہ علم نہیں کہ کس خاص گناہ کی پاداش میں وُہ اُس خاص جسم (سزا یا بندھن) میں مقیّد ہے۔ اِس لئے بلا اظہارِ جرم کسی کو سزا دینا ایک تو بے اِنصافی اور ظلم ہے، اور دُوسرے اِس سے مجرم کی اصلاح محال ہے۔ اگر جرم سے آگاہی ہو تو سزا اصلاح کا کام دے سکتی ہے ورنہ نہیں۔

(۶) عقیدۂ تناسخ کے مطابق کُل ۸۴ لاکھ جُونیں (اجناس) مُسلّم ہیں۔ اور انسانی جُون اُن میں سے ایک ہے۔ انسانی جُون کرم جُونی (فعل کی جگہ) ہے۔ اور باقی ۸۳۹۹۹۹۹ جُونیں بھوگ جُونیاں (قیدیں) ہیں۔ جبکہ ۸۴ لاکھ اجناس میں سے ۸۳۹۹۹۹۹ اجناس تو قیدوں میں ہیں اور صرف ایک جنس (انسانی جُون) آزاد ہے۔ اور انسانی جُون میں بھی بیماروں۔ لاچاروں۔ اندھوں لنگڑوں اور مُفلسوں و بیکسوں کی تعداد غالب ہے۔ اور وُہ بھی خُدا کے قیدی ہیں، تو اس صُورت میں قیدیوں کی تعداد آزادوں کی تعداد سے لاکھوں گُنا زیادہ ہُوئی۔ اس کی کوئی بدیہی مثال عالم میں نہیں ہے کہ قیدی آزادوں سے زیادہ ہوں۔ اور وُہ بھی کروڑوں بلکہ سنکھوں کی تعداد میں۔ یہ بھی اِس عقیدہ کے بُطلان کی دلیل ہے۔

(۷) آواگون کی رُو سے کسی نیچ قوم میں پیدا ہونا بھی سابقہ بُرے اعمال کی سزا ہے۔ تو اِس صُورت میں ہندوؤں کا شُدھی سنگھٹن کا ڈھکوسلہ قائم کر کے اچھُوت اُدھار کرنا عدل الٰہی کی مخالفت و بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ خُدا نے اُنہیں سزا دی ہے کہ نیچوں کے گھر پیدا ہوں اور آریہ پرچارک اُنہیں شُدھ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ کیا اندھیر ہے؟ شائد خُدا کی ناراضگی کو اِس امر میں وُہ بھی محسُوس کرتے ہیں، اور اِسی لئے اچھُوتوں کو جھُکے جھانسے دے کر سطحی طور پر شُدھ کرتے پھرتے ہیں، اور در اصل اُن کے ساتھ مُرتبط ہونے سے گھبراتے ہیں۔

بخوفِ طوالت اِتنے ہی دلائل پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور اِسی قدر بیان سے ناظرین پر خُوب روشن ہو گیا ہو گا کہ عقیدۂ تناسخ محض مفرُوضات

و توہماتِ ذہنیہ کا مجموعہ ہے۔ اور حصولِ نجات کے لئے اُس پر اپنے ایمان کی بنیاد رکھنا خُدا کی ہستی سے انکار کرنے کے برابر ہے۔ تناسخ کی نجات مادیات کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور حظائظِ جسمانیہ و لذائذ نفسانیہ کو زندگی کی غایت سمجھا گیا ہے، اور اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ گناہ آلود طبیعت سے حقیقی نیکی کا صدور محال ہے۔ ہم نے اِس بحث کے آغاز ہی میں دو طریقے (اختیاری و جبری) گناہ کی مدافعت کے متعلق درج کئے ہیں، اور اُن میں دکھایا ہے کہ گناہ کا ازالہ انسانی تدابیر سے محال ہے۔ پس جب گناہ ہی کا ازالہ و اندفاع محال ہے تو نیکی کہاں سے آجائے گی؟ جیسے گناہ آلود طبیعت سے گناہ ہی صادر ہوتا ہے، ویسے ہی نیک طبیعت سے نیکی کا حصول لازمی ہے۔ اب ہم اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اعمالِ حسنہ کے بیان میں اِس بحث پر مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

تزکیۂ نفس

گناہ کی موجودگی دُنیا میں ہر قسم کے دُکھ درد۔ رنج و آلام اور مصائب و عقوبت کا باعث ہے اور تمام لوگ دل سے تمنی ہیں کہ کسی طرح اِن جسمانی آلام سے اُن کا دامن چھوٹ جائے، اور حقیقی خوشی اور اطمینانِ قلبی حاصل ہو جائے۔ یہ واقعی بہت سعیدہ خواہش ہے، اور انسان کی ابتدائی پُر سکون و اطمینان فطرت کا واجبی تقاضا ہے۔ لیکن اُس مسرتِ مقصودہ کی نوعیت کے اعتبار سے دو قسم کے خیال دُنیا میں پائے جاتے ہیں، اور اِن خیالات کی حمایت میں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو رُوحانی خوشی اور ابدی مسرت کے جویاں ہیں۔ اور جسم کو حقیر اور ناچیز سمجھ کر اُسے بے دردانہ طور سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں، اور تزکیہ و ریاضتِ جسمانی کو اُس رُوحانی خوشی کے حصول کا

واحد ذریعہ سمجھتے ہیں، اور وجودِ عنصری کو اُس اعلیٰ رُوحانی مقصد کے حصُول میں سدِّراہ سمجھ کر اُس سے ایسی دُشمنی کرتے ہیں کہ بعض دفعہ تو وُہ مجبُور ہو کر طائرِ رُوح کو پرواز کرنے کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ فطرت کے خلاف جہاد ہے اور خُدا کی ناشکرگذاری۔ خُدا نے جب خُود ہی جسم بنایا، اور اُس کے قائم رکھنے کے لئے اِس کارخانۂ قُدرت میں ہر طرح کے سامان پیدا کر دئے۔ کھانے کے لئے خوراک پہننے کے لئے پوشاک۔ بیماریوں کے علاج کے لئے ہر نوع کی جڑی بُوٹیاں اور ادویہ بنا دیں۔ حکماء و اطباء کو حکمت و ذہانت سے بہرہ ور فرمایا تاکہ وُہ انسانی اجسام کو قائم رکھنے کے لئے اِن ادویہ کا دُرست استعمال کر سکیں۔ یہ تمام سامان اِس جسدِ خاکی کی حفاظت اور پرورش کے لئے دیا گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خُدا جسم کی حفاظت کو ضرُوری سمجھتا ہے، اور اُس کی مرضی یہی ہے کہ جسم تادیر قائم رہے۔ اب اگر اِس جسم کو ریاضت کے ذریعہ اذیت دی جائے، اس کی پرورش بند کر دی جائے اور فاقہ کشی اختیار کی جائے تو کیا یہ خُدا کی مرضی کی مخالفت نہ ہوگی؟ ضرُور ہوگی۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جسم کو دُکھ اور اِیذا دینے سے گُناہ جو آلام و مصائب کا مُوجب ہے ہرگز مُردہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے سانپ کے بِل کو مارنے سے سانپ نہیں مر سکتا، اور ترکِ دُنیا سے فعلی اور عملی گُناہوں کا امکان گو مِٹ جاتا ہے، تاہم خیالی اور اِرادی گُناہ سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ جیسے ایک مبرُوص کو دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھنے پر بھی اُس کا مرض دُور نہیں ہوتا۔ ایک سانپ کو دُوسرے سانپوں سے جُدا رکھنے سے اُس کا زہر دُور نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اگر کِسی سانپ کو غیر آباد ویرانے میں چھوڑ آئیں تو اُس کا ڈس لینے کا امکان مِٹ جاتا ہے۔ مگر زہر تو دُور نہیں ہوتا۔

اِسی طرح سے وُہ بُری طبیعت اَور گُناہ کا متوارث اعلان جو نوعِ اِنسانی کے ہر ہر فرد میں موجُود ہے تزکیۂ نفس اَور ترکِ دُنیا سے دُور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اِن ذرائع سے گُناہ کا ازالہ محال اَور نجات کا حصُول ناممکن ہے۔ اِس طریق میں افراط ہے۔

دُوسری قِسم کے لوگ وُہ ہیں جو جسمانی اَور نفسانی خُوشی ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر کسی طرح نجات کے قائل بھی ہیں تو جنّت میں بھی نفسانیات و مادیات کو ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ وُہ نفسِ امّارہ کے یہاں تک غُلام ہو چکے ہیں، کہ رُوحانی خُوشیوں کو بھی نفسانیات پر ہی قیاس کرتے ہیں، اور اِس زندگی کے بعد کسی اعلےٰ رُوحانی زندگی اَور اعلیٰ اَور غیر فانی رُوحانی خوشی کے قائل نہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ " [illegible] کھائیں پئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائیں گے" (۱-کُرنتھی ۱۵: ۳۲) اَور انجیلِ جلیل اُن کے حق میں فرماتی ہے۔ "اُن کا انجام ہلاکت ہے۔ اُن کا خُدا پیٹ ہے۔ وُہ اپنی شرم کی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ اَور دُنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں" (فلپی ۳: ۱۹) "اَور وُہ حق سے محرُوم ہیں اَور دینداری کو نفع ہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں" (۱-تِمُتھِیُس ۶: ۵) اَیسے لوگ اِس دُنیا کی عیش و عشرت اور چند روزہ آرام و خُوشی کو مُکتی اَور نجات سمجھے بیٹھے ہیں۔ تناسخ کے حامی بھی اِسی دُنیا کے آرام و راحت اَور مدارج و معارج کو حقیقی خُوشی سمجھ کر یہ سوال کیا کرتے ہیں، کہ اگر پرماتما نیائے کاری ہے تو اُس نے بعض کو غریب اَور بعض کو امیر کیوں پَیدا کیا، اَور خُوش حالی و تنگدستی کو اِنسان کے گذشتہ جنم کے بھلے یا بُرے اعمال کا نتیجہ مانتے ہیں۔ حالانکہ اِس دُنیا کی جسمانی و نفسانی خُوشی و راحت کسی صُورت نجات کی خُوشی نہیں ہو سکتی، اَور نہ اِس دُنیا کا دُکھ درد خُدا کی عدالت کے باعث ہے۔ یہ چیزیں اگر دُنیا

کو ملتی ہیں تو محض جسم کو کسی عرصہ تک قائم رکھنے کے لئے۔ نیک اعمال
جو خاص رُوح سے متعلق ہیں وہ رُوحانی نجات اور رُوحانی خوشی کا موجب
ہو سکتے ہیں نہ کہ نفسانی وجسمانی خوشی کا۔ اگر یہ تمام فوائد ومنافع کرموں
ہی کا پھل ہیں تو ایسے لاکھوں آدمی موجود ہیں جو دہریہ والدین کے بیٹے
اور دہریہ دادا کے پوتے ہیں۔ لیکن باوجود دہریہ ہونے کے دُنیوی جاہ و
ثروت اور آرام وآسایش وراثتاً اُن کے حصہ میں آتے ہیں۔ یہ سراسر
دھوکا ہے۔ انجیل اس خیال کی بزور مخالف ہے۔ اُوپر کے خیال میں افراط
ہے، اور اِس خیال میں تفریط ہے۔ فریق اوّل جسم کو ناچیز وحقیر سمجھ کر اُس
کو مٹانا چاہتا ہے تاکہ رُوحانی اطمینان کو حاصل کرے۔ اور فریق ثانی جسم
کی بُری خواہشات کا غلام ہے، اور رُوح اور رُوحانی خوشی کی طرف سے قطعی
لاپرواہ ہے۔ اِن دونوں خیالوں میں افراط وتفریط ہے جو کہ معیوب ہے۔
انجیل اِن دونوں خیالات کے بین بین چلتی ہے۔ وُہ ریاضتِ جسمانی کے خلاف
فرماتی ہے۔ "اِن باتوں میں اپنی ایجاد کی ہُوئی عبادت اور خاکساری اور جسمانی
ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صُورت تو ہے۔ مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں
اِن سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔" (کلسی ۲: ۲۳) "دینداری کے لئے ریاضت کر۔ کیونکہ
جسمانی ریاضت کا فائدہ کم ہے۔ لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے۔
اِس لئے کہ اب کی اور آیندہ کی زندگی کا بھی وعدہ اسی کے لئے ہے۔" (۱-تمتھیس
۴: ۷-۸) اور مؤخر خیال کے متعلق انجیل یہ فرماتی ہے "کیونکہ نہ ہم دُنیا میں
کچھ لائے اور نہ کچھ اُس میں سے لے جا سکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے پہننے
کو ہے تو اُسی پر قناعت کریں۔ لیکن جو دولت مند ہونا چاہتے ہیں۔ وُہ ایسی آزمائش
اور پھندے اور بہت سی بیہودہ اور نقصان پہنچانے والی خواہشوں میں پھنستے ہیں۔

جو آدمیوں کو تباہی اور ہلاکت کے دریا میں غرق کر دیتی ہیں۔ (۱۔تمتھیس ۶: ۷-۹۔ زبور ۴۹: ۱۶-۱۷ واعظ ۵: ۱۵-۱۶ و صفنیاہ ۱: ۱۸) "تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔" (متی ۶: ۳۳) پس امورِ معاشرت کوئی نیکی نہیں ہیں اور نہ اِن کو تیاگ دینا ہی نیکی ہے۔ کیونکہ "کھانا ہمیں خدا سے نہیں ملائے گا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں" (۱۔کرنتھی ۸: ۸) پس نجات نہ تو ترکِ دنیا اور تزکیۂ نفس پر منحصر ہے، اور نہ ہی دنیا میں اُلجھے رہنے پر۔ خدا نے نہ تو دنیا تیاگ کرنے کے لئے بنائی ہے، اور نہ اِس لئے کہ انسان زخارفِ دنیا کا غلام ہو جائے اور عاقبت کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر لے۔ اِن انسانی بناوٹوں اور واہی خیالات کو نجات سے کوئی سروکار نہیں۔ اور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نجات کے متعلق جو طریقے اب تک ہم نے پیش کئے وہ سب لوگوں کی اپنی گھڑت ہیں۔ اِسی واسطے لوگوں نے مرضِ گناہ سے رہائی نہیں پائی اور اُن کا قلبی اضطراب اور روحانی بے چینی دور نہیں ہوئی۔

اعمالِ حسنہ

واضح ہو کہ نیک اعمال انسان کے لئے ضروری ہیں۔ خدا اُس سے اِن کا مطالبہ کرتا ہے۔ "تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔ تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں۔" (متی ۵: ۱۶) "کیونکہ ہم اُسی کی کاریگری ہیں۔ اور مسیح یسوع میں اُن نیک اعمال کے واسطے مخلوق ہوئے جن کو خدا نے پہلے سے ہمارے کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔" (افسی ۲: ۱۰) اور شرعِ الٰہی کے مطابق چلنے ہی کا دوسرا نام اعمالِ حسنہ ہے۔ کتبِ مقدسہ کیا ہیں؟ شرعِ الٰہی! شرعِ الٰہی کیا ہے؟ خدا کے احکام و فرامین اور اوامر و نواہی کا مجموعہ! یہ شرعِ الٰہی کس کے

لئے ہے ؟ انسان کے لئے؟ کیا انسان اِس پر پُورا عمل کرتا یا کر سکتا ہے یا نہیں ؟ اِس سوال کا جواب اِس جگہ دیا جائے گا۔ اگر اعمالِ حسنہ کو حصُولِ نجات کی شرط قرار دیا جائے تو اِس صُورت میں انسان سے شریعت کی کامل فرماں برداری مطلوب ہے۔ ایسی کامل اَور بے نُقص نیکی جس میں گُناہ کا قطعی امکان نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا کرنے پر قادر ہو تو اُس کو توبہ و استغفار کی ذرا بھی حاجت نہیں وُہ بلا روک ٹوک سیدھا جنّت میں جا سکتا ہے ۔ اَور ایسے کے متعلّق کہا جا سکتا ہے کہ "تندرستوں کو حکیم درکار نہیں"۔ اور وُہ خُدا کی بخشش کا بھی محتاج نہیں ۔ بلکہ نجات کو اُس نے اپنی ذاتی قُوّت سے خُود کما کر اپنا حق بنا لیا ہے جس سے کوئی اُسے محرُوم نہیں رکھ سکتا۔ "کام کرنے والے کی مزدُوری بخشش نہیں بلکہ حق سمجھی جاتی ہے۔" (رومی ۴: ۴) اِس سے ایک بات یہ حاصل ہوتی ہے کہ خُدا کی بخشش کوئی شے نہیں ۔ اور نہ انسان اُس کی رحمانیت کی ضرورت رکھتا ہے کیونکہ جب نجات اعمال سے کمائی جا سکتی ہے تو خُدا کے رحم و فضل سے فائدہ اُٹھانے کی احتیاج ہی نہیں رہتی ، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے ، کہ کیا انسان کی واقعی ایسی مبارک حالت ہے کہ وُہ جُزوی و کلّی طور پر من و عن شریعت پر عمل کر سکتا ہے ؟ مشاہدہ اَور تجربہ نوعی کی بنا پر کوئی اِس سوال کا جواب اثبات میں دینے کے قابل نہیں ہے۔ مسئلۂ گُناہ کے بیان میں ہم نے بدیہی دلائل سے اِس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ کوئی فردِ بشر گُناہ کی قید سے آزاد نہیں ہے ۔ مرضِ گُناہ ہمہ گیر ہے ، اَور یہ بھی ثابت کر دیا کہ انسان اپنی تجاویز و عوامل کے ذریعے اُس کی قیوُد سے ہرگز آزاد نہیں ہو سکتا۔ جیسے جسمانی صحت جسم کی اصل حالت ہے نہ کہ بیماری ، اَور بیماری

کی مدافعت کی تدابیر سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مریض کو اصل حالت پر لایا جائے۔ اِسی طرح رُوح کی اصلی پاکیزگی ہے اور گُناہ ایک غیر فطری شے اور رُوحانی مرض ہے۔ اِس سے رہائی پانا بھی ضروری اور اصلی فطرت کا واجبی تقاضا ہے۔ اور گناہ کی طبیعت سے آزادی اور نیک و پاک طبیعت کا حصول ہی نجات ہے۔ مسیحیت کے علاوہ قریب قریب تمام مذاہب و فلسفے اعمال حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیتے ہیں، لیکن انجیلی فلسفۂ نجات اُن کے بالکل برعکس ہے:۔

(۱) غیر مذاہب کا عقیدہ ہے کہ نیک اعمال کرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔	نیک اعمال شرط اور نجات مشروط
(۲) مسیحی مذہب کا عقیدہ ہے کہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔	نجات شرط اور نیک اعمال مشروط

نجات کے معنی ہی گُناہ کی قیود سے آزاد ہونا ہے۔ اِس لئے جب تک گُناہ کی طبیعت سے کامل رہائی نہ ملے نیک اعمال کرنا محال ٹھہرے گا۔ دُوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب حضرت اَبُوالبشر سے باوجود ایک ہی گُناہ سرزد ہونے کے یہ نہ ہو سکا کہ حقیقی نیکی (اعمالِ حسنہ) کر کے دوبارہ جنّت العدن (خُدا کی قُربت) کو حاصل کر لیتا؛ تو اب مُدتوں تک طبائع اِنسانی کے ساتھ عناصرِ گُناہ کے باہم تاثر و تاثیر اور انجذاب و تجذیب کرتے رہنے کے بعد کہاں مُمکن ہے کہ انسان ضعیف البیان اور تپلۂ سہو و نسیان حقیقی نیکی کر سکے۔ جب چند روز کے بُخار کے بعد مریض دو من بوجھ اُٹھانے کی استعداد نہیں رکھتا، تو بھلا برسوں مرضِ مُوذی کے تھپیڑے کھانے کے بعد کہاں مُمکن ہے کہ وُہ دو من بوجھ اُٹھا سکے۔ جب معمدا

اَور مخرج (طبعِ اِنسانی) ہی ناپاک ہے تو اُس سے نیکی و پاکی کا صدُور چہ معنی دارد؟ کیا کھاری چشمے سے آبِ شیریں برآمد ہو سکتا ہے؟ (یعقوب ۳:۱۲) گُناہ آلُود طبیعت سے بے نقص نیکی کا صدُور ایسا ہی محال ہے جیسے جُون اور دسمبر کے مہینوں کو مِلا کر ایک مُعتدل موسم پیدا کرنا محال ہے۔ پس اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دینا باطل ٹھہرا۔ اَور خُدا کی یہ آواز ہے کہ "شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راستباز نہ ٹھہرے گا" (گلتی ۲:۱۶) اَور گُناہ سے نجات حاصل کئے بغیر شریعت پر عمل کرنا ہی ناممکن ہے۔ "کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شریعت تو رُوحانی ہے۔ مگر میں جسمانی اَور گُناہ کے ہاتھ بِکا ہُوا ہُوں" (رومیوں ۷:۱۴)۔ اَور اگر فرامینِ الٰہی پر عمل کرنے کے لئے کمرِ ہمت کس بھی لیتا ہے۔ اَور چند نیک کام کر کے اپنے دِل میں خُوش ہوتا ہے، تو آوازِ الٰہی یہ کہہ کر اُس کی کمرِ ہمت کو توڑ دیتی ہے، کہ ابھی "ایک بات کی تجھ میں کمی ہے" (مرقس ۱۰:۲۱) "کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز اِنسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اَور خطا نہ کرے" (واعظ ۷:۲۰)۔ خُدائے قدُوس و برحق جو نیکی و پاکیزگی کا سرچشمہ ہے ہم سے ایسی بے نقص بے داغ اَور کامل نیکی طلب کرتا ہے جس میں "ایک بات کی بھی کمی نہ ہو" اَور اِس قسم کی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی و نیکی کا نمونہ خُداوند مسیح کی بیداغ رفتار و گُفتار اَور بے عیب زندگی میں ملتا ہے۔ ایسی نیکی بلاشُبہ نجات کا استحقاق دِلا سکتی ہے۔ مگر کون ایسی نیکی کا سرمایہ دار ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ مانا کہ بعض خُداپرست اَور پرہیزگار لوگ عملی و فعلی گُناہوں سے کسی حد تک بچے رہ سکتے ہیں، لیکن اِرادی اَور خیالی گُناہوں سے کسی کو تنزہِ تام حاصل نہیں ہے۔ چوری۔ خُون ریزی۔ حق تلفی۔ بدگوئی اَور بددیانتی وغیرہ بد افعال تو گُناہ کا عملی ظہور ہیں۔ گُناہ اِنسان کی طبیعت کو عارض ہے۔ اگر یہ افعال

ظہور میں نہ بھی آئیں تو بھی انسان کی طبیعت کی سفلیت و کراہیت کا انکار محال ہے۔ گناہ کا منبع انسان کے اعماقِ قلب میں ہے۔ اور خدا باطن کی صفائی چاہتا ہے نہ کہ ظاہر کی۔ "دیکھ تو باطن کی سچائی پسند کرتا ہے" (زبور ۵۱: ۶) اس لئے خدا ہماری باطنی ناپاکی۔ بداندیشی اور بدخیالی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ جب تک انسان اور خدا میں طبعی مطابقت و موافقت نہ ہو جائے انسان خدا کو پسند نہیں آ سکتا۔ انسان کا ارادہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو، پھر بھی اُس سے طبعی ناپاکی کا ازالہ محال ہے۔ "کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا ہوں" (رومی ۷: ۱۸-۱۹) یہ ہے انسان کی باطنی تیرہ حالت کی اقرب الی الفطرت تصویر۔ اکثر لوگ اوامر پر عمل کرنے اور نواہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ "دشمنوں سے محبت کرو" یہ امر ہے۔ لوگ اپنے بدخواہوں سے ظاہری محبت کا اظہار کر کے سمجھتے ہیں۔ کہ ہم اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ پھر خدا کہتا ہے کہ "نیکی کر کے جتاؤ نہ" یہ نہی ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ بعض اوامر کی تعمیل کرتے اور نواہی کو ٹال دیتے، اور بعض نواہی کو مان لیتے اور اوامر کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور کلام کا فرمان ہے کہ "جو کوئی بھلائی کرنی جانتا ہے اور نہیں کرتا اُس کے لئے یہ گناہ ہے" (یعقوب ۴: ۱۷) ایسی جامع اور کامل نیکی انسان سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ "کیونکہ جس نے ساری شریعت پر عمل کیا، اور ایک ہی بات میں خطا کی وہ ساری باتوں میں قصور وار ٹھہرا۔ اس لئے کہ جس نے یہ کہا کہ زنا نہ کر۔ اُسی نے یہ بھی کہا کہ خون نہ کر۔ پس اگر تُو نے زنا تو نہ کیا، مگر خون کیا، تو بھی تُو شریعت کا

عدول کرنے والا ٹھہرا" (یعقوب ۲: ۱۰-۱۱) یہ درست ہے کہ نیک عمل کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ نجات نیک اعمال سے حاصل ہوتی ہے اس لئے جو لوگ اعمالِ حسنہ کو حصولِ نجات کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں ان کے متعلق انجیلِ مقدس کا یہ فرمان ہے کہ "جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی اُن سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں۔ وہ لعنتی ہے" (گلتی ۳: ۱۰) شریعت سے گنہگار کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی مددگار نہیں بلکہ مجرم ٹھہرانے والی ہے۔ ایک شخص جب خون کر چکا تو تعزیرات ہند سے اُس کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ وہ اُسے مجرم ٹھہرا کر موت کا فتویٰ اُس پر لگاتی ہے۔ "کیونکہ شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے اور جہاں شریعت نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں" (رومی ۴: ۱۵) شریعت شاقول ہے۔ جس طرح شاقول دیوار کا ٹیڑھا پن دکھا سکتا ہے اور اُس کو سیدھی نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح شریعت اِنسان کی کجروی کو ظاہر کر سکتی ہے اور اُس کی درستی و اصلاح ہرگز نہیں کر سکتی۔ شریعت آئینہ ہے۔ جس طرح آئینہ چہرے کے بدنما داغ دکھا دیتا ہے پر اُن دھبوں کو دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح "شریعت کے وسیلے تو گناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے" (رومی ۳: ۲۰ و یعقوب ۱: ۲۳-۲۴) شریعت ترازو ہے۔ ترازو کسی وزن کی کمی بیشی کو ظاہر کر دیتا ہے لیکن خود اُسے پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے شریعت کا فرمان گنہگار انسان کے حق میں یہ ہے کہ "تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا" (دانی ایل ۵: ۲۷) شریعت چراغ ہے "کیونکہ فرمان چراغ ہے اور تعلیم نور" (امثال ۶: ۲۳ و زبور ۱۱۹: ۱۰۵) اگر چراغ کو رات کے وقت کسی گندے اور غلیظ مکان میں لایا جائے تو وہ

اُس کی گندگی اور غلاظت وغیرہ کو ظاہر کر دیتا ہے اُسے دُور نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح شریعت چراغ کی مانند اِنسان کی باطنی گناہ آلودہ مکروہ حالت کو اُس پر ظاہر کر دیتی ہے اور اُس حالت سے اُسے آزاد نہیں کر سکتی۔ جس طرح تھرمامیٹر صرف یہ دکھا دیتا ہے کہ بخار کتنے درجہ کا ہے اور بخار کو دُور نہیں کرتا۔ اِسی طرح شریعت اِنسان پر یہ روشن کر دیتی ہے کہ وُہ گناہ کا مریض ہے، لیکن مرضِ گناہ سے آزاد نہیں کر سکتی۔ البتہ وُہ گنہگار کو گناہ کا قائل کر کے اور نجات (گناہ سے رہائی) کی ضرورت محسُوس کروا کے کسی طبیبِ رُوحانی کا متلاشی بنا دیتی ہے، اور "شریعت کے بغیر گناہ مُردہ ہے" (رُومی ۷: ۸)۔ کیونکہ "جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسُوب نہیں ہوتا" (رُومی ۵: ۱۳)۔ چنانچہ شریعت خُداوند کریم نے بخشی تھی اور تمام دُنیا نے اُس کا عدُول بھی کر دیا۔ اب وُہ شریعت اگر دُنیا کو مجرم نہیں ٹھہراتی تو اور کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ حماقت نہیں کہ جس شرع (قوانینِ الٰہی) کا عدُول کیا اُسی کا پھر سہارا ڈھونڈا جائے؟ جب ایک شخص نے چوری کر لی تو تعزیرات کی عدُولی کی۔ اب اگر وُہ تعزیرات کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر خُوشی کے نعرے لگاتا پھرے تو کون ہے جو اُسکو سِڑی اور دیوانہ نہ سمجھے گا؟ جس کتاب پر وُہ فخر کرتا ہے وُہی اُس کو مجرم ٹھہرا کر تین سال کی سزا دلواتی ہے۔ پس کوئی دھوکے میں نہ رہے۔ کُتبِ مُقدسہ یا شریعت کسی کی حمایت و رعایت نہ کرے گی، اور وُہ کمزور ہونے کے باعث گنہگار کی مدد کرنے میں قاصر ہے۔ اِس لئے کہ جو کام شریعت جسم کے سبب کمزور ہو کر نہ کر سکی وُہ خُدا نے کیا" (رُومی ۸: ۳)۔ "کیونکہ اگر کوئی ایسی شریعت دی جاتی جو زندگی بخش سکتی، تو البتہ راستبازی شریعت کے سبب سے ہوتی" مگر کتابِ مُقدس نے سب کو گناہ کا ماتحت کر دیا" (گلتی ۳: ۲۱-۲۲)

پس شریعت زِندگی نہیں بخش سکتی بلکہ سب کو ایک ساتھ مُجرم ٹھہرا کر غضبِ الٰہی کے ماتحت کرتی ہے اور کہتی ہے۔" اِس لئے کہ سب نے گُناہ کیا اور خُدا کے جلال سے محرُوم ہیں۔" (رومی ۳: ۲۳)

اب شاید کوئی کہے کہ پھر تو شریعت بہت بُری چیز ہے جو اِنسان کے ساتھ اَیسا شدید ظالمانہ برتاؤ کرتی ہے۔ اور سب کو غضبِ الٰہی کے ماتحت کر کے سزاوارِ دوزخ بناتی ہے۔ جنابِ من! شریعت ہرگز بُری نہیں بلکہ شریعت کو عدُول کرنے والے بُرے ہیں۔ جس طرح تعزیراتِ ہند بُری چیز نہیں بلکہ چور۔ زانی۔ فریبی۔ باغی۔ خُونی اور ظالم بُرے ہیں۔ آئینہ بُرا نہیں زنگی کی شکل بُری ہے۔ بخار کے مریض کی طبیعت بگڑ جانے کے باعث اُس کو پانی اور کھانا کڑوے معلُوم ہوتے ہیں۔ پر دراصل پانی اور کھانے میں کوئی نُقص نہیں ہوتا بلکہ مریض کی اپنی طبیعت میں فساد کے باعث وُہ کڑوے معلُوم ہوتے ہیں۔ اِسی طرح اگر مریضانِ گُناہ کو شریعتِ الٰہی خلافِ طبع اور بُری معلُوم ہو تو کیا تعجب ہے۔ یہ اُن کی اپنی رُوحانی فطرت کے فساد کا نتیجہ ہے۔ شریعت گُنہگار کے لئے اِس لئے فائدہ مند نہیں کہ وُہ اُس کی اپنی حالت اور طبیعت کے مخالف ہے۔ مثلاً سُورج اچھی چیز ہے پر اُلّو کو اُس سے کُچھ فائدہ نہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی چیز ہے مگر اندھے کو اُس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ موسیقی ایک رُوح پرور اور جان نوازشے ہے مگر بہرا اُس سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔" مگر ہم جانتے ہیں کہ شریعت اچھی ہے۔ بشرطیکہ کوئی اُسے شریعت کے طور پر کام میں لائے۔ یعنی یہ سمجھ کر کہ شریعت راستبازوں کے لئے مقرر نہیں ہُوئی۔ بلکہ بے شرع اور سرکش لوگوں اور بے دینوں اور گنہگاروں اور ناپاکوں اور رِندوں اور ماں باپ کے قاتلوں۔ اور خُونیوں۔ اور حرام

کاروں اَور لونڈے بازوں - اَور بردہ فروشوں - اَور جھوٹوں اَور جھوٹی قسم کھانے والوں - اور اِن کے سوا صحیح تعلیم کے اور برخلاف کام کرنے والوں کے واسطے ہے " (۱ - تمتھیس ۱ : ۸ - ۱۰) پس شریعت تو گناہ کی کراہیت کو اِنسان پر روشن کرتی ہے اَور گناہ کو مٹا نہیں سکتی - ناظرین سے درخواست ہے کہ وُہ رُومی ۷ : ۷ - ۲۵ تک ضرُور غور سے مطالعہ کریں - شریعت خُدا کی طبیعت اَور مرضی کا آئینہ ہے - اَور اُس کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ تجاوز بھی سزا لازمی ٹھہراتا ہے - جس نے شریعت کے تمام احکام کا عدُول کیا وُہ خُدا کا مخالف ٹھہرا - اَور جس نے صرف ایک حُکم سے تجاوز کیا وُہ بھی مخالفِ خُدا ٹھہرا - پس اَے ناظرین اعمالِ حسنہ سے نجات کی اُمید رکھنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے -

اہلِ اسلام کا خیال ہے کہ " نیکیاں دُور کرتی ہیں بدیوں کو " (سورۃ ہود آیت ۱۱۵) چونکہ یہ مضمُون ہمارے اِس مبحث سے تعلق رکھتا ہے - اِس لئے مناسب ہے کہ ہم اِس جگہ اِس خیال کو بھی پرکھیں - اَور دیکھیں کہ نیکیوں کو بدیوں کا مبادلہ ٹھہرانا یا نیکیوں کے ذریعے بدیوں کو مٹانا کہاں تک ممکن ہے - اِس میں کوئی شک نہیں کہ نیکی کرنا - اِنسان کا فرض ہے - مگر یہ خیال خلافِ عقل ہے کہ " نیکیاں بدیوں کو دُور کرتی ہیں " کیونکہ جہاں تک اِنسان نیکی کرتا ہے وُہ اپنا واجبی فرض ادا کرتا ہے نہ کہ کچھ زائد الغرض - نیکی کرنا تو اِنسان کا فرضِ عین ہے - نہ کہ خُدا پر احسان - " اگر تُو صادق ہے تو اُس کو کیا دے دیتا ہے - یا اُسے تیرے ہاتھ سے کیا مِل جاتا ہے ؟ " (ایُّوب ۳۵ : ۷) خُداوند مسیح نے فرمایا : " تُم بھی جب اُن سب باتوں کی جن کا تمہیں حُکم ہُوا تعمیل کر چکو - تو کہو کہ ہم نِکمّے نوکر ہیں - جو ہم پر کرنا فرض تھا وہی کیا ہے " (لُوقا ۱۷ : ۱۰) گناہ اپنی جگہ رہ کر اِنسان کو مُجرم ٹھہراتا ہے اور نیکی اپنی واجبی جگہ پر رہ کر محض ادائیگی فرض ہے

نہ کہ زائد الفرض کام۔ فرض کرو کہ ایک شخص ایک وقت دیانتداری سے دس روپے کماتا ہے۔ اور دُوسرے وقت بددیانتی سے دس روپے چُرا لیتا ہے، تو عدالت اُس کو اِس خیال سے رِہا نہ کرے گی کہ اُس نے چوری سے پہلے دس روپے محنت کر کے کمائے تھے۔ یا اِسی مثال کو اُلٹ کر لو، کہ پہلے وُہ دس روپے چُرا لے اور اُس کے بعد ہی محنت سے دس روپے کما لے۔ تو اُس کا مُؤخر فعل مُقدم فعل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اُس کی نیک کمائی سے حاکم پر کچھ احسان نہیں ہُوا، بلکہ اُس کا ذاتی فائدہ ہُوا۔ لیکن اُس کی چوری اُس کی سزا کا مُوجب ٹھہری۔ دونوں قِسم کے (نیک و بد) افعال ایک دُوسرے کا بدل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اپنی اپنی جگہ پر وہ کریا تو مُجرم ٹھہراتے ہیں اور یا بے قصُور۔ تعزیراتِ ہند پر عمل کرنا ہر ہندو یا پاکستانی کا فرض ہے نہ کہ زائد الفرض کام۔ عاملِ تعزیرات کو سرکار انعام نہیں دیتی لیکن قانون شکن کو ضرُور سزا دیتی ہے۔ اگر یہ درُست مان لیا جائے کہ نیکیاں بدیوں کو دُور کرتی ہیں، تو وُہ چور راست باز سمجھا جانا چاہیئے جو چوری کر کے اُس مالِ مسرُوقہ میں سے کچھ حصہ غُرباء کو خیرات کر دیتا۔ یا مسجد و مندر کی تعمیر پر لگاتا ہے۔ ایک کسبی اگر اپنی ناپاک آمدنی میں سے ایک خاص رقم کسی مسجد کی مرمت پر خرچ کرتی یا محتاجوں کو کھانا کھلا دیتی ہے تو کیا اُس کی ایسی خیرات اُس کی حرام کاری کے گُناہ کو دُور کر سکتی ہے، اور کیا خُدا اُس کی بدکردار زندگی حالت کے باوجُود صرف ایسی گُناہ آلُود نیکی کے عوض میں اُسے جنت میں داخل کر لے گا؟ اگر نیکیاں یہی ہیں تو کسی کو دوزخ کے خیال سے ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اِس صُورت میں یقیناً حصُولِ نجات کے کام سے آسان تر کام دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اَے ناظرین! اگر آپ ایسے بےبُنیاد خیالات

کے حامی ہیں تو یقیناً آپ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ نجات کے صراط المستقیم کو چھوڑ کر ایک ہلاکت خیز راستہ پر گامزن ہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنے کے لائق بات ہے، کہ نجات سے صرف بہشت کی خوشیاں ہی مُراد نہیں ہیں، بلکہ نجات کے معنی ہیں ناپاک طبیعت سے رہائی اور پاک طبیعت کا حصول۔ بہشت کی رُوحانی و غیر فانی خوشیاں تو نجات کے ساتھ مشروط ہیں۔ یعنی بہشت (قربتِ الٰہی) میں داخل ہونے سے پیشتر پاک طبیعت (نجات) کو حاصل کر لینا ضروری ہے، تاکہ انسان اور خُدا کی طبائع میں مطابقت قائم ہو جائے۔ ہمارے اس دعوے سے کہ نجات اعمالِ حسنہ سے حاصل نہیں ہو سکتی یہ معنی ہوئے کہ نیک اعمال کرنے سے پاک طبیعت (نجات) حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر پاک طبیعت حاصل ہو جائے تو نیک اعمال خود بخود بطور لازمی نتیجہ کے اُس سے صادر ہوں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھیئے کہ صرف گناہ کے نتائج (سزائے دوزخ) سے بچنا ہی نجات نہیں، بلکہ خود گناہ کے قبضہ سے ناپاک طبیعت سے آزاد ہونا نجات ہے۔ اب شائد کوئی یہ کہے کہ نجات تو اعمالِ حسنہ کے ساتھ مشروط ہے۔ اور اگر کچھ بدیاں بھی ہوتی رہیں تو خُدا رحیم و آمرزگار ہے وہ اُن کو بخشدے گا، اور نیکیوں کو نجات کے حساب میں محسوب کر لے گا۔ تو واضح ہو کہ کوئی فخر اعمال کے ساتھ خُدا کے رحم و بخشش کا اُمیدوار ہو تو وہ رحم کا حقدار نہیں۔ رحم کا حقدار وہ ہو سکتا ہے جو واقعی قابلِ رحم ہو اور جو اپنی لاچاری و بے کسی کا اظہار خُدا کے سامنے یُوں کرے کہ "اے خُداوند کریم۔ تُو جو رحم و فضل کا سرچشمہ ہے مجھے اپنے فضل ہی سے نجات دے۔ کیونکہ میرے اپنے اعمال اس قابل نہیں کہ میں اُن کے ذریعے نجات کا حقدار

ہوسکوں"۔ اگر نجات کو نیک اعمال کے ساتھ مشروط ٹھہرایا جائے تو اِس کا محال ہونا ہم اچھی طرح ثابت کر چکے، اور اگر فضل سے مانو تو اعمالِ حسنہ کو شرطِ نجات ٹھہرانا محال ہوگا کیونکہ " اگر فضل سے برگزیدہ ہیں تو اعمال سے نہیں۔ ورنہ فضل فضل نہ رہا۔" (رومی ۱۱: ۶) اگر کوئی اِس تمام بیان سے یہ نتیجہ نکالے کہ ہم نے اعمالِ حسنہ کو بُرا قرار دے کر اُن سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی ہے۔ تو وُہ سخت غلطی میں مُبتلا ہے۔ اور اُس نے ہمارے منشاء کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ واضح ہو کہ نیک اعمال کرنا ہر انسان کا فرضِ عین ہے۔ حقِ انسانیت ہے، اور اگر کوئی نیکی سے نفرت کرے تو وُہ ضرور گُناہ کو پیار کرتا ہے۔ اور ایسا شخص خُدا کا مخالف ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیئے کہ نجات اعمالِ حسنہ کا پھل نہیں ہے۔ بلکہ اعمال حسنہ نجات کا پھل ہیں۔ اِس لئے جب تک نجات (گُناہ سے رہائی) حاصل نہ ہو حقیقی نیکی انسان سے نہیں ہو سکتی۔ اور گُناہ آلُود طبیعت سے رہائی (نجات) حاصل کرنا انسانی کوشش سے محال ہے۔ اعمالِ حسنہ سے نجات کے امکان کا سامعہ فریب جُملہ ہماری تسلی نہیں کروا سکتا۔ اِس لئے اِس غلط خیال کو پہلی فُرصت میں اپنے ذہن و دِل سے خارج کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

توبہ محض مذہبیات میں توبہ کا درجہ تمام باتوں سے افضل ہے اور طالبِ نجات کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وُہ اپنے گُناہوں سے توبہ کرکے خُدا کی طرف مائل ہو۔ جب گنہگار انسان شریعت کی روشنی میں اپنی باطنی مکرُوہ حالت کو دیکھتا ہے تو اُس کو اپنی اُس حالت سے نفرت ہوجاتی، اور وُہ اپنے گُناہوں سے دِل شکستہ ہوکر پچھتاتا اور آئندہ اُس حالت میں رہنا نہیں چاہتا، بلکہ اُس سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔

ایوب نبی فرماتا ہے "اس لئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے۔اور میں خاک اور راکھ میں توبہ کرتا ہوں"۔(ایوب ۴۲: ۶) اور خدا توبہ سے بہت خوش ہوتا، اور تائب دلوں کو پسند کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔(یسعیاہ ۵۵: ۷حزقی ایل ۱۸: ۲۱۔۲۳ یوایل ۲: ۱۲۔۱۳ ملاکی ۳: ۷ لوقا ۱۵: ۷۔ اعمال ۲: ۱۹ و ۲۔کرنتھی ۷: ۱۰ و ۲۔پطرس ۳: ۹) توبہ ایک ایسی چیز ہے جو خدا کے رحم و فضل کو جوش میں لاتی ہے۔لیکن اگر کوئی گناہ پر اس لئے کمربستہ ہو جائے کہ وہ دمِ نزع توبہ کر کے نجات کا حقدار ہو جائے گا تو جان لیجئے کہ وہ ایک سنگین غلطی میں مبتلا ہے۔توبہ کے معنی ہیں سابقہ بد کرداریوں پر پچھتانا اور آئندہ اُن سے باز رہنے کا تہیہ کرنا۔توبہ محض حصولِ نجات کے لئے کافی نہیں ہے، قوانینِ طبیعہ کا مقنن خدا تعالےٰ ہے۔اس لئے وہ خدا کی ذاتی طبیعت کے مخالف نہیں بلکہ مطابق ہیں۔اور اُن سے خدا کی صفتِ عدل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر قوانینِ طبیعہ کو خدا کی طبیعت کے نقیض مانا جائے تو خدا اُن کا مقنن ہرگز نہیں ہو سکتا۔کیونکہ ایک نقیض دُوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قانونِ کشش زمین سے اس صورت میں تجاوز کرے کہ کسی بلندی سے اپنے آپ کو گرا دے، تو اُس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی اب اگر وہ اپنے اس فعل ناکردنی پر متاسف ہو کر پچھتائے اور آئندہ ایسے فعل سے باز رہنے کا تہیہ کرے اور احتیاط کو کام میں لائے، تو اُس کی اس توبہ اور پچھتاوے سے اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ تو بحال نہ ہو جائے گی بلکہ تادمِ مرگ وہ لنگڑا رہے گا۔ہاں اگر آئندہ محتاط رہے تو مزید نقصان سے بچا رہے گا۔اسی طرح توبہ محض سے گذشتہ گناہوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ہزار روپے کا قرضدار ہے اور باعث ناداری ادا کرنے کے ناقابل

ہے۔ اب وُہ پچھتاتا ہے کہ کیوں قرض لیا۔ لیکن اِس پچھتاوے سے اِتنا تو ہو سکتا ہے کہ وُہ آیندہ کو قرض سے اِحتراز کرے۔ تاہم توبہ سے ہزار روپیہ کا قرض دُور نہیں ہو سکتا۔ وُہ ادا کرے اور آیندہ قرض سے پرہیز کرے۔

پس اِنسان کے توبہ سے پہلے کے گُناہوں کو خُدا عدل میں لائے گا۔ کیونکہ "خُداوند قہر کرنے میں دھیما اور قُدرت میں بڑھ کر ہے۔ اور مُجرم کو ہرگز بری نہ کرے گا۔" (ناحُوم ۱: ۳ و خرُوج ۳۴: ۷) اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی تائب کی بعد کی زندگی اَیسی بے نُقص، بے داغ اور کامل ہو کہ جس میں خطا کا مطلق امکان نہ رہے۔ سابقہ قرض اِنسان ادا نہیں کر سکتا اور توبہ کے بعد کامل نیکی اُس سے صادر نہیں ہو سکتی تو کِس صُورت خُدائے قدُوس و تبارک و تعالےٰ سے ملاپ ممکن ہے؟ لہٰذا توبہ محض سے جُدائی کی وُہ سنگین دِیوار جو گُناہ کے باعث اِنسان اور خُدا کے درمیان حائل ہے ٹُوٹ نہیں سکتی۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ توبہ کرنا بُرا کام ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ نجات کو مشروط بالتوبہ محض ماننا غلطی ہے۔ ہم آغاز ہی میں عرض کر چکے کہ مذہب میں توبہ سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جِس طرح نیکی کرنا ہر اِنسان کا فرض ہے اُسی طرح توبہ کرنا بھی ہر گنہگار کے لئے ضروری ہے۔ توبہ کے ذریعے ہم نجات کو اپنا حق نہیں بنا سکتے، بلکہ خُدا اپنے رحم و فضل سے ہمیں اُس کے حقدار بنا سکتا ہے۔ اور تائب اِنسان خُدا کی بخشش کا اُمیدوار تو ہو سکتا ہے مگر حقدار نہیں ہو سکتا۔ "پس توبہ کرو اور رجُوع لاؤ تاکہ تمہارے گُناہ مٹائے جائیں اور اِس طرح خُداوند کے حضُور سے تازگی کے دِن آئیں" (اعمال ۳: ۱۹) توبہ نجات کی تمہید ہے۔ توبہ ابتدا اور نجات اُس کی اِنتہا ہے بشرطیکہ توبہ حقیقی ہو۔

عدل و رحم

خُدا عادل ہے اور رحیم و مہربان بھی۔ اُس کی جِتنی بھی صفات

ہیں وُہ سب ذاتی اَور قدیم ہیں۔ اِکتسابی اَور حادث نہیں۔ وُہ کبھی اپنی ایک
صِفت کو چھوڑ کر دُوسری صِفت کا اظہار نہیں کرتا۔ جب وُہ کِسی پر رحم فرماتا
ہے تو عدل کو چھوڑ کر رحم نہیں فرماتا۔ بلکہ اُس کا رحم و عدل دوش بدوش
چلتے ہیں۔" لیکن جو فخر کرتا ہے اُس پر فخر کرے کہ وُہ سمجھتا اَور مجھے جانتا ہے۔ کہ مَیں
ہی خُداوند ہُوں جو دُنیا میں شفقت و عدل اَور راستبازی کو عمل میں لاتا ہُوں کیونکہ
میری خُوشنُودی اِن ہی باتوں میں ہے۔ خُداوند فرماتا ہے" (یرمیاہ ۹: ۲۴)۔ آپ اپنی
تمام فصاحت و بلاغت کو تمام فلسفہ و منطق کو صَرف کر دینے کے باوجُود بھی
خُدا کی صفات کو ہرگز تبدیل نہیں کر سکتے۔ خُدا عادل ہے اَور اُس کی صِفت
عدل ہرگز رحم میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ خُدا رحیم ہے اَور اُس کی صفتِ
رحمانیت ہرگز عدل میں تبدیل نہیں کی جا سکتی جِس طرح خُدا کا سمیع و
بصیر ہونا واحد مفہُوم نہیں رکھتا، اُسی طرح عدل و رحم کا مفہُوم واحد
نہیں۔ اَور اِسی طرح خُدا کا عادل ہونا اَور بات ہے اَور رحیم ہونا اَور بات
اَور دونوں صفات کا تقاضا پُورا ہونا ضرُوری ہے۔ خُدا کی یہ دونوں صِفات
اپنا اپنا عمل برمحل دکھاتی ہیں۔ اگر گُناہ و سزا لازم و ملزُوم ہیں تو کوئی شخص
بھی سزائے دوزخ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر لازم ملزُوم نہیں تو سزا اور عدالتِ
الٰہی کا اِنکار لازم آئے گا، اَور گُناہ کوئی مکرُوہ اَور قابلِ نفرت شَے نہ رہیگا۔ اِس
صُورت میں ایک تو عدلِ الٰہی پر دھبہ پڑتا ہے، اَور دُوسرے راستبازوں
و خُدا ترسوں کا راہِ خُدا میں ریاضت کرنا اَور دُکھ اُٹھانا فضُول اَور لاحاصِل
ٹھہرتا ہے۔ اَور کوئی گنہگار گُناہ سے ہرگز نفرت نہیں کر سکتا۔ پس گُناہ و سزا
ضرُور لازم و ملزُوم ہیں۔ اِسی واسطے سب دُنیا عدلِ الٰہی کے ماتحت سزائے
دوزخ کی مستحق ہے۔ اگر خُدائے عادل گنہگار کو بلامعاوضہ مُعاف کرے تو

وُہ عادل نہ رہا بلکہ راحم محض۔ اگر عدل کرے تو تمام دُنیا سزائے دوزخ کی مستحق ہے۔ ایک بھی بچ نہیں سکتا، اور خُدا عادل محض ٹھہرا۔ بے شک رحم کا درجہ عدل سے افضل ہے (یعقوب ۲: ۱۳) تاہم حقیقی راحم کے لئے عادل ہونا شرط ہے۔ یعنی رحم بلا عدل نہ صرف راستی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ مثلاً زید نے تلوار سے بکر کا بازُو کاٹ دیا اور بکر نے عدالت میں زید پر نالش کر دی۔ اب اگر حاکم ازرُوئے رحم زید کو بلا مبادلہ رہا کر دے تو بکر پر ظلم ہوگا۔ یعنی زید پر رحم بلا مبادلہ کرنا بکر پر ظلم کرنا ٹھہرے گا۔ اور اگر زید کو سزا دے تو یہ محض عدل ہوگا۔ کیونکہ مجرم کو سزا دینا کوئی رحم نہیں۔ عدل کے معنی ہیں طرفین کے حالات کو اعتدال پر لانا۔ یعنی ظالم و مظلوم کی حیثیات کو مساوی (معتدل) رکھنا اسی طرح انصاف (مادہ نصف) کے معنی ہیں نصفا نصفی کر دینا۔ تاکہ ظالم و مظلوم کی حیثیات مساوی رہیں۔ پس اگر خُدا انسان کے کُل گُناہ کا بدلہ لے تو یہ عدل ہی ہوگا۔ اور اگر بلا مبادلہ سب کو بری کر دے تو یہ رحم بلا عدل ہوگا اگر کچھ گُناہوں کا بدلہ لے اور کچھ معاف کر دے تو یہ عدل نہ ہوگا نہ رحم۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، کہ تقاضائے عدل بھی پُورا ہو اور گنہگار پر رحم بھی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذاتِ راحم اپنی طرف سے کچھ ایثار کرے۔ کیونکہ رحیم ہونے کے لئے ایثار شرط ہے۔ یعنی اگر حاکم مُجرم پر رحم کرنا چاہے تو ضرور ہے کہ اُس کا فدیہ (معاوضہ) اپنی طرف سے دے اور یہی اُس کا ایثار ہوگا۔ خُدائے عادل و رحیم کے اِس ایثار کا پُورا بیان آگے چل کر "نجات بالکفّارہ" کے زیرِ عنوان کیا جائے گا۔ جس سے خُدا کی عدالت و رحمانیت کا بھید ناظرین پر کھُل جائے گا۔ اصل مقصد کو سمجھنے کے لئے خیالات کے سلسلے و ترتیب کو یاد رکھیے۔

قسری ملاپ

اب شاید کوئی یہ سوچے کہ کیوں نہ خدائے پاک جبری و قسری طور پر اپنی قدرت کاملہ سے اِنسان کو پاک بنالے اور اپنی قُربت سے اُسے قسری طور پر بہرہ اندوز فرمائے۔ واضح ہو کہ اس خیال میں یہ بھاری نقص ہے کہ انسان کی فعل مختاری قائم نہیں رہتی۔ خُدا نے اُسے فاعل مختار بنایا۔ نیکی و بدی کی تمیز بخشی، تاکہ اپنی آزاد مرضی سے دونوں میں سے جس کو چاہے پسند کرے۔ اور اوامر و نواہی بخش دئے، جن کے عدُول کی سزا اور تعمیل کی جزا ٹھہرائی۔ اگر انسان کی فعل مختاری اور آزادی میں خلل دیا جائے تو نیکی نیکی نہ رہے گی اور نہ بدی بدی۔ اور جب نیکی بدی نہ رہی تو عدالت نہ رہی۔ جب عدالت نہ رہی تو سزا و جزا نہ رہی اور دوزخ و بہشت دو ایسے مفہوم ہوں گے جن کا کوئی مِصداق نہ ہو۔ اور خُدا کے احکام دربارہ ترکِ گناہ اور اختیارِ نیکی باطل ٹھہریں گے۔ اور نجات بے معنی لفظ ہوگا۔ حتیٰ کہ خُدا کی خُدائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، اور پھر اگر خُدا نے انسان کو بالجبر ہی پاک و راست بنانا ہوتا تو آدم و حوّا کو اوائل ہی میں بنا لیتا۔ اور اس موجُودہ جل ٹلی کی بہ نسبت یہ بہتر ہوتا کہ تمام دُنیا میں یہ مرض نہ پھیلتا۔ فعل مختاری ہی تو ہے جو اِنسان کو تمام مخلُوقات سے اشرف ٹھہراتی ہے۔ ورنہ حیوان و اِنسان میں کیا مابہ الامتیاز ہوتا، اور اس قسم کے اِنسان کو خُدا کی قُربت سے کیا فائدہ ہوتا۔ اگر خوشی ہوتی تو جس قدر ایک بیل کو شاہی محلوں میں رہنے سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ خیال سراسر غیر معقُول ثابت ہوتا ہے اور اس سے کنارہ کرنا لازمی ہے۔

طبعی مِلاپ

بالفرض محال اگر ہم یہ مان لیں کہ خُدائے قدُوس اِنسان خاطی و عاصی کو اُس کی گناہ آلود طبیعت کے ساتھ ہی

اپنی قُربت و رفاقت میں قبول فرمائے گا، تو بھی یہ عُقدہ حل نہ ہوگا۔ کیونکہ متضاد طبائع (پاک و ناپاک) کے مِلاپ کا انجام خُوشی کی بجائے نفرت ہوگا۔ جس طرح اُلّو کی طبیعت کی آفتاب کی تجلّی کے ساتھ موافقت و مُناسبت نہ ہونے کے باعث الّو کو سُورج کی قُربت سے خُوشی کی بجائے دُکھ اور تکلیف محسُوس ہوتی ہے۔ اِسی طرح اِنسان کی ناپاک طبیعت کو خُدائے قدُّوس کے تقرّب سے بجائے مسرّت و شادمانی کے اِنتہائی دُکھ محسُوس ہوگا۔ اور ایسے مِلاپ کی بہ نِسبت زخارفِ دُنیا اور جیفۂ جہان ہی اطمینان بخش اور مسرّت افزا معلُوم ہوں گے۔ اور خُدا کی قُربت ایک اطمینان سوز اور دلاوز عالت جس میں وُہ ایک لمحہ بھر رہنے کی برداشت نہ کر سکے گا۔ جب تک خُدا اور اِنسان کی طبائع میں باہمدگر موافقت و مطابقت تام نہ ہو جائے، مِلاپ قطعی ناممکن ہے۔ جب تک مغنّی اور ساز کی آواز میں ہم آہنگی نہ ہو مغنّی کبھی خُوش نہیں ہو سکتا۔ ایک ڈاکُو حاکم کے سایہ سے بھاگتا ہے کیونکہ ڈاکُو کی طبیعت اور حاکم کی طبیعت میں اختلاف ہے۔ محبُوب اپنے محبّ اور عاشق اپنے معشُوق میں ہمیشہ وُہی طبیعت اور خصلت دیکھنا چاہتا ہے جو وُہ اپنی ذات میں خود رکھتا ہے۔ رحمدل سنگدل و ظالم سے نفرت کرتا ہے۔ خلیق بدخلق کو پسند نہیں کرتا۔ مُنصف مزاج بے انصاف سے راضی نہیں ہوتا۔ پرہیزگار عیاّش کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ اِسی طرح اِنسان اور خُدا کی طبعی ناموافقت کو یسعیاہ نبی یُوں بیان کرتا ہے۔ "تمہاری بدکرداری نے تمہارے اور تمہارے خُدا کے درمیان جُدائی کر دی ہے۔ اور تمہارے گُناہوں نے اُسے تُم سے رُوپوش کیا" (یسعیاہ ۵۹: ۲) اب طبعی مِلاپ کی دو صُورتوں میں سے ایک صُورت ہی ممکن ہو سکتی ہے:۔

(۱) خُدا کی طبیعت گُناہ آلُودہ ہو جائے تاکہ انسان کی طبیعت کے ساتھ اُس کی موافقت ہو سکے۔

(۲) یا انسان کی طبیعت خُدا کی سی پاک ہو جائے تاکہ اُس کی طبیعت کے ساتھ مطابقت ہو سکے۔

توبہ توبہ! خُدائے قدُّوس و برتر تو کبھی ناپاک نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس کی صفتِ قدُّوسیّت اَور اُلوہیّت کے سراسر منافی ہے۔ "یہ ہرگز ہو نہیں سکتا کہ خُدا شرارت کا کام کرے۔ اَور قادرِ مُطلق بدی کرے" (ایُّوب ۳۴: ۱۰)۔ اَور انسان ضعیف البنیان جو گُناہ کا کیڑا ہے اپنی ذاتی کوشش اَور جدوجہد سے پاک ہو نہیں سکتا۔ "انسان ہے کیا کہ وُہ پاک ہو؟ اَور وُہ جو عورت سے پیدا ہُوا کیا ہے کہ صادق ٹھہرے؟" (ایُّوب ۱۵: ۱۴) غرضیکہ جیسے خُدا کا ناپاک ہونا مُمتنع ہے ویسے ہی انسان کا پاک ہونا محال ہے۔ اگر ملاپ مُمکن ہے تو صرف طبعی ملاپ۔ اَے ناظرین! آپ نے خُوب جان لیا کہ اگر خُدا اپنی جگہ نہ کر انسان کی نجات کا کوئی انتظام نہ کرے تو انسان میں یہ صلاحیت مفقود ہے کہ "اُس پاکیزگی کو حاصل کرے جس کے بغیر کوئی خُدا کو نہ دیکھے گا"۔ ہر شخص اپنے باطن میں اپنی ایسی بےبسی اَور لاچاری کا وجدانی احساس ضرور رکھتا ہے۔ یہ انسان کی واقعی ناگفتہ بہ حالت کی اقرب الی الفطرت تصویر ہے۔ اِس لئے طفل تسلّیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اپنی عیب دار اَور گُناہ آلُود زندگی پر رحم کھانا چھوڑ دیجئے۔ اپنے آپ کو برابر ملامت کریں۔ اپنے آپ پر رحم کھانے اَور اپنی بُری حالت کی رعایت کرنے سے زیادہ رُوح کی ہلاکت کا اَور کوئی مُوجب نہیں۔ شریعتِ الٰہی انسان کی اسی مکرُوہ حالت کو اُس پر روشن کرتی ہے "تاکہ اُس کا گُناہ ہونا ظاہر ہو۔ اَور حکم کے ذریعے سے گُناہ حد سے زیادہ مکرُوہ

معلوم ہو۔" (رومی ۷: ۱۳) تاکہ وہ ایک طبیبِ رُوحانی کی ضرورت کا قائل ہو کر اُس کا متلاشی بن جائے۔

نجات بالکفّارہ

ہم نے دلائل و براہین سے یقینی اور قطعی طور سے اِس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ انسان اپنی ذاتی جد و جہد سے وہ پاکیزگی اور تنزیہہ و تبریہہ عن الخطا حاصل نہیں کر سکتا جو اُسے ابدی زندگی غیر فانی خوشی اور خُدا کی مواصلت و مقاربت کا استحقاق دلا سکے (امثال ۲۰: ۹) اور منقولی شہادت سے بھی اِس دعویٰ کی صداقت و حقیقت کو خُوب ثابت کر دیا۔ ایک دفعہ جب خُداوند مسیح نے اِنسانی جد و جہد کو حصُولِ نجات کے متعلق ناکافی و محال ثابت کیا، تو لوگ حیران ہو کر کہنے لگے کہ "پھر کون نجات پا سکتا ہے؟" تو آپ نے فرمایا "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خُدا سے ہو سکتا ہے کیونکہ خُدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔" (متی ۱۹: ۲۶) چُنانچہ خُدا نے رحیم و العادل نے انسان خاطی و عاصی وہ فاسد الخیال کی ذاتی لاچاری و بے بسی کی حالت پر رحم فرمایا۔ اور اُس کے گُناہوں کا مبادلہ اپنی طرف سے پیش کیا۔ "کیونکہ وُہ کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ سب کی توبہ تک نوبت پہنچے۔" (۲-پطرس ۳: ۹) اور یہی ایک آخری اور معقُول طریقہ ہے جس سے خُدا عادل بھی اور رحیم بھی ثابت ہو۔ اور انسان خاطی و عاصی کو نجات بھی دے۔ "اُسے (مسیح کو) خُدا نے اُس کے خُون کے باعث ایک ایسا کفّارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو تاکہ جو گُناہ پیشتر (مسیح سے پہلے) ہو چُکے تھے۔ اور جن سے خُدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وُہ اپنی راستبازی ظاہر کرے۔ بلکہ اِسی وقت اُسکی راستبازی ظاہر ہو۔ تاکہ وُہ خود بھی عادل رہے۔ اور جو یسُوع پر ایمان لائے اُس

کو بھی راست باز ٹھہرانے والا ہو۔" (رومی ۳: ۲۵-۲۶) انسان کی ذلت اور
فاسد الطبع کی ناداری استعداد دربارہ حصول نجات نے خدا کی محبت کو
مجبور کر دیا کہ وہ خود اُس کا فدیہ دے۔ اور اُس کو تمام آلودگیوں سے پاک
کر کے اپنی قربت میں قبول فرمائے اور ابدی عذاب و ہلاکت سے بچا لے۔
چنانچہ "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا۔
تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے۔" (یوحنا ۳: ۱۶)
"کسی راست باز کی خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی
کے لئے کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جرأت کرے۔ لیکن خدا اپنی محبت کی خوبی ہم
پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا۔" (رومی ۵: ۷-۸) ایک بچہ جب گندگی سے اپنے لباس اور تن کو آلودہ کر لیتا ہے، تو ماں
اُس کی اُس گندگی سے نفرت کرتی ہے۔ اور اگرچہ بچہ آغوشِ مادر میں جانے
کے لئے ہاتھ پسارتا اور روتا ہے۔ تاہم ماں اُس کی غلاظت کو دھوئے بغیر
اُسے گود میں نہیں لیتی۔ لیکن ماں کو بچہ کی ذات سے نفرت نہیں ہوتی پر
اُس کی غلاظت سے۔ اور بچے میں خود کو صاف کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی،
بلکہ ماں خود اُسے دھو کر اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اِسی طرح خدا انسان
کی گناہ آلودہ و مکروہ حالت سے نفرت و گھن کرتا ہے۔ کیونکہ وہ پاک و
قدوس ہے۔ اور اُس کی محبت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ انسان ایسی مکروہ
حالت میں مبتلا رہ کر ابد تک اُس سے جدا رہے۔ اور انسان میں خود کو
پاک بنا لینے کی قابلیت و صلاحیت مفقود ہے۔ اِس لئے خدائے رحیم اور
سرچشمۂ الطاف و اکرام نے خود اُس کی ناپاکی کو مسیح کے پاک ترین لہو سے
دھویا۔ اور وہ وعدہ جو اُس نے بنی نوعِ انسان کے ساتھ مسیح کے ظہور

سے صدیوں پیشتر کیا تھا مسیح کی قربانی میں پورا کیا۔ وہ وعدہ یہ تھا " مَیں نے تیری خطاؤں کو گھٹا کی مانند اور تیرے گناہوں کو بادل کی مانند مٹا ڈالا۔ میرے پاس واپس آجا، کیونکہ مَیں نے تیرا فدیہ دیا ہے " (یسعیاہ ۴۴: ۲۲ و ۴۳: ۲۵) خداوند مسیح نے خدا کے عدل کو اِس صورت میں پورا کیا، کہ جو موت گناہ کے باعث انسان نے کمائی تھی وہ اپنے جسم پر لے لی۔ اور یوں اُس کا کامل فدیہ دیکر تقاضائے عدلِ الٰہی کو پورا کیا۔ اور رحم و محبتِ الٰہی کو اِس صورت میں پورا کیا، کہ گنہگار جو ابدی ہلاکت کے حقدار تھے ہمیشہ کی زندگی کے وارث ٹھہرے۔ کہاں ابدی عذاب اور کہاں ابدی زندگی و خوشی " مگر اُس کے فضل کے سبب اُس مخلصی کے وسیلہ سے جو مسیح یسوع میں ہے مفت راستباز ٹھہرائے جاتے ہیں " (رومی ۳: ۲۴) کفارہ کے معنی ہیں ڈھانپ دینا۔ خداوند مسیح نے اپنے پاک کفارہ کے ذریعے انسان خاطی و عاصی کے گناہوں پر پردہ ڈالا۔ اور اُنہیں خدا کی نظر سے چھپا دیا۔ کفارہ کی تعریف داؤد نبی یوں کرتا ہے " مبارک ہے وہ جس کی خطا بخشی گئی۔ اور جس کا گناہ ڈھانکا گیا " (زبور ۳۲: ۱ و ۲:۸۵) آفرینشِ عالم کے اوائل ہی میں جب آدم اور حوّا گناہ میں گرنے کے باعث ننگے پائے گئے کفارہ کی ایک علامت ملتی ہے۔ وہ مجازی کفارہ تھا۔ اور مسیح کے اِس حقیقی اور عالمگیر کفارہ کی گویا تمثیل لکھا ہے " اور خداوند خدا نے آدم اور اُس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر اُنہیں پہنائے " (پیدائش ۳: ۲۱) وہ چمڑا کسی جانور کو مار کر لیا گیا تھا اور اُس سے اُن کی عریانی کو جو گناہ کے باعث محسوس ہوئی تھی ڈھانپا گیا۔ اِس سے ایک طرف تو اُنہیں دکھایا گیا کہ وہ موت جو تم نے گناہ کرکے کمائی ہے کیا چیز ہے۔ کیونکہ اب تک اُنہیں موت کی کیفیت کا علم نہ تھا اور

وُہ عبرت ناک کیفیت حیوان کی موت سے اُن پر روشن کی گئی کہ تمہاری موت اِس طرح ہوگی۔ اور دُوسری طرف چمڑے سے خُود اُن کا ننگ ڈھانپ کر یہ ظاہر کیا کہ باوجود تمہاری اپنی خطا اور شقاوتِ قلبی کے مَیں خُود (خُدا) تمہاری عُریانی کو ڈھانپوں گا۔ مگر دُوسرے کی موت کے وسیلے جو تمہارے گُناہ کا شریک نہ تھا۔ "تمہاری خلاصی فانی چیزوں یعنی سونے چاندی کے ذریعے سے نہیں ہُوئی بلکہ ایک بے عیب اور بے داغ برّے یعنی مسیح کے بیش قیمت خُون سے" (۱ پطرس ۱: ۱۸-۱۹) مسیح پر درمیانی ہونے کی حیثیت سے جو سزا واجب ہوئی وُہ ایسی طاقت رکھتی ہے کہ گویا گنہگاروں نے خُود وُہ سزا اُٹھائی جیسے دوا مریض و مرض کے درمیان آکر فنا ہو جاتی اور اپنی ہستی کھو دیتی ہے اور مرض کو مریض سے جُدا کر دیتی ہے۔ اِسی طرح مریضانِ گُناہ اور مرضِ گُناہ کے درمیان میں آکر مسیح نے اپنی ہستی کھو دی۔ اور اِن دونوں کو ایک دُوسرے سے یکسر جُدا کر دیا۔ اگر مسیح ہر دو کے درمیان میں آکر دوا کی طرح اپنی ہستی نہ مٹا دیتا تو گُناہ و گنہگار کے مابین جُدائی کا ہونا ناممکن و محال تھا۔ اور جیسے مریض کسی طویل عرصہ کی شدید مرض سے شفا پا لینے کے بعد بہُت عرصہ تک کمزور و نحیف رہتا ہے، اور اُس کو مقوّی و لحم پرور اغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِسی طرح خُداوند مسیح نے اپنی قُربانی کے ذریعے مریضانِ گُناہ کو شفا کُلی تو بخش دی۔ اب بعض بعض میں صرف کمزوری باقی رہتی ہے۔ وُہ کمزوری (رُوحانی کمزوری) رفتہ رفتہ رُوح القُدس کے طفیل جو طاقتِ رُوحانی کا سرچشمہ ہے دُور ہو جائے گی۔ "جب رُوح القُدس نازل ہوگا تو تُم قوّت پاؤ گے" (اعمال ۱: ۸) "رُوح بھی ہماری کمزوری میں مدد کرتا ہے" (رُومی ۸: ۲۶) اُس کا پاک کفّارہ گنہگاروں کے گُناہوں کو ڈھانپ لیتا اور

چُھپا دیتا ہے۔ اُس کا پاک خُون توبہ سے پہلے اور بعد کے تمام گناہوں کو دھوتا ہے" "اور اُس کے بیٹے یسُوع کا خُون ہمیں تمام گناہ سے پاک کرتا ہے" (۱-یُوحنا ۱: ۷) اور اُس کی قیمتی و لاثانی قربانی گنہ گاروں کو پاک و صاف کر کے خُدائے قدُّوس کی قُربت بخش دیتی ہے" "مگر تم جو پہلے دُور تھے، اب مسیح یسُوع میں مسیح کے خُون کے سبب سے نزدیک ہو گئے ہو۔ کیونکہ وُہی ہماری صُلح ہے جس نے دونوں کو ایک کر لیا۔ اور جُدائی کی دیوار کو جو بیچ میں تھی ڈھا دیا" افسی ۲: ۱۳-۱۴) ہم نے مسئلۂ گُناہ کے آخر میں گُناہ کے تین نتائج بیان کئے ہیں۔ یعنی اوّل۔ طبعی بگاڑ۔ دوم۔ خُدا سے جُدائی۔ اور سوم۔ سزائے عدالت۔ پس خُداوند مسیح کا کفّارہ گنہگار کو ان ہر سہ نتائج سے بالکل آزاد کرتا ہے، اور بُری خواہش جو گُناہ کی علّت ہے اُس پر اثر انداز ہو کر اُس کو نیکی و پاکیزگی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاکہ علّت کی تبدیلی سے معلُول (صدُورِ گُناہ) میں تبدیلی ہو جائے۔ اور جب تک انسان کی طبعی خرابی کو معدُوم کر کے اُس میں حصُولِ کمال کی استعداد پیدا نہ کی جائے وُہ حقیقی اور بے نقص نیکی کرنے کے قطعی ناقابل ہے۔ عمل سے پہلے قُوتِ عمل کی ضرورت ہے، اور جب طبیعت پاک ہو گئی تو خُدا سے خود بخود میل ہو گیا، اور جب میل ہو گیا تو جُدائی نہ رہی، اور نہ سزائے عدالت۔ جیسے ایک جنگلی انگُور کے ساتھ ایک اصلی اور شیریں انگُور کی شاخ کا پیوند لگانے سے اُس کی تُرش خاصیت رفتہ رفتہ شیریں ہو جاتی ہے، اور انگُور کی پُرانی فطرت مِٹ کر ایک نئی فطرت اُس میں پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح خُداوند مسیح کے ساتھ جو خُدا اور انسان کا درمیانی اور پاک ہے ایمانی رنگ میں پیوند ہو جانے سے ایماندار لوگ درجہ بدرجہ خُدا کی صُورت پر بدلتے

جلتے ہیں۔ اور اُن کی پُرانی انسانیت (گُناہ آلودہ طبیعت) مسیح کی قُدرت و قدُوسیت کی تاثیر سے زائل ہو کر نئی انسانیت (پاکیزہ طبیعت) پیدا ہوتی جاتی ہے "وہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے ہماری پست حالی کے بدن کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائے گا" (فلپی ۳: ۲۱ و عبرانی ۱۲: ۲)

آپ نے فرمایا "میں انگور کا حقیقی درخت ہوں تم ڈالیاں ہو۔ جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور میں اُس میں وُہی بہت پھل لاتا ہے کیونکہ مجھ سے جُدا ہو کر تم کچھ نہیں کر سکتے" (یوحنا ۱۵: ۵) "اس لئے کہ جب تو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کی اصل جنگلی ہے اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا" "اور جب جڑ پاک ہے تو ڈالیاں بھی ایسی ہی ہیں" (رومی ۱۱: ۱۶ و ۲۴) مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے مُراد ہے دُعا میں لگے رہنا۔ کلام کی تلاوت کرتے رہنا اور مراقبہ میں بیٹھ کر ہر روز مسیح کی حضُوری کو محسُوس کرنا اور اُس کی قُربانی اور لا انتہا محبت کا تصوّر کرتے رہنا۔ شبانہ روز مسیح کے ساتھ ایسا زندہ ایمانی تعلق رکھنا رُوحانی اصطلاح میں اُس کے ساتھ پیوند ہونا کہلاتا ہے۔ اور ایماندار کی رُوحانی تبدیلی کا راز اسی تعلق میں پوشیدہ ہے۔ رُوح القدس ایماندار کے اندر رہ کر اُس کو درجہ بدرجہ خُدا کی صُورت پر بناتی ہے۔ اور وُہ الوہیت نما انسانیت جو انسان نے گُناہ کی تاریکی میں کھو دی تھی دوبارہ انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ اس کے بگڑے ہُوئے خط و خال۔ بگڑی ہُوئی طبیعت اور بگڑی ہُوئی صُورت کو نئے سرے سے خُدا کی صُورت پر بناتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ انسان کے اندر گُناہ مُردہ ہوتا جاتا ہے۔ اور رُوح جو گُناہ کے باعث مُردہ تھی زندہ ہوتی جاتی ہے۔ "اگر مسیح تم میں ہے تو بدن تو گُناہ کے سبب

سے مُردہ ہے، مگر رُوح راستبازی کے سبب سے زندہ ہے۔" (رومی ۸: ۱۰)
اور رُوح القُدس ایک خارجی مؤثر ہے اور مسیح کا قائم مقام۔ مسیح نے گنہگاروں کا مبادلہ و معاوضہ عدلِ الٰہی کو دے دیا۔ اور وہ پچھلے قرضہ سے تو آزاد ہو گئے، لیکن اگر اُن میں آیندہ کے لئے حصُولِ کمال کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو ضرور وہ پرانی کمزوری کے زیرِ اثر پھر گناہ کریں گے۔ اِس لئے اُن کی طبعی خرابی کو مِٹانے اور ایک نئی پاکیزہ طبیعت اُن کے اندر پیدا کرنے کے لئے ضرور ایک زبردست خارجی فاعل درکار ہے۔ اور وہ رُوح القُدس ہے۔ چُنانچہ رُوح القُدس یہ کام کرتی ہے اور ایماندار کے باطن میں درجہ بدرجہ ایک نئی انسانیت کی تعمیر کرتی ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی تمام زندگی ایک ہی دن میں بسر نہیں کر سکتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ عُمر کے ابتدائی، وسطی اور انتہائی مدارج کو طے کرتا جاتا ہے۔ اِسی طرح انسان کی رُوحانی زندگی بھی بتدریج تمام عُمر ترقی کرتی کرتی آخرکار رُوحانی کمالیت کو حاصل کرتی ہے۔ "اُس خُداوند کے وسیلے سے جو رُوح ہے ہم اُسی جلالی صُورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں۔" (۲۔کرنتھی ۳: ۱۸ و ۱۔کرنتھی ۱۵: ۴۹)

اِس چمنستانِ فطرت میں پیدائش دو طرح کی ہے۔ ایک بیج کی اور دُوسری پیوند کی۔ ہر شے بیج سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جس جنس کا بیج بویا جاتا ہے، اُس سے اُسی جنس کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر گیہوں بویا جائے تو اُس کے پودے میں انگور نہیں لگ سکتے بلکہ گیہوں۔ "کیا انجیر کے درخت میں زیتون اور انگور میں انجیر پیدا ہو سکتے ہیں؟" (یعقوب ۳: ۱۲)
اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ بیج کی خاصیت بھی بتمام و کمال پھل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک ترش خاصیت کا بیج بویا جائے تو اُس کے پودے

ہیں ضرور ترش پھل ہی لگیں گے۔ یہ تو ہے بیج کی پیدائش۔ اب دوسری پیوند کی پیدائش ہے۔ یہ امر زیادہ تشریح کا محتاج نہیں کہ پیوند لگانے سے کسی بھی پھل کی خاصیت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ وہ درخت جو ترش خاصیت کے بیج کی پیدائش ہے اور جس میں ہمیشہ ترش پھل کا لگنا ضروری ہے، شیریں خاصیت کی شاخ سے پیوند لگانے سے یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور آیندہ اُس میں کبھی کھٹے پھل نہیں لگتے۔ اِس مثال سے ہمیں انسان کی نئی پیدائش کا ثبوتی تصور حاصل ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش بھی دو طرح پر ہے۔ جسمانی یا تخمی پیدائش۔ اور رُوحانی پیدائش (نئی پیدائش)۔ حضرت ابوالبشر (آدم) جنسِ انسانی کا گویا بیج تھا جس سے تمام نوعِ انسانی کی پیدائش ہوئی۔ وہ خاکی تھا اور اُس کی طبیعت گناہ آلود ہو گئی۔ اِس لئے اُس کی ناپاک طبیعت کا اثر اُس کی تمام نسل میں پُشت در پُشت متواتر طور پر چلا آیا۔ "جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا۔ اور گناہ کے سبب موت آئی، اور یُوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اِس لئے کہ سب نے گناہ کیا" (رومی ۵: ۱۲) "پہلا آدمی زمین سے یعنی خاکی تھا...... اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صُورت پر ہوئے" (۱-کرنتھی ۱۵: ۴۷ و ۴۹) یہ ہے انسان کی جسمانی (تخمی) پیدائش کا حال جس میں گناہ کا متوارث میلان اور نوعِ انسان کے فردِ اوّل کی طبعی ناپاکی کا اثر بدیہی طور پر ظاہر ہے۔ اِس لئے کلامِ الٰہی کا یہ فرمان حقیقت پر مبنی ہے کہ "سب نے گناہ کیا اور خُدا کے جلال سے محرُوم ہیں" (رُومی ۳: ۲۳ و واعظ ۷: ۲۰) اِسی واسطے انسان میں حقیقی نیکی کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

اب رہی رُوحانی پیدائش وہ گویا پیوند کی پیدائش ہے جس طرح ترش

پھل کو بدلنے کے لئے ایک شیریں شاخ کا پیوند لازمی ہے۔ کیونکہ تُرش کے ساتھ تُرش ہی کا پیوند لگانا تحصیل حاصل ہے۔ اس سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ اِسی طرح انسان کی موروثی گناہ آلود طبیعت کو تبدیل کرنے کے لئے ایک بے گناہ اور پاکیزہ شخصیت کی ضرورت ہے، جس کے ساتھ رُوحانی طور پر پیوند ہو جانے سے انسان کی پُرانی مائل بہ بدی طبیعت ایک نیک و پاک طبیعت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس کے متعلق کلام کا فرمان ملاحظہ ہو "کیونکہ جس طرح ایک ہی شخص (آدم) کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اُسی طرح ایک کی فرماں برداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے۔" (رومی ۵: ۱۹) پس لامحالہ وہ نئی پیدائش ہمیں خُداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس نے فرمایا "مَیں انگور کا درخت ہُوں تم ڈالیاں ہو جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور مَیں اُس میں وہی بہت پھل لاتا ہے کیونکہ مجھ سے جُدا ہو کر تم کچھ نہیں کر سکتے۔" (یوحنا ۱۵: ۵) "اِس لئے کہ جب تُو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کی اصل جنگلی ہے، اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا تو وہ جو اصل ڈالیاں ہیں اپنے زیتون میں ضرور ہی پیوند ہو جائیں گی۔" (رومی ۱۱: ۲۴)

پیج والی پیدائش ہمیشہ نیچے سے ہوتی ہے، اور پیوند والی اُوپر سے خُداوند مسیح نے فرمایا "تم نیچے کے ہو مَیں اُوپر کا ہُوں۔ تم دُنیا کے ہو مَیں دُنیا کا نہیں ہُوں۔" (یوحنا ۸: ۲۳) "جس طرح ہم اُس خاکی کی صُورت پر ہُوئے، اُسی طرح اُس آسمانی کی صُورت پر بھی ہوں گے۔" (۱-کرنتھی ۱۵: ۴۹) اور جو لوگ اپنے گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ کر کے خُداوند مسیح پر ایمان لا کر اُس کے ساتھ رُوحانی رنگ میں پیوند ہو جاتے اور نئی پیدائش حاصل کرتے ہیں اُن کے

متعلق کلام فرماتا ہے "تخم فانی تخم سے نہیں، بلکہ غیر فانی سے۔ خدا کے کلام (مسیح) کے وسیلے جو زندہ اور قائم ہے۔ نئے سرے سے پیدا ہوئے ہو" (۱-پطرس ۱: ۲۳) "جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا تخم اُس میں بنا رہتا ہے، بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے" (۱-یوحنا ۳: ۹ و گلتی ۳: ۹-۱۰ و فلپی ۳: ۲۱ و ۲-کرنتھی ۴: ۱۶) "جو جسم سے پیدا ہوا ہے جسم ہے۔ اور جو رُوح سے پیدا ہوا ہے رُوح ہے" (یوحنا ۳: ۶)۔ جس بیج (آدم) سے نسل انسانی کی پیدائش ہوئی وہ ناپاک تھا۔ اِس لئے تمام نسل کا ناپاک ہونا عقلی و نقلی ہر دو طریق سے ثابت ہے۔ اِس لئے خدا کا فرمان انسان کے لئے یہ ہے "میں جانتا تھا کہ تو بالکل بے وفا ہے، اور رحم ہی سے خطا کار کہلاتا ہے" (یسعیاہ ۴۸: ۸ زبور ۵۱: ۵ و ۵۸: ۳ و پیدائش ۸: ۲۱) اور بغیر نئی پیدائش حاصل کئے انسان کا خدا سے مِلاپ ممتنع ہے (کیونکہ) "تماثل طرفین محالی ہے"۔ اِس لئے خداوند مسیح نے نیکدیمس سے کہا "میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک کوئی نئے سرے سے پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا" (یوحنا ۳: ۳)

اور جس طرح وضاحات مافوق سے ظاہر ہے نئی پیدائش خداوند مسیح کے ساتھ ایمانی و رُوحانی رنگ میں پیوند ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ایزد تعالیٰ کا مقرر کردہ واحد ذریعہ ہے جس سے نوع انسان کو مرض گناہ سے نجات اور خدا کی مقاربت و نعمت حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے مسئلہ گناہ کے بیان میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ چونکہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ لہٰذا گناہ نے انسان کی رُوحانی زندگی پر اثر انداز ہو کر رُوح کو مُردہ کر دیا۔ جس سے جسم بھی بطور لازمی نتیجہ کے قبضۂ موت میں آگیا۔ اگر گناہ زندہ رہے تو رُوح مُردہ رہے گی اور جب رُوح مُردہ ہو گی تو جسم

بھی موت کے قبضہ میں رہے گا۔ (رومی ۷: ۹) خداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے گناہ مُردہ ہو جاتا اور رُوح زندہ ہو جاتی ہے۔ اَور رُوح کے طور پر زندہ ہونے سے جسم بھی قبضۂ موت سے چھوٹ کر بقا کو حاصل کرتا ہے۔ "وُہ پھر مرنے کے بھی نہیں" (لُوقا ۲۰: ۳۶) "اِس لئے اگر کوئی مسیح میں ہے تو وُہ نیا مخلوق ہے۔ پُرانی چیزیں جاتی رہیں۔ دیکھو وُہ نئی ہو گئیں" (۲ کرنتھی ۵: ۱۷)۔

خُلاصۂ مطالب

(۱) اختیاری طریقہ سے گناہ کا ازالہ اَور نجات محال ہے۔

(۲) جبری طریقہ سے گناہ کا ازالہ اَور نجات محال ہے۔

(۳) بذریعہ تناسخ حقیقی نجات اِس لئے محال ہے کہ اِس کا تمام تر دارومدار کرموں (اعمال) پر ہے۔ لیکن عمل سے پہلے قوّتِ عمل درکار ہے۔

(۴) تزکیہ نفس و ریاضتِ جسمانی سے نجات محال ہے۔

(۵) اعمالِ حسنہ سے نجات ملتی ہے۔ اِس عقیدہ کے حامی اعمالِ حسنہ کو شرط اَور نجات کو مشروط ٹھہراتے ہیں۔ لیکن دراصل نجات شرط اَور اعمالِ حسنہ مشروط ہیں۔ یعنی نیک اعمال سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔

(۶) توبہ محض سے نجات محال ہے۔ اگرچہ حصُولِ نجات کے لئے توبہ ضرُوری ہے۔

(۷) خُدا کی صفات عدل و رحم کو ملحُوظ رکھتے ہُوئے انسان خُود اپنی نجات کا اِنتظام نہیں کر سکتا۔

(۸) قسری ملاپ سے انسان کی فعل مختاری قائم نہیں رہتی۔ لہٰذا حصول نجات کا یہ طریقہ غیر معقول ہے۔

(۹) طبعی موافقت نجات کے لئے ضروری ہے لیکن پاک طبیعت کو حاصل کر لینا انسان کی دسترس سے باہر ہے۔

(۱۰) نجات بالکفارہ حصول نجات کے لئے آخری صحیح اور معقول طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے معتقدات سے عدم واقفیت کے باعث یہ اعتراض کیا کرتے ہیں، کہ جب خداوند مسیح نے خطا کاروں کے عوض میں اپنی جان بطور مبادلہ کے دے دی، تو اب وُہ آزاد ہیں کہ کفارۂ مسیح کی آڑ میں رُو سیاہی کے کام کیا کریں۔ کیونکہ کفارہ ہو چکا، اور یہ سوال ہمیشہ مقلدانِ مسیح پر ہی کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ مقدس پولُوس رسُول خود ہی اِس سوال کو پیدا کر کے اُس کا معقول جواب دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو (رُومی ۶: ۱-۴ و ۱۵-۱۸) ہم ایسے معترضوں سے مؤدبانہ طور سے پُوچھتے ہیں، کہ ایک مریض جو مرض سے تندرست کیا گیا کیا وُہ اِس لئے بار بار بیمار ہونے کی کوشش کرے کہ ادویہ اور حکیم اُس کے علاج کے لئے موجُود ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کوئی صحت یافتہ آدمی کبھی دوبارہ بیمار ہونے کی خواہش نہیں کرتا اگرچہ اُس کی شفاء کے سامان بکثرت موجُود ہوں۔ اور اگر کوئی اسی غلط فہمی کے زیرِ اثر مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی دیدہ و دانستہ گناہ پر دلیر ہو جائے تو مسیح کا کفارہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتا۔ وُہ سزا لئے عدالت سے ہرگز بچ نہیں سکتا۔

"کیونکہ جن لوگوں کے دِل ایک بار روشن ہو گئے، اور وُہ آسمانی بخشش کا مزہ چکھ

چکھے اور رُوح القدس میں شریک ہوگئے، اور خدا کے عمدہ کلام اور آئندہ جہان کی قوتوں کا ذائقہ لے چکے، اگر وہ برگشتہ ہو جائیں تو انہیں توبہ کے لئے پھر نیا بنانا ناممکن ہے ......" (عبرانی ۶: ۴-۸) "کیونکہ حق کی پہچان حاصل کرنے کے بعد اگر ہم جان بوجھ کر گناہ کریں تو گناہوں کی کوئی اور قربانی باقی نہیں رہی" (عبرانی ۱۰: ۲۶) "اُن پر یہ سچی مثل صادق آتی ہے کہ کُتا اپنی قے کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہلائی ہوئی سؤرنی دلدل میں لوٹنے کی طرف" (۲-پطرس ۲: ۲۲)۔

جب ایک مفلس و نادار کا ایک ہزار روپے کا قرضہ کسی رحمدل صاحب حیثیت نے ایک دفعہ بھر دیا، اور اُس سے تاکیداً کہہ دیا کہ جا پھر قرض نہ لینا ورنہ میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ تو باوجود اس احسان اور تاکید کے اگر وہ دیدہ و دانستہ پھر مقروض ہو جائے تو اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ بقول "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے"۔ خداوند مسیح اپنی زمینی زندگی میں جب کبھی کسی کے گناہ معاف کرتے تھے تو فرماتے تھے۔ "جا پھر گناہ نہ کرنا" (یوحنا ۸: ۱۱) "پھر گناہ نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ تجھ پر اس سے بھی زیادہ آفت آئے" (یوحنا ۵: ۱۴)۔

ایک اور اعتراض کی امکانی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شاید کوئی موجودہ مسیحیوں کی کوتاہیوں اور خامیوں کو دیکھ کر یہ کہے کہ جب کہ مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے انسان نیا مخلوق ہو جاتا ہے اور پرانی ناپاک طبیعت سے اُس کو کلی نجات حاصل ہو جاتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ مسیحیوں کی عملی زندگیوں سے اس دعویٰ کا عملی ثبوت نہیں ملتا؟ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تبدیلی پورے طور پر پیوند ہوئے بغیر نہیں ہوا کرتی۔ اگر پیوند میں کوئی نقص رہ جائے تو تبدیلی محال ہے۔ بے شمار ایسے مسیحی بھی موجود ہیں جو صرف نام کے مسیحی ہیں اور اُن

کا چلن وُہی ہے جو مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر تھا۔ اِس کی وجہ ظاہر ہے کہ
وُہ حقیقی معنوں میں مسیح کے ساتھ پیوند نہیں ہُوئے۔ ایک تُرش انگور کا
پودا شیریں انگور کے نزدیک لگا دیا جاتا ہے۔ اور اُس میں مُطلق تبدیلی
واقع نہیں ہوتی۔ اور دُوسرے تُرش پودے کو شیریں انگور کے ساتھ پیوند
کر دیا جاتا ہے۔ اُس میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہونی شروع ہو جاتی ہے یہی فرق نقلی
اور اصلی مسیحی کا ہے۔ پس بعض نام نہاد و نقلی مسیحیوں کی بُری سیرت کو ملحوظ
رکھتے ہُوئے لاکھوں دیندار مسیحیوں کو بھی ویسے ہی گندم نما جَو فروش
سمجھنا جائز نہیں۔ ایک ضعیف البصر کی قلّتِ بصارت کے لحاظ سے
اصحابِ بصارتِ قویّہ کے مرئیات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مفقُود
الاستماعت کے مسمُوعات کے انکار سے ایک صاحبِ سماعتِ صحیحہ کی قوّتِ
سماعت کا انکار لازم نہیں آتا۔ کھوٹے اور کھرے روپے میں بناوٹ
وزن۔ مقدار اور چہرہ شاہی کے لحاظ سے مُطلق فرق نہیں ہوتا۔ لیکن
کی آوازوں سے اُن کا کھوٹا یا کھرا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح نقلی اور
مسیحی میں وجہ امتیاز اُن کی بدسیرتی اور خوش سیرتی ہے۔ "اچھا درخت
پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے" (متی ۷: ۱۷)

علاوہ ازیں ایسے مسیحی بھی ہیں جو مسیح کے ساتھ اچھی طرح پیوند ہو چکے
اور اُس پیوند کی تاثیر واقعی اُن کی عملی زندگیوں سے [illegible] ہے۔
تبدیل شدہ ہیں۔ لیکن بعض دفعہ پُرانی طبیعت کا خفیف سا اثر اُن میں
باقی رہ جاتا ہے۔ اور اُسی اثر کے ماتحت وُہ شاذ و نادر ناکردنی افعال
کے مُرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔ مسیح کے ساتھ پیوند ہو جانے کے بعد بھی
اکثر اُن میں پُرانی طبیعت کی کوئی جڑ پھُوٹ نکلتی ہے۔ جیسا پولُوس رسُول

فرماتا ہے "ایسا نہ ہو کہ کوئی کڑوی جڑ پھوٹ کر تمہیں دُکھ دے، اور اُس کے سبب سے اکثر لوگ ناپاک ہو جائیں" (عبرانی ۱۲: ۱۵ و استثنا ۲۹: ۱۸) اگرچہ چراغ بجھا دیا جائے تاہم اُس کی کالک کا نشان چراغدان پر رہ جاتا ہے۔ لیکن جب مکان کی سفیدی کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ کالک بھی مٹ جاتی ہے۔ اگرچہ ایک قلعہ توڑ دیا جائے تاہم اُس کے کھنڈرات کچھ دیر تک پڑے رہتے ہیں۔ لیکن کھنڈرات میں قلعہ کی شان موجود نہیں ہوتی۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ کھنڈرات بھی اُٹھا دئے جاتے ہیں۔ اگرچہ کمان میں سے تیر نکل جاتا ہے پر کچھ دیر تک سابقہ قوّت کے اثر سے پھر بھی چلا متحرک رہتا ہے۔ وقت پاکر خود ہی ساکن ہو جاتا ہے۔ پیوند لگانے کے بعد اُسی روز درخت تبدیل ہو کر اچھے پھل دینے نہیں لگ جاتا، بلکہ اُس کی تبدیلی بتدریج ہوتے ہوتے ایک خاص اور مقررہ وقت میں انجام کو پہنچتی ہے۔ یہی حال انسانی طبیعت کی تبدیلی کا ہے۔ نجات ایک مسلسل تدریجی حالت کا نام ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی تمام عمر ایک ہی دن میں بسر نہیں کر سکتا، اُسی طرح رُوحانی کمالیت۔ مسیح کی پاکیزگی اور اُلوہیت نما انسانیت بات یافتہ لوگوں کے اندر فوراً پیدا نہیں ہو جاتی۔ نجات کے بھی مدارج ہیں "مگر جب ہم سب کے بے نقاب چہروں سے خداوند کا جلال اس طرح منعکس ہوتا ہے جس طرح آئینے میں، تو اُس خداوند کے وسیلے سے جو رُوح ہے ہم اُسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں" (۲-کرنتھی ۳: ۱۸)

نجات کے مدارج

انسان کے اندر چار قوّتیں مسلّم ہیں۔ یعنی قوّت شہوانی۔ قوّت بہیمی۔ قوّتِ سبعی اور قوّت ملکی۔ مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر اُس کی قوّتِ ملکی ہر سہ قوّتوں سے یہاں تک

دبی ہوئی ہوتی ہے کہ اصلی نیکی و پاکیزگی کی صورت اُس سے پوشیدہ رہتی
ہے۔ اور وُہ بُت پرستی۔ گور پرستی۔ عناصر پرستی اور فطرت پرستی کا والا و
شیدا اور خالص توحید پرستی سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ اور ایسی باطل
پرستی اور ہر قسم کا گناہ اُس کو مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسی مکروہ زندگی
بسر کرتے ہُوئے بھی وُہ اپنے آپ کو پاک سمجھا کرتا ہے۔ لیکن مسیح پر ایمان
لاتے ہی اُس کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے اور اُس
کی زندگی بتدریج مندرجہ ذیل چار مدارج کو طے کرتی ہے۔

درجہ اول۔ اِس پہلے درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی ایک حصّہ اور گناہ
تین حصّہ ہوتا ہے۔ اور وُہ ہمیشہ یہ محسُوس کرتا رہتا ہے کہ مَیں بڑا
گنہگار ہُوں۔ یہاں تک کہ "جس نیکی کا ارادہ کرتا ہُوں وُہ تو نہیں کرتا۔
مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا ہُوں" (رُومی ۷: ۱۹) وُہ اپنی
گُناہ آلود مکروہ زندگی سے نفرت کرتا اور اپنے آپ کو سب سے بڑا
گنہگار سمجھتا ہے۔ (۱۔ تمتھیُس ۱: ۱۵) اور مسیح کی نزدیکی میں رہنا زیادہ
پسند کرتا ہے۔

درجہ دوم۔ اِس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی دو حصّہ اور گُناہ بھی دو
حصّہ ہوتا ہے۔ یعنی نیکی اور گُناہ کا میزان مساوی ہوتا ہے۔ اور ایماندار
مسیح کے ساتھ پیوند ہو کر اپنے اندر پہلے کی بہ نسبت زیادہ قُوت محسُوس
کرتا ہے۔ اور گُناہ پر غالب آنے کے لئے رُوح القُدس کی امداد
حاصل کرتا ہے۔ (رُومی ۸: ۲۶) اور کمزوری میں زور آور ہوتا جاتا
اور گُناہ کی کراہیت کو بزور محسُوس کرتا ہے۔ اِس درجہ میں رُوح کے
اندر سفلی و عُلوی عناصر میں جنگ ہوتی ہے۔ اور وُہ گاہے گُناہ پر

غالب اور گا۔ہے اُس سے مغلوب ہوتا رہتا ہے۔
درجہ سوم۔ اِس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی تین حصّے اور گُناہ صرف
ایک حصّہ رہ جاتا ہے۔ یعنی مسیح کی قُوّت کی تاثیر سے وُہ رُوحانی طور
پر کافی قوی ہو جاتا اور بہت شاذ و نادر ہی گُناہ سے مغلوب ہوتا
ہے۔ اور جب کبھی کسی خفیف سے خفیف گُناہ کا ارتکاب بھی اُس
سے ہو جاتا ہے تو اُس کے دل میں اِس قدر اضطراب پشیمانی اور
پچھتاوا پیدا ہوتا ہے کہ وُہ پھر کبھی اُس گُناہ کے نزدیک نہیں
پھٹکتا۔ اور رُوح القُدس ضمیر کو گُناہ کے زنگ سے صاف کر کے
اِس قدر ذکی الحس بنا دیتا ہے کہ وُہ معمُولی کوتاہیوں پہ بھی اپنے
والِکَو کو نہایت سختی سے انجام دینے لگتا ہے۔ اِس درجہ میں
پہنچ کر ایماندار کو خیالی گُناہوں سے کبھی جنگ کرنا پڑتا ہے۔ اُس
کی نفسانی خواہش قریب قریب مُردہ ہو جاتی ہے۔ اُس کا میلانِ طبع
گُناہ کی طرف سے ہٹ کر نیکی کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر اُس سے
عملی گُناہ تو شاذ و نادر ہی سرزد ہوتا ہے۔ صرف خیالی گُناہ بھی کبھی
اُس کی ضمیر کو ٹھوکر لگاتا ہے۔ اور ضمیر بدی کے خیال ہی سے چونک
اُٹھتا ہے، اور اِس قدر قوی اور سریع الحس ہو جاتا ہے کہ انسان
کو کبھی دائرۂ جائز سے نکل کر دائرۂ ناجائز و ناواجب میں جانے
نہیں دیتا۔ اور اِنسان کی ہر سہ عقلی قویٰ قوّتِ ملکی کے تابع ہو
جاتی ہیں۔ اور وُہ اپنی زندگی کو ایک غالب زندگی سمجھتا ہے تو
بھی پُرانی انسانیت کا خفیف سا اثر اُس کے اندر باقی رہ جاتا اور
اکثر اوقات اُس کی رُوح پر خلش لگاتا ہے۔ لیکن ایماندار اب گُناہ

کا غلام نہیں بلکہ راست بازی کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور دیگر گناہ زدہ روحوں کو بچانے کی تڑپ اُس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے۔

درجہ چہارم۔ اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی چار حصہ اور گناہ صفر ہوتا ہے۔ یعنی وہ سراسر پاک و بے عیب بن کر خدا کی طبیعت پر مطبوع ہو جاتا اور گناہ و نفسانیت کی غلامی سے کلی طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ اب خیالی گناہ کا بھی امکان مٹ جاتا ہے۔ بد اندیشی اور بد خیالی کے لئے اُس کے دل میں مطلق گنجائش ہی نہیں رہتی اور وہ کامل انسان اور خدا کے بیٹے کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ تمام نفسی بلا قوتیں اُس کی قوت ملکی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اور خیالی یا عملی گناہ کا پھر کوئی امکان نہیں رہتا۔ اور اس چوتھے درجہ کے کامل ایماندار کے متعلق کلام یہ فرماتا ہے "جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا تخم اُس میں بنا رہتا ہے۔ بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے" (۱۔ یوحنا ۳: ۹) یہ الوہیت نما انسانیت یا خدا کی صورت جو گناہ کے باعث مٹ چکی تھی ایسے ایمانداروں کو پوری کاملیت کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھر خدا کی مانند اور خدا کی صورت پر بن کر اُس کے فرزند کہلاتے۔ اور وصالِ الٰہی و مقاربتِ وجودِ لامتناہی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ نجات کا کمال ہے۔

کفارۂ مسیح کی وسعت بلحاظ تاثیر خداوند مسیح نے تمام جہان کے گناہوں کی معافی کی خاطر کفارہ دیا۔ یہ نہیں کہ اُس کی قربانی کے وقت سے لے کر قیامت کے زمانے تک

کے درمیانی عرصہ کی دُنیا کے لئے، بلکہ آدم سے لے کر یوم الحشر تک کی تمام دُنیا کے لئے اُس نے اپنی قیمتی قربانی دی۔ کوئی ایسا زمانہ نہیں جس کے گناہوں پر اُس کی قربانی اثرانداز نہ ہوسکے۔ یعنی اُس کا کفارہ آفرینشِ عالم سے لے کے روزِ عدالت تک کے گناہوں کو ڈھانپ دینے اور دھو دینے کے لئے خُدائے حکیم و قدیر کے ازلی ارادہ میں موجُود تھا۔ لیکن اُس کا ظہور ایک خاص زمانہ میں ہُوا۔ چونکہ تقدم و تاخر زمانی خُدا کے لئے بے حقیقت ہیں۔ یہ تین زمانے تو محدُودات و مخلُوقات ہی سے متعلق ہیں۔ خُدا کے لئے ہمیشہ حال ہی حال ہے۔ اِس لئے اُس کی وسیع العلمی کے مطابق مسیح کا کفارہ ازل سے ہو چکا تھا۔ "اور زمین کے وہ سب رہنے والے جن کے نام اُس برے (مسیح) کی کتابِ حیات میں لکھے نہیں گئے جو بنائے عالم کے وقت سے ذبح ہُوا ہے۔ اُس حیوان (ابلیس) کی پرستش کریں گے۔" (مکاشفہ ۱۳: ۸) "جس نے ہمیں نجات دی اور پاک بُلاوے سے بُلایا۔ ہمارے کاموں کے موافق نہیں بلکہ اپنے خاص ارادے اور اُس فضل کے موافق جو مسیح یسُوع میں ہم پر ازل سے ہُوا۔ مگر اب ہمارے مُنجی مسیح یسُوع کے ظہُور سے ظاہر ہُوا جس نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو اُس خوشخبری (انجیل) کے وسیلے سے روشن کر دیا۔" (۲۔ تمتھیُس ۱: ۹-۱۰ و ۱۔ پطرس ۱: ۲۰ و کلسی ۱: ۲۶ و رومی ۱۶: ۲۵-۲۶ و افسی ۳: ۹ و ۱۱ و ططُس ۱: ۲ و افسی ۱: ۹-۱۰ و رومی ۳: ۲۵)۔

کفارۂ مسیح کے تحقق خارجی سے پیشتر کی دُنیا اُس الٰہی انتظام پر جو اُن کی مغفرت و نجات کے لئے خُدا کی رحمانیت عامہ اور فیضانِ تامہ سے ظہُور پذیر ہُوا ایمان لا کر اپنے گناہوں کی بخشش اور تقربِ الٰہی کو حاصل

کرسکتی ہے۔ "اُسے خدا نے اُس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو تاکہ جو گناہ پیشتر (قبل از کفارہ مسیح) ہو چکے تھے، اور جن سے خدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وہ اپنی راستبازی ظاہر کرے۔ بلکہ اسی وقت اُس کی راستبازی ظاہر ہو تاکہ وہ خود بھی عادل رہے۔ اور جو یسوع پر ایمان لائے اُس کو بھی راستباز ٹھہرانے والا ہو۔" (رومی ۳: ۲۵-۲۶)

اب کوئی سوال کرے گا کہ مسیح کے ظہور سے پہلے کی دنیا اُس کے کفارہ پر کیسے ایمان لا سکتی ہے جس حال کہ وہ اُن کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ واضح ہو کہ ہم مسیحی یہ مانتے ہیں اور کلام بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ خداوند مسیح نے مُردوں میں سے زندہ ہو کر عالمِ ارواح میں پہنچ کر اپنے ظہور سے پہلے کی تمام دنیا کو بشارت دی "اسی میں اُس نے جا کر اُن قیدی روحوں میں منادی کی جو اُس اگلے زمانہ میں نافرمان تھیں جب خدا نوح کے وقت میں تحمل کر کے ٹھہرا رہا تھا۔" (۱-پطرس ۳: ۱۹-۲۰ و ۴: ۶) چنانچہ اُن روحوں میں سے جو خداوند مسیح کے پاک کفارہ پر ایمان لائی ہوں گی وہ بچ جائیں گی اور نجات پائیں گی۔ اور جو ایمان نہ لائیں وہ سزائے عدالت کی مستوجب ٹھہریں گی۔ عدالت کا ایک خاص دن ہے، اُس میں تمام باغی اور نافرمان روحیں سزا پائیں گی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ازمنہ سابقہ کی ارواح نیست ہو چکیں ہرگز نہیں۔ بلکہ خدا نے ہر زمانے کی ارواح کو عدالت کے دن کے لئے قائم رکھا ہے۔ "مگر اس وقت کے آسمان اور زمین اُسی کلام (کلمۃ اللہ) کے ذریعے سے اس لئے رکھے ہیں کہ جلائے جائیں۔ اور وہ بے دین آدمیوں کی عدالت اور ہلاکت کے دن تک محفوظ رہیں گے۔" (۲-پطرس ۳: ۷) "وہ بدکاروں کو عدالت کے دن تک سزا میں رکھنا جانتا ہے۔" (۲-پطرس ۲: ۹ و ۲: ۴ و یہوداہ ۱: ۶) پس خداوند مسیح

کی قربانی تمام زمانوں کے گنہگاروں کے واسطے دی گئی، اور جیسے ایک قیمتی لعل اکیلا ہی لاکھوں روپے کے قرض سے سُبکدوش کر دیتا ہے، اُسی طرح اُس واحد پاکیزہ اور بیش بہا الٰہی شخصیت کا فدیہ تمام زمانوں اور جہانوں کے قرضوں اور گناہوں کے لئے کافی ٹھہرا۔ "جس طرح ایک ہی شخص کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے، اُسی طرح ایک کی فرمانبرداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے۔" (رومی ۵: ۱۹)

خداوند مسیح کی قربانی میں دنیا کی وہ سب قربانیاں جو کسی نیک اور راست اصول کی وفاداری اور حمایت میں دی گئیں ایسے چھپ جاتی ہیں، جیسے آفتاب کے لاانتہا نور میں ستاروں کی ننھی ضیا پاشی چھپ جاتی ہے۔ مسیح کی موت میں ابدی اور غیر فانی زندگی کا راز سربستہ تھا، جو اُس کے زندہ ہونے پر بے نقاب ہو گیا۔ جو موت نالائق حرکات اور ناراست افعال کے ارتکاب کا نتیجہ ہو وہ واقعی قابلِ نفرت اور لعنتی موت ہو سکتی ہے لیکن وہ موت جو ناراستوں اور گنہگاروں کو بچانے کے لئے ایک راستباز پر آتی ہے وہ بذاتہ لعنتی موت نہیں۔ جو زرِ فدیہ کسی قیدی کی آزادی کی خاطر دیا جاتا ہے، وہ روپیہ لعنتی نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی لعنت کو دھو دینے اور مٹا دینے والا۔ لعنت بلحاظ جرم کے ہوتی ہے نہ کہ فدیہ کے لحاظ سے۔ مسیح کی موت کو لعنتی موت گنہگاروں کی لعنتی حالت کی نسبت سے کہا گیا ہے۔ لعنت کے اصل مفہوم کا اُس کی ذات پاک پر اطلاق مطابقی اور واقعی نہیں ہے۔ اُس "راستباز نے ناراستوں کی خاطر دُکھ اُٹھایا" (۱-پطرس ۳: ۱۸) نہ کہ اپنی کسی ناراستی کے باعث۔ اِسی واسطے "موت کا دُکھ سہنے کے سبب جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا ہے۔" (عبرانی ۲: ۹ و فلپی ۲: ۹-۱۱)

پس اَے مریضانِ گُناہ! اَور عاصیانِ بے پناہ! آج ہی پنبۂ غفلت کانوں سے نکالیئے۔ اَور ذرا ہوش سنبھالیئے۔ "دیکھو اب قبولیت کا وقت ہے دیکھو یہ نجات کا دن ہے" (۲۔ کرنتھی ۶: ۲)

اَبدی زِندگی اَور اَبدی سزا

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے مُعتقدات ومسلّمات سے عدمِ واقفیت کے باعث اَبدی زندگی اَور اَبدی سزا (بہشت و دوزخ) کے مسئلہ کے متعلق غلط فہمیوں میں مُبتلا ہیں۔ ہم نہایت اِختصار سے اِس مسئلہ کا جواب اَور طریقِ صواب پر روشنی ڈالیں گے، جس سے شکوک و شبہات کی تاریکی دُور ہو کر مطلع صاف ہو جائے گا۔ بشرطیکہ معترضین و مُشکلین تعصّب و ہٹ دھرمی کی سیاہ عینکوں کو چشمِ بصیرت سے اُتار کر اُمورِ غیبیہ اور حقائقِ مخفیہ کی جُستجو صدقِ دِل سے کریں۔

واضح ہو کہ "جو لوگ اِس لائق ٹھہریں گے کہ اُس جہان کو حاصل کریں، اَور مُردوں میں سے جی اُٹھیں اُن میں بیاہ شادی نہ ہوگی۔ کیونکہ وُہ پھر مرنے کے بھی نہیں۔ اِس لئے کہ فرشتوں کے برابر ہوں گے اَور قیامت کے فرزند ہو کر خُدا کے بھی فرزند ہوں گے" (لُوقا ۲۰: ۳۵-۳۶) اَور اُن کی سکونت کے لئے "نیا آسمان اَور نئی زمین ہوگی جن میں راستبازی بستی رہے گی" (۲ پطرس ۳: ۱۳) "اُن کو بھُوک اَور پیاس نہ لگے گی۔ نہ دھُوپ اَور گرمی ستائے گی" (مکاشفہ ۷: ۱۶) "پھر وہاں موت نہ ماتم نہ درد نہ آہ نالہ رہے گا۔ پُرانی چیزیں جاتی رہیں گی اَور یہ کچھ نیا ہی ہوگا" (مکاشفہ ۲۱: ۳-۴) وہاں اِس مادّی دُنیا کے لذائذ و حظائظ، خواہشات و عادات، گُناہ و ظُلمت، مصائب و شدائد اَور رنج و آلام وغیرہ کی لازوال، ابدی اَور غیر فانی رُوحانی خوشیوں میں رخنہ اندازی نہ کر سکیں گے، بلکہ

اِن تمام کدُوراتِ سفلیہ۔ اخشیجِ جسمانیہ اور اہویۂ نفسانیہ کا وہاں قطعی امکان و گنجائش نہ ہوگی۔ اور راستباز جنتی لوگ خُدا کی عین ذات نہ ہوں گے بلکہ غیر ذات۔ اور طبائعِ قُدسیہ و صفاتِ ملکُوتیہ کے باعث خُدائے قدُوس سے مشابہت و مماثلت قریبی رکھیں گے۔ "اُس وقت راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں آفتاب کی مانند چمکیں گے"۔ (متی ۱۳: ۴۳)۔ "اور وہ تا ابد خُدا کی مقاربت و مجالست میں رہیں گے اور اُس کی عبادت کریں گے"۔ (مکاشفہ ۲۲: ۳-۵) جب راستباز اِس فانی زندگی کو چھوڑ کر ابدیت کی پُر مسرت و لا انتہا عملداری میں داخل ہو کر اس جسمانی زمانہ کی طرف دیکھیں گے تو وہ ایسا ہی مختصر نظر آئے گا جیسا وُہ دو اڑھائی گھنٹہ کا عرصہ جس میں فلم کے اداکار ایک طُول طویل زندگی کے واقعات دِکھا کر ڈراپ سین کر دیتے ہیں۔ اور تمام اشیاءِ غیر فانی ہو کر مُجدد و تدریج میں اُن کا مجموعہ ہو جائے گا۔ (افسی ۱: ۱۰) لیکن خبیث الطینت و شریر النفس لوگ اسفل السافلین میں گرائے جائیں گے۔ اور راستبازوں سے بالکل الگ رہ کر ابدی عذاب میں دانت پیسیں گے اور روئیں گے۔ اور تمام مُتفرق بیان جو دوزخ کی ہولناک تصویر۔ آگ گندھک اور دیگر ضرر رساں اشیاء کے پیرائے میں پیش کی گئی ہے، وُہ محض تشبیہی و تمثیلی بیانات ہیں۔ دراصل مُنکرانِ خُدا کی طبائع کدُوراتِ سفلیہ اور خواہشاتِ ذمیمہ و قبیحہ کے باعث خُدا کی پاکیزہ طبیعت کے مخالف و متضاد ہوں گی۔ اُن کا دُکھ و عذاب ایسا ہوگا کہ جس طرح اُلّو اور چمگادڑ بباعثِ تخالفِ طبائع آفتاب کے طلُوع سے خوش نہیں ہوتے بلکہ بہت دُکھ محسُوس کرتے اور اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں، اِسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سیاہ کار لوگ اپنی مجہد طینتی و خفاشِ فطرتی کے باعث خُدا کے جلال کی تجلّی کی برداشت نہ کر سکیں گے۔

اَور جب جب خُدا کی تجلّی کا ظہور ہُوا کرے گا تو راستبازتو تطابق و توافقِ طبائع کے باعث اُس سے بے حد خُوشی حاصل کیا کریں گے - اَور دوزخی لوگ بباعث تخالف و تضادِ طبائع اُس سے بے حد دُکھ و عذاب محسُوس کریں گے - اور انتہائی بے چینی و بے قراری میں ایسے تڑپیں گے جیسے مچھلی دہکتے ہُوئے کوئلوں پر - اَور راست بازوں کے نُورانی چہروں کی تجلّی کو بھی وُہ برداشت نہ کر سکیں گے - جیسے جب مُوسیٰ کا چہرہ خُدا کی حضُوری میں رہنے کے باعث نہایت نُورانی ہو گیا تھا ، تو لوگ اُس سے دہشت کھاتے تھے ، یہاں تک کہ مُوسیٰ کو اپنے چہرے پر نقاب ڈالنا پڑا - (خروج ۳۴ : ۲۹ - ۳۵ و ۲ کرنتھی ۳ : ۷) اَور خُداوند مسیح کی شبیہہ مُبارک جب کوہ حرمون پر نُورانی ہو گئی تو شاگرد بہت ڈر گئے تھے - (متّی ۱۷ : ۲ و مرقس ۹ : ۲) اسی طرح راست بازوں کے نُورانی چہرے بھی ہلاکت کے فرزندوں کے خرمنِ امن و طمانیت پر بجلیاں گرائیں گے - خُدا کی زندگی سے خارج ہونا ہی اُن کی ہلاکت ہے - اَور خُدا کی طبیعت کے اُن کی طبائع کا مخالف ہونا ہی اُن کا اِنتہائی دُکھ ہے - اِسی وجہ سے خُدا کو تشبیہاً بھسم کرنے والی آگ کہا گیا ہے - ملاحظہ ہو استثنا ۴ : ۲۴ و ۹ : ۳ و خرُوج ۲۴ : ۱۷ و یسعیاہ ۳۳ : ۱۴ و عبرانی ۱۲ : ۲۹) وُہی آگ تھی جو جھاڑی میں لگی ہُوئی مُوسیٰ کو نظر آئی - وُہی آگ کا ستُون بدلی میں ہو کر رات کو بنی اسرائیل کی رہبری کرتا تھا - وُہی آگ تھی جس کے متعلق مسیح نے فرمایا کہ "مَیں دُنیا میں آگ لگانے آیا ہُوں" - وُہی آگ عید پنتکوست کے دِن شاگردوں پر ظاہر ہُوئی - اُسی نُور نے دمشق کی راہ پر ظاہر ہو کر پولُوس رسُول کو ہدایت فرمائی تھی - وُہی آگ تھی جو جزیرہ پتمس میں یوحنا پر ظاہر ہُوئی - اَور اُسی آگ (خُدا کی تجلّی) کا بیان مُنکرانِ خُدا کے

خلاف یُوں ہے۔" ہاں عدالت کا ایک ہولناک اِنتظار اَور غضب ناک آتش باقی ہے جو مخالِفوں کو کھا لے گی۔" (عبرانی ۱۰: ۲۷) صرف تضادِ طبائع کی بات ہے ورنہ دوزخ کسی آگ کی بھٹی کا نام نہیں ہے۔ بندہ اِن خیالات کا خوُد ذمّہ وار ہے، اَور اِس تعلیم کی جواز یا عدم جواز کی ذمّہ داری میرے سِوا اَور کسی پر عائد نہیں ہوتی۔

آخری اِلتماس پیارے ناظرِین! آپ نے اس کتاب کے مطالعہ سے انجیل کے اسرارِ سربستہ اَور رموُزِ دقیقہ کو کافی طور پر سمجھ لیا۔ اب نہایت غور طلب امر یہ ہے، کہ جس قدر رُوح جِسم سے اعلےٰ ہے اُسی قدر رُوحانی غلامی بھی جِسمانی غلامی سے بڑی ہے۔ جِسمانی امراض تو جِسم کے فنا ہونے پر مِٹ جاتے ہیں، لیکن رُوح غیر فانی ہے۔ اِس لئے رُوحانی مرض (گُناہ) رُوح کے ساتھ تا اَبد رہ کر اُس کو خُدائے قدُّوس سے ہمیشہ کے لئے جُدا رکھے گا۔ اَور اَبدی سزا کا مستوجب ٹھہرائیگا۔ تمام مذاہب کی غرضِ مُشترک نجات ہے۔ اَور سب نجات نجات پُکارتے بھی ہیں۔ لیکن حقیقی نجات دلانے کی صلاحیّت سے بے نصیب ہیں۔ جس طرح ہماری مادّی وجِسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے خُدائے قدیرِ وحکیم نے کارخانۂ فِطرت میں ایک ہی سے سامان پیدا کردئے ہیں۔ اَور وُہ ہماری جِسمانی ضروُریات کو پُورا کرنے کے لئے اِس قدر مکتفی ہیں کہ اُن سے بہتر کی حاجت نہیں۔ اُسی طرح ہماری رُوحانی زندگی کی ضروُریات کو پُورا کرنے کے لئے بھی ایک ہی اَیسا کافی و وافی اَور کامل اِنتظام ہونا چاہیئے کہ جس سے بہتر کا امکان نہ ہو۔ اَور وُہ مسیحیّت اَور اُس کا ہیرو خُداوند مسیح ہے۔ واضح ہو کہ گھڑی اپنے بِگڑے ہُوئے پُرزوں کو خوُد ہی دُرست نہیں کر سکتی

بلکہ گھڑی ساز جس کے ہاتھوں نے اُس کو بنایا۔ اسی طرح جس قُدرت نے اِس اِنسانی مشینری کو بنایا، وُہی قُدرت اُس کے بگڑے ہُوئے پُرزوں کو دُرست کر سکتی ہے۔ پس کلمتہ اللّٰہ (مسیح) تمام کائنات کا آفرینندہ ہے (یُوحنا ۱: ۱-۳ و کُلسی ۱: ۱۵-۱۷) اور وُہی اِنسانی مشینری کے زنگ خوردہ (گُناہ آلُودہ) پُرزوں کو دُرست کر کے دوبارہ اُس کو شبیہُ اللّٰہ پر بحال اَور خُدا کی طبیعت پر مطبُوع کرنے والا ہے۔ (فلپی ۳: ۲۱ و ۱۔ کرنتھی ۱۵: ۴۹) مُردہ نبیوں اَور پیغمبروں اَور اَوتاروں سے اپنی نجات و شفاعت کی اُمید رکھنا ایسا ہی عبث ہے، جیسے کوئی مُجرم مُردہ وکیل کی قبر پر جا کر اُس سے اپنے مُقدمے کی پیروی کی اِلتجائیں کیا کرے۔ مُردہ زِندہ کی وکالت نہیں کر سکتا۔ خُداوند مسیح اَبد تک گنہگاروں کی شفاعت و مُنتگاری کے لئے زِندہ ہے۔ "اِسی لئے جو اُس کے وسیلے سے خُدا کے پاس آتے ہیں۔ وُہ اُنہیں پُوری پُوری نجات دے سکتا ہے کیونکہ وُہ اُن کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے۔" (عبرانی ۷: ۲۵)۔

پس اَے مُتلاشیانِ جادۂ حق اَور طالبانِ راہِ نجات صحرائے ضلالت کی بادیہ پیمائی سے باز آیئے۔ تعصّب۔ ہٹ دھرمی اَور فضُول کی نکتہ چینیوں کی گردو غُبار کو اپنے دامنِ دِل سے جھاڑیئے۔ اَور مسیحیت کی مخالفت ہمیشہ اندھے ہو کر نہ کیجئے۔ کب تک آپ سچّائی کی تحقیر پر کمر بستہ رہیں گے اَور مُلک کی یہ ذلیل و پست ذہنیّت کب تک فضائے امن کو مُکدّر بنائے رکھے گی۔ یاد رکھو مسیحیت کی مخالفت کرنا خُدا کی ہستی سے مُنکر ہونے کے مترادف ہے۔ آیئے اَور اپنے گُناہوں سے توبہ کیجئے۔ خُداوند مسیح پر جو خُدا کے رحم و فضل کا ظہُور ہے صِدقِ دِل سے ایمان لا کر بپتسمہ پایئے۔

تو آپ نجات پائیں گے۔" اور کسی دُوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دُوسرا نام نہیں بخشا گیا، جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں" (اعمال ۴: ۱۲) خُدا آپ کی ہدایت و رہنمائی فرمائے۔ آمین!